ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

جہانِ اقبال

(فلسفہ حیات اور شاعری)

مرتب
محبوب سعید (حارث)

ساقی ارباب ذوق

PDF BOOK COMPANY

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات :

Muhammad Husnain Siyalvi
0305-6406067
Sidrah Tahir
0334-0120123
Muhammad Saqib Riyaz
0344-7227224

جہانِ اِقبالؔ

(فلسفہ حیات اور شاعری)

Dr. Naz Quadri
(Collections)

قاضی محمد عدیل عباسی

ایم.اے.، ایل.ایل.بی.(علیگ)

ایڈوکیٹ (بستی)

0305 6406067
PDF Book Company

مرتب

محبوب سعید (حارث)

انتساب

عمِ محترم

محمد احمد علی (مرحوم) کے نام

جن کی بے مثال محبت، جذبۂ ایثار و قربانی

و خدمتِ خلق نے زندگی میں کچھ

کر گزرنے کی راہ ہموار کی۔

محبوب سعید (حارث)

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

☆ جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ☆

نام کتاب	:	جہانِ اقبالؔ
مصنف	:	قاضی محمد عدیل عباسی
سنِ اشاعت	:	۲۰۰۶ء
ترتیب	:	محبوب سعید (حارث)
کمپوزنگ وطباعت	:	انٹائم آفسٹ پریس، گورکھپور
سرِ ورق	:	آصف سعید
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	اسّی روپیہ Rs. 80/-

ملنے کا پتہ

☆ ادبی مرکز، نزد جامع مسجد اردو بازار، گورکھپور

☆ دانش محل، امین آباد، لکھنؤ

☆ مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی

☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکٹ علیگڈھ

یہ کتاب ساجد علی میموریل کمیٹی کے مالی اشتراک سے شایع ہوئی۔
کتاب کے مندرجات سے کمیٹی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

ساجد علی میموریل کمیٹی گورکھپور

اسمائے گرامی اراکین کمیٹی

سرپرست

جناب ناگندر ناتھ سنگھ

جناب محمد حامد علی

جناب عدنان فرخ علی شاہ (میاں صاحب)

صدر

قاضی توسل حسین

نائب صدر

احمر الیاس

جنرل سکریٹری

محبوب سعید (حارث)

جوائنٹ سکریٹری

سید سہیل محمود

محمد اسرار

0305 6406067
PDF Book Company

اراکین

انیس احمد پرویز	قاضی شہیر الحسن	ڈاکٹر طاہر علی سبز پوش
انجینیر شمس انور	عاصم مسعود	ڈاکٹر محمد طارق سعید
محمد آصف سعید	سید اظہار الحق	محمد ریحان اللہ عباسی

فہرست مضامین

عرض مرتب	محبوب سعید (حارث)	۹
اقبالؔ (جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا)	پروفیسر افغان اللہ خاں	۱۲
عرض حال	قاضی محمد عدیل عباسی	۱۶
اقبال کا ادبی نصب العین		۲۴
ادبی نصب العین کا مفہوم		۲۵
اقبال اور حافظ		۲۹
اقبال		۳۲
خودی		۳۳
خودی کا تجزیہ		۴۰
حرم اور فرنگ		۴۳
مکتب		۴۶
پروانہ اور جگنو		۴۷
بلبل اور شاہیں		۴۹
گل و لالہ		۵۳
ساحل اور موج		۵۴
موتی اور شبنم		۵۴
مجموعوں کے نام		۵۵
خاتمہ کلام		۵۵
اقبال اور اسلام		۵۶
حیات بعد الممات		۶۸
اِدّعا		۷۳
اسرار خودی کی کہانی		۷۶
اپنا تجزیہ		۷۷

سامی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

اسرارِ خودی	۷۸
کلام اقبال کی اندرونی شہادت	۷۹
رموزِ بے خودی	۸۳
خلاصہ کلام اقبال	۸۴
اقبال اور دانشورانِ عالم	۹۲
تسخیر فطرت یا علم و عشق	۹۵
آدم از بہشت بیروں آمدہ می گوید	۱۰۱
عالم اسلامی اور سائنس سے بے خبری	۱۰۴
علم کے حدود اور تسخیر نفس	۱۰۷
اعمال صالحہ	۱۱۱
توحید	۱۱۷
مقام نبوت	۱۲۰
اقبال کا نظریہ	۱۲۱
رسالت	۱۲۶
بشر	۱۲۸
نیابت الٰہی	۱۳۳
ملا جمال الدین افغانی اور اقبال	۱۳۶
خاتم النبیین ﷺ	۱۳۷
خاتم اقوام کے خصائص کا نچوڑ	۱۴۱
عشق رسول ﷺ	۱۴۲
اقبال کا تصور سفر مدینہ	۱۵۲
اقبال کا مرد کامل	۱۵۴
انسانیت کی عظمت	۱۵۶
اقبال اور نیٹشے	۱۵۸

0305 6406067
PDF Book Company

مردکامل کے خصائص	۱۵۹
اجتماعی زندگی	۱۶۸
جماعت حق میں عورت کا درجہ	۱۷۳
مردِ کامل اور مردِ مومن	۱۷۴
اقبال کا مذہب	۱۷۵
کلامِ اقبال کی اندرونی شہادت	۱۷۷
کیا اقبال شیعہ تھے؟	۱۸۰
تصویر کا دوسرا رخ	۱۸۲
فکرِ اقبال کا منبع و ماخذ	۱۸۹
دوسری دلیل	۱۹۲
تیسری دلیل	۱۹۶
اقبال اور تصوف	۱۹۸
عقیدہ وحدۃ الوجود	۲۰۰
اقبال کا پیغام طلباء عصر کے نام	۲۰۷
حقائق کائنات	۲۱۱
نغمہ ساربان حجاز	۲۱۵
پیام طلباء کے نام	۲۱۷
اقبال کا دوسرا پیام (خودی یا معرفتِ نفس	۲۲۴
اقبال کا تیسرا پیام (فقر)	۲۳۲
جہاد و عمل کی دعوت	۲۳۵
اقبال کا ایک شعر	۲۴۱
صحت نامہ	۲۴۹

0305 6406067
PDF Book Company

اے غنچہ خوابیدہ چوں نرگسِ نگراں خیز
کاشانۂ ما رفت بتاراج زماں خیز
اے نالۂ مرغِ چمن از بانگ ازاں خیز
از گرمیِ ہنگامۂ آتش نفساں خیز
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

اقبالؔ

ساتھی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

عرض مرتب

قاضی محمد عدیل عباسی ایک دانشور اور صاحبِ قلم کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ ہشت پہلو و ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک تخلیق کار کی حیثیت سے کیا۔ شعر بھی کہے، افسانے اور انشائیے بھی لکھے۔ مگر آگے چل کر خود کو مضمون نگاری تک ہی محدود رکھا۔ ان کی عبقری حیثیت مختلف علمی، ادبی، سیاسی و سماجی اور صحافتی خدمات انجام دیتے ہوئے کمال کو پہونچی۔

قاضی صاحب نے مشہور زمانہ روزنامہ ''زمیندار'' (لاہور) اور ''مدینہ'' (بجنور) کی ادارت کے فرائض بھی نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔ اس طرح سے وہ ایک بڑے اور معتبر و منفرد صحافی کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔ اپنے سیاسی نظریات اور خیالات کی تبلیغ و اشاعت کا فریضہ انہوں نے صحافت سے وابستہ ہوکر انجام دیا۔ وہ بنیادی طور پر ایک سچے اور پکے نیشنلسٹ مسلمان تھے۔ مگر یہاں بھی وہ اپنی دیانت داری پر ہمیشہ ثابت قدم رہے۔ جھوٹ کو جھوٹ ہی کہا اور سچ پر کبھی آنچ نہ آنے دی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے حریفوں نے بھی ان کو عزت و احترام سے یاد کیا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ ان کے فرمودات سے ہر مکتبہ فکر سے وابستہ لوگوں نے براہ راست استفادہ کیا۔

قاضی محمد عدیل عباسی جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ایک منفرد نثر نگار تھے۔ ان کو اردو ادب میں ایک سچے مورخ اور نقد و نظر میں یدِ طولیٰ رکھنے والا دانشور تسلیم کیا گیا۔ وہ ایک اچھے مترجم کے طور پر بھی صاحبان فکر و نظر کے سامنے آئے۔ اس وقت قاضی صاحب کی جملہ ادبی خدمات کا ذکر کرنے کے بجائے اجمالی طور پر ہی کچھ عرض کیا جا سکے گا۔

قاضی صاحب ایک محبِ وطن اور معمارِ وطن کے روپ میں اعلیٰ و ارفع نظر آتے ہیں۔ جدوجہد آزادی میں ان کی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔

روزنامہ ''زمیندار'' کے بانی مولانا ظفر علی خاں کے نزدیک وہ ایک سچے، دیانت دار و بے باک صحافی تھے۔ قاضی صاحب کے ''صحافتی اجتہاد'' سے متاثر ہوکر انہوں نے فی البدیہہ یہ شعر کہا تھا ع

فیصلہ عدیل پر آخرکار ہے عمل
مان گیا 'الاماں' بھی آپ کے اجتہاد کو

'الامان' لاہور کا ایک روزنامہ اخبار تھا، جس میں 'زمیندار' کے خلاف مضامین شایع ہوتے تھے۔ قاضی صاحب کے جواب نے اس کی بولتی بند کردی تھی۔

قاضی صاحب ۱۹۲۲ء میں لاہور کے مشہور زمانہ روزنامہ ''زمیندار'' کے مدیر اعلیٰ تھے۔ انہیں دنوں ان کے تحریر کردہ اداریئے سارے ملک خصوصاً لاہور میں زبردست دھوم مچائے ہوئے تھے۔

شاعر مشرق علامہ اقبال بھی قاضی صاحب کے بداحوں میں تھے۔ علامہ اکثر قاضی صاحب کو چائے پر مدعو کیا کرتے تھے۔۔ علامہ ان کے اداریوں اور خصوصی کالموں میں تحریر کردہ مضامین کی اکثر و بیشتر کھل کر ستائش کرتے تھے۔ قاضی صاحب کو علامہ اقبال کی دلکش شخصیت نے اپنا اسیر کر رکھا تھا۔ کبھی کبھار وہ علامہ سے کلام سنانے کی بھی فرمائش کی جرأت کرتے تھے اور علامہ ان کی یہ فرمائش بخوشی پوری فرماتے تھے۔

نظریاتی طور پر قاضی صاحب علامہ اقبال سے پورے طور پر متفق یا متاثر نہیں تھے۔ تاہم ان کی شاعری نے قاضی صاحب کو ان کا سچا پرستار بنا رکھا تھا۔ جبکہ خود علامہ اقبال قاضی صاحب کے ''قوم پرستانہ'' نظریات سے متاثر و متفق نہ ہوتے ہوئے بھی قاضی صاحب کی تحریروں کے رسیا تھے۔

علامہ اقبال کے مختلف موضوعات پر کہی گئی نظموں پر اپنے تنقیدی و تجزیاتی مضامین میں قاضی صاحب نے خلاّقانہ و عالمانہ انداز کو نظر انداز نہیں ہونے دیا ہے۔ ان مضامین میں ان کی فکر کی گہرائی و گیرائی کے ساتھ ساتھ تخلیق کی تب و تاب بھی نظر آتی ہے۔ چونکہ تنقیدی مضامین و مقالے زیادہ تر نہایت خشک اور اکتا دینے والے ہوتے ہیں مگر انہیں جب کسی تخلیق کار کا قلم احاطۂ تحریر میں لے آتا ہے تو شروع سے آخر تک دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ ایسی خوبی خال خال ہی لوگوں میں پائی جاتی ہے جو قاضی صاحب کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے طویل سے طویل مضامین ایک ہی نشست میں ختم کئے جا سکتے ہیں۔ 'جہانِ اقبال' میں شامل سبھی مضامین اس کسوٹی پر پورے اتریں گے۔

ماہرین اقبالیات میں ایک نام سب سے نمایاں آنجہانی پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا آتا ہے۔ جنہوں نے علامہ اقبال کے نظریات و خیالات کے تقریباً سبھی پہلوؤں اور گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔

اقبال شناسی میں ایک منفرد نام قاضی محمد عدیل عباسی کا بھی ہے جنہوں نے چند

ہی تجزیاتی وتنقیدی مضامین علامہ اقبال کے افکار وخیالات ونظریات پر لکھے ہیں تاہم ان کی اہمیت قاضی صاحب کو ایک عظیم ماہرِ اقبالیات کے روپ میں سامنے لے آتی ہے۔

قاضی صاحب کو چونکہ علامہ اقبال کا قرب حاصل رہا ہے اس لئے ان کو علامہ کی شخصیت اور فکر وفن کو صحیح طور پر سمجھنے و پرکھنے اور جذب کرنے میں کسی طرح کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہے۔

قاضی صاحب نے علامہ اقبال کے ساتھ بہت خوبصورت شامیں گزاری ہیں۔ان سے ان کا بہترین کلام کبھی تحت اور کبھی ترنم میں سنا ہے۔ظاہر ہے ان مواقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے موصوف نے علامہ کا نفسیاتی تجزیہ بھی کیا ہے جسے ''جہانِ اقبال'' میں شامل مضامین کو پڑھ کر اور پرکھ کر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

میں نے ''جہانِ اقبال'' میں شامل مضامین مختلف رسائل وجرائد کی پرانی فائیلیں کھنگھال کر حاصل کئے ہیں ممکن ہے اس سلسلے کے کچھ اور مضامین قارئین کے توسل سے دستیاب ہوجائیں تو جہانِ اقبال کا دوسرا حصہ بھی انشااللہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر سکوں گا۔

اس مجموعے کی اشاعت میں جن بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کا گراں قدر تعاون حاصل رہا ہے ان سب کا دل سے شکرگزار ہوں۔ بالخصوص والدمحترم جناب محمد حامد علی صاحب، جناب ارشد عباسی صاحب (ماموں جان) استاذی پروفیسر افغان اللہ خاں، محترم ایم کوٹھیاوی راہی صاحب، برادرانِ معظم ڈاکٹر طارق سعید وآصف سعید۔

محبوب سعید (حارث)

''جوضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا''

پروفیسر افغان اللہ خاں
صدر شعبۂ اردو
دین دیال اپادھیائے گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور

آج کا دور نظریاتی بحران اور اختلال اذہان کا ہے۔ جب کہ مربوط فکر یا نظریہ کی موجودگی انسانی معاشرہ کے ارتقاء و ارتفاع کے لئے ضروری ہے اور اس کی عدم موجودگی بگاڑ و فساد کا سبب ہے۔ آج شخصی اور جماعتی یا قومی و مذہبی عصبیت پر مبنی نظریات و افکار تو موجود ہیں اور اس میں بڑی حد تک شدت پیدا ہوتی جارہی ہے۔ یہ سب ہتھکنڈے انسانیت کش اور قعر مذلت میں ڈالنے والے ہیں۔ وقتی اور لمحاتی لذتیت کو فروغ دینے والے ہیں۔ خود میں مرکوز دائرہ میں بند۔ خواہ وہ ذاتی دائرہ ہو، جماعتی ہو، قومی ہو یا مذہبی، اس سے باہر دیکھنا، انگیز کرنا یا اس دائرہ سے باہر کی صداقت، مثبت اقدار کا اعتراف کرنا ہم نہیں جانتے یا اسے ہم نے غیر ضروری سمجھ لیا ہے اور نتیجہ میں سماج و معاشرہ میں اور قومی اور بین الاقوامی سطح پر بگاڑ، ہٹ دھرمی اور آزادی کو سلب کرنے کا رجحان بڑھا ہے۔ آج جمہورت کا غلغلہ ہے اور آزادی خواہ شخصی ہو یا قومی کا نقارہ زور و شور سے بجایا جا رہا ہے لیکن حقیقت میں اس کی عملی صورت بہت کم نظر آتی ہے۔ اور ان تمام تر بگاڑ کی اصل وجہ، انسانی جذبوں، نفسیات و شہوانیت کا کھلا فروغ اور روحانیت سے، روحانی قدروں سے اجتناب اور دوری ہے۔ اللہ کے مقابلے میں جب انسانی انا، جذبہ اور نفس کو حاوی یا خدا مان لیا جائے تو پھر اس معاشرہ کے لئے دعا ہی کی جاسکتی ہے۔ اس کے دن انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔

علامہ اقبالؔ کی شاعری دراصل انسان کا اس کائنات میں مقام و مرتبہ تعین کرتی ہے اور اس کے حقوق و فرائض کی نشاندہی کرتی ہے۔ اسے نظریاتی بحران اور ذہنی اختلال سے چھٹکارا دلاتی ہے۔ انسان کو صحیح اور ارفع مقام پر فائز کرتی ہے۔ اقبالؔ کی شاعری میں یہ ضرور ہے کہ اسلام اور اسلامی نظریہ اور فکر کا غلبہ ہے لیکن محض اس لئے کہ وہ اسلامی فکر کا موید ہے اسے نظر انداز کر دیا جائے اور اسلام سے مخالفت کی وجہ سے اسے رد کر دیا جائے، غلط ہوگا۔ اس سے ہم اپنی کور نگاہی کا ہی ثبوت فراہم کریں گے۔

محدود نظریاتی عصبیت کی بنا پر حق کا بطلان، حق کی نفی نہیں ہے۔ حق، حق ہے اور اس کا تعلق انسان سے، انسانی خیر سے اور فلاح سے ہے۔ قطعی طور پر اس کا اعتراف نہ کیا جائے تو بھی حق کی صداقت ختم نہیں ہوتی۔ اس طرح اقبالؔ کی شاعری کے مطالعہ کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اسے کھلے ذہن و دماغ سے پڑھا جائے۔ اس میں انسانی پہلوؤں پر نظر کیا جائے اور انسانیت کی بھلائی اور خیر کے جو پہلو ہیں اسے نمایاں کیا جائے۔

علامہ اقبالؔ کی شاعری اس بات کا مطالبہ بھی کرتی ہے کہ اسے عقل و دانش کے آئینہ میں دیکھا و پرکھا جائے، کٹھ ملائیت سے الگ ہٹ کر (جس کے علامہ خود مخالف تھے) اس کا تجزیہ یا اس کی تقلید کی جائے۔ علامہ کی شاعری قرآنی آیات (نعوذ باللہ) یا حدیث کا درجہ نہیں رکھتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی بنیادی باتیں علامہ کی شاعری میں گھل مل گئی ہیں اس لیے اس کی تفہیم کی ایک شرط قرآن و حدیث، اسلامی تاریخ و تہذیب کے ساتھ ساتھ انسانی تاریخ و تہذیب کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اس کے بغیر اقبالؔ کا مطالعہ مکمل نہیں ہوتا بلکہ اس کے بغیر اندھیرے میں راہ تلاش کرنا ہے۔ اس کے بغیر تفہیم اقبالؔ کا حق ادا نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کے بغیر اقبالؔ کی فکر سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے یا اس سے طلبہ یا طالبات کو روشناس کرایا جا سکتا ہے۔ ایک استاد اور اچھے استاد کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اقبالؔ سے روشناس ہونے سے قبل قرآن و حدیث اور تاریخ و تہذیب سے واقفیت پیدا کرے پھر تدریس اقبال کا فریضہ ادا کرے۔ اس کے بغیر نہ وہ اقبال کو پڑھ سکتا ہے اور نہ ہی پڑھا سکتا ہے اور نہ ہی وہ صحیح شعور طلباء میں پیدا کر سکتا ہے۔

ایک ایسے دور میں جب تعلیم کے نام پر جہالت اور تجارتی تعلیم کا فروغ عام ہو رہا ہے۔ بغیر کسی مقصد کے محض عالمی اداروں کے لئے اعداد فراہم کرنے کے لئے تعلیمی ادارے قائم کئے جا رہے ہیں اور تعلیم کے نام پر محض خانہ پری کی جا رہی ہے۔ مثبت نتائج کی امید ہی فضول ہے۔ ایسے بحرانی دور میں اردو والوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ درس و تدریس کا حق ادا کریں، واقعی! کیونکہ اس کے بغیر وہ نہ تو اقبالؔ کی فکر کو پروان چڑھا سکتے ہیں اور نہ ہی ایک بہتر انسان پیدا کر سکتے ہیں اور نہ ہی پر امن معاشرے کی تکمیل میں حصہ دار بن سکتے ہیں۔ اقبالؔ نے اسی پس منظر میں طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ع

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
کتاب سے تجھے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

اقبالؔ کے اسی جذبے، خواہش اور تلقین کو آج عام کرنے اور درس و تدریس کے ذریعہ فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ اسی فکر کو پیشِ نظر رکھ کر قاضی محمد عدیل عباسی (مرحوم) نے اقبال پر ایک مبسوط کتاب لکھی تھی۔ ایک ایسے وقت میں جب اقبال فہمی عام نہیں تھی۔ چند کتابوں کے علاوہ اقبالؔ پر کوئی جامع کتاب دستیاب نہیں تھی۔ یہ کتاب اس وقت بھی اساتذہ اور طلباء و طالبات کے درمیان مقبول تھی اور اس نے اقبالؔ فہمی کو عام کیا تھا اور آج بھی اس کتاب کی اہمیت ہے اور نصابی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ غالباً اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب شایع کی جارہی ہے جو مستحسن قدم ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کی قاضی محمد عدیل عباسی بھی اسے سلسلے کے فقیر تھے جس سلسلے کے اقبال، یہی وجہ ہے کہ عدیل صاحب اقبالؔ کے اندرون میں اتر کر شعر کے ضوری اور معنوی خوبیوں سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ قاضی صاحب ایک مصلح، مبلغ اور دوراندیش سیاست داں بھی تھے۔ اردو کا کون ایسا طالب علم ہوگا جو ان کے نام سے واقف نہ ہو۔ تحریک خلافت، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے تحفظ کا مسئلہ ہو یا اردو کا مسئلہ ہو یا اور کوئی قومی مسئلہ، وہ قاضی صاحب سب میں پیش پیش رہا کرتے۔ انجمن تعلیمات دین کے تعلق سے انہوں نے حویلیوں سے لیکر جھوپڑیوں تک علم کے چراغ جلائے لیکن ان خدمات کا معاوضہ جو نام و نمود کی شکل میں ہوتا ہے گریز کرتے رہے۔ انہوں نے درویشانہ زندگی گزاردی اس لیے میں کہتا ہوں کہ وہ اسی سلسلے کے فقیر تھے جس سلسلے کے اقبالؔ فقیر تھے۔

اس کتاب کی تصنیف میں فاضل مصنف کے پیشِ نظر شاید یہ خیال رہا ہو کہ

"شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات"

لائق تحسین اور مبارکباد ہیں ایڈوکیٹ محبوب سعید (حارث) کہ انہوں نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے اقبال پر لکھے گئے قاضی عدیل عباسی صاحب کے مضامین تلاش کئے، نہ صرف تلاش کئے بلکہ اسے ترتیب دے کر شایع کررہے ہیں۔ یہ مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے مزید اہم ہوجاتے ہیں کہ ان میں اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش اس زبان میں کی گئی ہے جو عام فہم ہے۔

دراصل مرتب (محبوب سعید) کے پیش نظر یہ نکتہ یا خیال رہا ہے کہ طلبا اقبال کو آسانی سے سمجھ سکیں اور اساتذہ بھی فیض اٹھا سکیں۔

غالباً اس طرح کی یہ پہلی کوشش ہے ورنہ جب بھی اقبال پر کچھ لکھا جاتا ہے تو وہ مقالہ یا مضمون اقبال کی شاعری سے بھی مشکل ہوتا ہے۔ غالباً اسی پہ یوسفی نے غالب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غالب مشکل شاعر نہیں ہے۔ مشکل تو اسے اس کے شارحین نے بنا دیا۔

امید ہے کہ اقبال پر یہ کتاب طلبا اور اساتذہ میں یکساں مقبول ہوگی اور محبوب سعید (حارث) کی یہ کوشش رائگاں نہیں جائے گی۔

عرض حال

آج جبکہ بزمِ اقبال سارے عالم میں آراستہ ہو چکی ہے اور دنیا کے ہر ملک کے دانشوروں، ادیبوں اور نقادوں نے کلام اقبال کی شرح کر کے بارگاہِ شاعرِ اعظم میں نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔ اور شاید جتنا اقبال پر لکھا گیا ہے کسی اور کے بارے میں اس کا جزو بھی احاطۂ تحریر میں نہیں آیا ہے مجھ ہیچمداں کا اس پر قلم اٹھانا مضحکہ خیز سا معلوم ہوگا۔ مجھے اپنے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی بھی نہیں ہے۔ پھر بھی اس جرأتِ رندانہ کا مرتکب ہوا ہوں۔ اس سے میری غرض نہ ادیبوں کی صف میں شامل ہونا ہے۔ اور نہ میں کسی ندرتِ خیال کا مدعی ہوں۔ میں زمانۂ طالب علمی سے اقبال کی نظم، ابوالکلام کی نثر اور حسرت موہانی کے عمل کا بڑا معتقد رہا، اور بڑے ذوق وشوق سے ان تینوں کا مطالعہ کرتا تھا۔ اور ان سب نے میری زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس نوعمری کے زمانے میں اکثر میرا جی چاہتا تھا کہ ان تینوں کی تصویریں اپنے کمرے میں آویزاں کر کے اس پر امیر خسرو کے اس شعر کا کتبہ لگادوں ع

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کنم با خلق و عالم کار نیست

۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی اسکول آف لا الٰہ آباد سے ترکِ موالات کرنے کے بعد مجھے مولانا حسرت موہانی کی خدمت میں کچھ عرصہ تک رہنے کا موقع ملا اور اس دوران میں میرا وہ خیال حقیقت بن کر سامنے آیا جو مولانا کے اعلیٰ کردار، عظیم بلندی خیال، فقر و درویشی، بے باکی وحق گوئی اور انسانی شرف کے بارے میں نادیدہ میں نے قائم کیا تھا وہاں سے پھر میں مدینہ بجنور اور پھر زمیندار لاہور میں چلا گیا۔ ''روزنامہ زمیندار'' اس وقت اپنے عروج پر تھا اور اس کے مالک وایڈیٹر ظفر علی خاں مانٹگمری جیل میں محبوس تھے۔ جہاں ان سے اکثر ملاقاتیں ہوئیں۔ زمیندار اخبار میں میری حیثیت چیف ایڈیٹر کی قرار دی گئی۔ اور مولانا غلام رسول مہر جوائنٹ ایڈیٹر اگرچہ سرِ ورق پر ایک نابینا حافظ محمد احمد صاحب کا نام شائع ہوتا تھا۔ ایڈیٹروں کی گرفتاریاں اس کثرت سے ہو رہی تھیں کہ اخبار کا چلانا دشوار ہو گیا تھا۔ ایک عرصے کے بعد میرا نام دیا گیا اور فی الفور سات مقدمے میرے اوپر، حسب دفعہ ۱۲۴۔ الف (حکومت کے خلاف نفرت پھیلانا) قائم ہو گئے۔ ایک سال سزا ہوئی اور لاہور

سنٹرل جیل میں قیام رہا۔لیکن نابینا حافظ کی مدد سے تقریباً آٹھ ماہ فرصت کا مل گیا۔

مولانا غلام رسول مہر جواب ایک عظیم مصنف اور ایک مستند صحافی ہیں اس وقت یونیورسٹی کے تازہ گریجویٹ تھے۔اور اقبال کے شیدائی ،اس وقت لاہور میں اقبال کا طوطی بول رہا تھا۔اور اقبال کی شاعری کی دھوم ادنیٰ اور اعلیٰ میں مچی ہوئی تھی۔اقبال کو سمجھنے اور اقبال کے کلام کا مطالعہ کرنے کے لئے انجمنیں اور سوسائٹیاں قائم تھیں۔ اسکولوں اور کالجوں کے لڑکے جماعت بنا کر دفتر زمیندار میں بھی آتے تھے اور مجھ سے اور دیگر ممبران ایڈیٹوریل اسٹاف سے جن میں مرتضیٰ حسین میکش بھی شامل تھے ذوق وشوق سے التجا کرتے تھے کہ اسرار خودی یا رموزِ بے خودی کا ایک سبق پڑھا دیجئے۔ظاہر ہے لاہور پہنچنے پر میری تمنا علامہ اقبال کی خدمت میں حاضری تھی۔ میرے دل میں اس عظیم شاعر کے بارے میں عجیب عجیب تخیلات تھے لیکن جب پہلی بار حاضر ہوا تو کچھ سماں ہی اور تھا۔ایک انتہائی سادہ سا انسان جو کسی طرح جو کسی طرح اپنے کو دوسروں پر ممیز وممتاز کرنے کا خواستگار نہ تھا حقہ پیتا جارہا تھا اور بار بار چلم بھرنے کے لئے محبت سے اللہ بخشا اللہ بخشا پکارتا رہتا تھا۔موضوعِ سخن بین الاقوامی اسلامی سیاست یا اسلامی مسائل یا حدیث اور اس کی شرح میں اپنا شعر۔ پھر جس طرح حاضری کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔مندرجہ بالا باتوں کا تجربہ قوی تر ہوتا گیا۔ سب سے زیادہ جس چیز نے مجھ کو متاثر کیا اور گرویدہ کیا وہ اس شخص کا ضبط نفس اور بے تکلف منکسر المزاجی تھی۔ پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ انکسار فرمارہے ہیں۔ خاکساری کے اظہار میں بھی بعض وقت غرور پنہاں ہوتا تھا۔اقبال میں احساس برتری کا نہیں نام نہ تھا۔اسکول کے طالب علم میز پر مکہ مار مار کر جوش کے ساتھ گرم بحثیں کرتے تھے۔دوسری جانب سے ہر بات کا جواب سکون اور خاموشی سے دیا جاتا تھا۔کبھی یہ نہ کہا کہ یہ بین الاقوامی یا پیچیدہ مسائل ہیں تم لوگ ان کو سمجھ نہیں سکتے۔بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برابر والوں میں بات ہو رہی ہے۔عرق النساء کے مریض تھے ایک دن میں سہ پہر کے وقت گیا تو دیکھا کہ ایک حجام سے تیل ملوا رہے ہیں اور وہ پوچھ رہا ہے کہ میاں اب جو لڑائی ہوگی تو کس کس کے بابین ہوگی اور اس کا کیا انجام ہوگا اور وہ اسے اسلامی بین الاقوامی سیاست سمجھا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اب کے تمام دنیائے اسلام ایک طرف ہوگی۔اور دنیا کی عظیم طاقتوں سے ٹکراؤ ہوگا وغیرہ وغیرہ۔الغرض یہ بزم شبانہ جو روز منعقد ہوتی تھی اس کی فضا سراسر اسلامی تھی۔

اس کے موضوعاتِ گفتگو اسلامی اس کے افکار اسلامی اس کی نوعیتِ بحث

اسلامی، چنانچہ ان سب کی شرح میں اقبالؔ کے اشعار اسلامی اور صرف اسلامی۔ اس وقت تک میں کلام اقبالؔ کا تقریباً حافظ ہو چکا تھا اور روز آنا بلا چند سو اشعار پڑھے مجھے چین نہ آتا تھا۔ اخبار زمیندار کی عظیم مشغولیت کے زمانے میں بھی جسے جہاد سمجھ کر ہم لوگ نکال رہے تھے۔ میرا یہ مشغلہ بند نہیں ہوا۔ اس متواتر مطالعے سے جو تاثر مرے دل پر قائم ہوا تھا اس پر ان محفلوں کی حاضری نے مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اور یہ گمان یقین واثق میں تبدیل ہو گیا کہ اقبالؔ نے نظم و شعر میں تعلیماتِ اسلامی کی شرح کی ہے۔ امتداد زمانے کے ساتھ جس طرح اقبالؔ کی اور منظوم جلدیں شایع ہوتی رہیں یہ یقین ترقی کرتا گیا۔ چنانچہ اقبالؔ کی عظمت میں جہاں مجھے کوئی کسر نظر آتی تھی میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا تھا اور قوتِ برداشت جواب دیدیتی تھی۔ جیل سے رہائی اور ۱۹۲۵ء میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔اے اور لا کا داخلہ لینے سے قبل میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی سے فرنگی محل لکھنؤ میں حضرت مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ کی قیام گاہ پر ملا۔ میرے ہاتھ میں ''پیامِ مشرق'' یا کسی اور مجموعہ کا ایک نسخہ تھا۔ مولانا محمد علی نے دریافت کیا کہ کون سی کتاب ہے میں نے کتاب دکھائی انہوں نے اِدھر اُدھر ورق الٹے اور کہا کہ کب شایع ہوئی۔ مجھے سخت حیرت ہوئی اور اس کے ساتھ ناگوار بھی ہوا کہ ہندوستان کا یہ مشہور دانشور اور اقبالؔ کی تصنیف سے ناواقف ہے۔ مولانا محمد علی نے کچھ اس طرح ورق الٹ کر کتاب دو ایک منٹ میں واپس کر دی تھی کہ گویا اس میں کوئی چیز جاذبِ نظر ہے ہی نہیں۔ میں نے جل کر کہا کتاب تو عرصہ ہوا شایع ہو چکی ہے اور دنیا نے اس کا خیر مقدم کیا ہے۔ پھر مولانا شوکت علی نے مجھ سے کتاب لی اور الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا کہ کُل فارسی ہے۔ میں نے کہا ''جی ہاں'' انہوں نے یہ کہہ کر کتاب واپس کر دی ''افسوس'' اسی وقت سے میرا یہ خیال ہو گیا کہ مولانا محمد علی اپنے ہمعصروں کے لئے فراخ دل نہیں ہیں، جو واقعی ایک نایاب صفت ہے۔ اور یہ خیال اب تک نہیں بدلا۔

جب میں نے بستی میں وکالت شروع کیا تو اس کے بعد مجنوں گورکھپوری نے ''اقبالؔ'' کے عنوان سے ایک کتابچہ شایع کیا۔ اس میں مجنوں صاحب نے اقبالؔ کی تحقیر میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ اور انہیں زبان سے نابلد اور پنجابی وغیرہ بھی لکھا تھا۔ میں نے اسی وقت چند مضامین لکھے تھے۔ جن میں سے صرف دو رسالوں میں شایع ہوئے بقیہ پڑے رہ گئے۔ وکالت کی مصروفیتوں سے ادھر توجہ کرنے کی فرصت ہی کب تھی۔ اب یہ خیال گزرا کہ ان سب پر نظر ثانی کر کے یا انہیں از سرِ نو ترتیب دے کر ایک مجموعہ شایع کیا جائے۔

اس خیال کہ وجہ صرف یہ ہے کہ اگر چہ اقبالؔ پر تصانیف کا انبار لگ گیا ہے، لیکن عام فہم زبان میں پیامِ اقبال کی کوئی ایسی شرح مجھے نہیں ملی جو مخصوصین کے علاوہ عام علم وذہن کے لوگوں کو اقبال سے روشناس کرتی۔ میرا یقین کامل ہے کہ اقبال نے صرف اسلامی تعلیمات اور اس کے بنیادی نظریات کی تعبیر کی ہے نہ اپنی طرف سے ملایا ہے نہ کچھ کم کیا ہے۔ یہی باتیں وہ نثر میں بھی کر سکتے تھے۔ لیکن اپنی عظیم شعری صلاحیتوں کے باعث انہوں نے نظم کا راستہ اختیار کیا کہ یہ زیادہ موثر اور دل گداز ہے۔

اقبال فلسفہ مشرق ومغرب کا ماہر تھا مگر اس کے کلام پر فلسفہ کی نہیں قرآن و حدیث کی چھاپ ہے۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ فلسفہ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ اور پھر اسے یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ ع

انجام خرد ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دوری

اسے فلسفی یا شاعر عرف عام کے معنوں میں قرار دینا سخت غلطی ہے۔ وہ دراصل ایک مجدد تھا اور اس نے عجمی تخیلات اور غیر اسلامی افکار کو رد کر کے خالص اسلام پیش کرنے کے لئے ارادتاً اشعار لکھے ہیں۔ اور وہ اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب ہے۔ مگر معلوم نہیں کیوں اس صاف سادہ اور سچی بات کو کہنے سے لوگوں نے یا تو قطعی گریز کیا ہے ہے اگر کیا ہے تو ضمناً۔ حالانکہ اسے صراحت سے کہنے اور اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ پیامِ اقبالؔ کی عام ذہنوں تک رسائی ہو۔ مثنوی مولانا روم کے لئے کہا گیا تھا کہ ع

مثنوی، مولوی، معنوی ہست قرآں در زبانِ پہلوی

یہی حیثیت کلام اقبالؔ کی ہے۔ اور میں نے سوچا کہ کلامِ اقبالؔ کو پیامِ اسلام کے معنی میں گھر گھر اور در در پہنچانے کے لئے میں اپنی تمام بے بضاعتیوں کے باوجود ایک کوشش کروں تاکہ مجھ سے کوئی بہتر شخص اس موضوع پر زیادہ وضاحت، زیادہ یقین واعتماد اور زیادہ اہلیت سے گفتگو کر سکے۔

اقبالؔ کی زندگی میں بہت سے تغیر وتبدل آئے۔ اور مختلف زبانوں میں ان کے کلام میں یہ تغیرات نمایاں ہیں اور ان کو انہوں نے چھپانے کی بھی کوشش نہیں کی۔ ایک وقت ان پر شک وزن کا بھی گزرا ہے خود ہی فرماتے ہیں ع

سالہا بودم گرفتارِ شکے

اور شاید یہ وہی زمانہ ہے جب انہوں نے ''ترانہ ہند'' اور ''نیا شوالہ'' وغیرہ لکھا

ہے۔ پھر ''سلی'' کی نظم سے ان میں ایک انقلاب آیا ہے اور اس انقلاب کا پھر انقلاب نہیں ہوا اور برابر ان کے جذبۂ ایمان و اسلام کو جلا ہوتی گئی۔ ان کے اشعار میں حقیقت پسندی اور جذبۂ محبت رسول ﷺ میں صداقت اور خلوص کوٹ کوٹ کر بھرا ہے لیکن ان کا یہ مصرعہ بھی بے معنی نہیں معلوم ہوتا کہ ع

ہے اس کی طبیعت میں تشیّع بھی ذرا سا
تفصیل علی ہم نے سنی ان کی زبانی

اسرارِ خودی ان کی پہلی معرکۃ الارا کتاب ہے جس میں انہوں نے اسلام کے بنیادی عقائد کو پیش کیا ہے۔ اس میں نیابتِ الٰہی یا رسالت کے بعد فوراً ''در شرح اسماء حضرت علی مرتضیٰؓ'' شروع کر دیا ہے۔.....اور تین خلفاء چھوڑ دیا ہے اور اس کے معنی کون نہیں جانتا کہ کیا ہیں لیکن رموزِ بے خودی میں جس جذبۂ صادق سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مدح کی ہے اور پھر بعد کی نظموں جن میں مہتم بالشان الفاظ ہیں خلفاءِ ثلاثہ کا ذکر کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنی آپ مثال ہیں۔ مقامِ شک سے مقامِ یقین تک پہنچنے کے لئے اقبالؔ پر یہ مصرعہ ہر طرح موزوں ہے۔ ع

اندک اندک عشق اندر آورد بیگانہ را

اور اس میں ان کی کوئی کسرِ شان نہیں ہے۔ کیونکہ وہ مقلد نہ تھے مجتہد تھے۔ وہ رسمی مسلمان نہیں تھے کہ اسلامی گھرانے میں پیدا ہونے سے مسلمان ہو گئے ہوں بلکہ تحقیق و اجتہاد، حیات و کائنات کے مطالعہ سے اسلام کی سچائی تک پہنچے تھے۔

میرا جو حقیر مطالعہ اقبال کا ہے اس کی بناء پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اپنے متعلق انہوں نے جو کہا تھا کہ۔ ع

مجموعۂ اضداد ہے اقبالؔ نہیں ہے

وہ آخر تک بچ رہا۔ مجھے تو تین اقبال نظر آتے ہیں۔ ایک گوشت پوست والا اقبال، دوسرا اقبالؔ شاعر اور تیسرا اقبالؔ فلاسفر۔ مادی اقبالؔ شاعر اقبالؔ سے قطعی مختلف ہے وہ خود کہتا ہے

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں سے موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

ایک دن علامہ اقبالؔ نے مجھ سے کہا کہ آپ وسط ایشیا میں جا کر کام کیجئے۔ یہ وہ وقت تھا

جب وسطِ ایشیا روس اور اسلامی اقتدار کی کشمکش میں تھا اور آخر کار انور پاشا یہیں لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ میں خاموش رہا تو فرمایا کہ آپ دریافت کریں گے کہ میں خود وسطِ ایشیا کیوں نہیں جاتا۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے اندر جذبہ ہے لیکن ہمت کی کمی ہے۔ نماز کے بارے میں یہ کہنے والا کہ

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

جس دن میں جیل سے رہا ہوا اس دن مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری بھی جیل سے نکلے تھے۔ شفاعت اللہ خاں صاحب منیجر اخبار ''زمیندار'' کے مکان پر ۲ بجے رات تک نشست رہی۔ عطاء اللہ شاہ بخاری کی دلچسپ گفتگو موضوع سے بے تعلق تسلسل کے ساتھ جاری تھی۔ اسی میں علامہ اقبال کا بھی ذکر آ گیا۔ عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنے مخصوص انداز میں مزاحاً لیکن جس میں محبت کی شیرینی بھی شامل تھی کہا کہ اس کی کیا بات کرتے ہو۔ اس کی شان میں تو کلامِ پاک کی آیۃ یقولون مالا یعقلون ہے۔ دراصل جن لوگوں نے کسی شاعر کے کلام کو اس کے عمل سے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے ان کو بہت دور از کار دلائل سے کام لینا پڑا ہے لیکن ناقدین فن کے لئے یہ رواج سا ہو گیا ہے کہ وہ کلام شاعر کو اس کے ذاتی احوال و کوائف کا مرقع تصور کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ شاعر نبی یا پیمبر نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اپنے حالات اور ماحول کی فضاؤں کو وہ عبور نہ کر سکے تو اس کا فن ناقص ہے اور اسی لئے مرزا غالب نے کہا ہے کہ ع

سخن چہ ننگ زِ آلودہ دامنی دارد

افکار و خیالات کی دنیا میں بھی اقبال کے اندر وہی تضاد موجود ہے۔ اقبال کونسل کے ممبر تھے۔ جہاں انہوں نے مسلمانوں کے معاملات کو پیش پیش رکھا۔ وہ مسلم لیگ کے صدر ہوئے اور خطبۂ صدارت میں پاکستان کا تخیل پیش کیا اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال تقسیمِ ہند کے بانیوں میں ہیں لیکن کلامِ اقبال میں اس کا ادنیٰ سا اشارہ بھی نہیں ملتا۔ میں نے ایک مضمون ''اقبال اور حبّ الوطنی'' تھا جو طبع بھی ہو چکا ہے۔ اس میں تفصیل سے اس نے اس موضوع پر بحث کی ہے اور اس رسالے میں میں نے چیلنج کیا تھا کہ کلامِ اقبال میں ایک مصرعہ بھی پاکستان کی موافقت میں نہیں مل سکتا ہے۔ کلامِ اقبال میں حبّ الوطنی یعنی ہندوستان سے محبت اور غدارانِ وطن سے نفرت کا اپنا ایک مقام ہے اور جن پر شوکت الفاظ

میں انہوں نے مادرِ ہند کی تصویر کھینچی ہے وہ کلامِ اقبال کے اس موضوع پر خلوص وکیف کی ایک نمایا مثال ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے بھی اس معاملے پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

یہی اقبال کے افکار فلسفیانہ کا ہے اور اگر تعمق سے کام لیا جائے تو نظریہ پاکستان بھی فلسفہ سیاست کا ایک جزو تھا۔ اسی طرح ۱۹۲۷ء میں جو مدارس لکچر بعنوان تشکیل جدید افکار اسلام طبع ہوئے ہیں ان کو بھی کلامِ اقبال سے تمیز کرنا پڑے گا۔ یہ تقریریں پہلے انگریزی میں شایع ہوئی تھیں۔ ان کے ترجمے کے لئے حضرت مولانا عبدلماجد صاحب دریابادی سے جب کہا گیا تو ممدوح نے ان تقریروں کے بعض اور ضمنی رجحانات سے اختلاف کرتے ہوئے کہا تھا کہ ابھی تو ان کو ہندوستان میں صرف نصف درجن آدمی سمجھ سکتے ہیں۔ ان کا اردو میں ترجمہ کر کے عام کرنا ہرگز مناصب نہیں ہے۔ بعد ازاں پھر ترجمہ ہوا۔ لیکن جن لوگوں نے ان افکار کو کلامِ اقبال کی شرح کی بنا قرار دیا ہے، انہوں نے کلامِ اقبال کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

اس کے ساتھ یہ بھی غور طلب ہے کہ بنیادی عقاید وتصورات میں کہیں لغزش نہیں ہے۔ توحید، رسالت، خلافت ارکانِ خمسہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ، جہادِ فی سبیل اللہ وغیرہ وغیرہ سب بدستور افکار فلسفیانہ میں بھی محفوظ ہیں اور ان کے دلائل عقلی پیش کئے گئے ہیں۔ ان دلایل کے بارے میں مجھ جیسا کم علم تو کچھ نہیں کر سکتا لیکن یہ تو مسلم ہے کہ جب کسی حقیقت کے لئے دلیلیں تلاش کی جائیں تو ہمیشہ ترمیم وترقی کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ اور ممکن ہے کہ ایسے موقع پر خود اقبال کا قطعہ ان پر صادق آئے۔

فلسفی با سیاست داں بیک میزاں سنج　　چشم آں خورشید کورے دیدۂ ایں بے نمے
آں تراشد مہرِ حق را مجتے نا استوار　　ایں ترا سد بہر باطن را دلیل محکمے

آخر سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو شخص قتل مرتد کو جائز قرار دے اور اس کی حمایت میں مضمون لکھے وہ ابلیس کے قصے کو مائی تھالوجی کیسے قرار دے سکتا ہے۔ ہم کو یا تو اس کی کوئی تاویل کرنی پڑے گی یا غیر متعلق اور ضمنی قرار دے کر نظر انداز کر دینا ہوگا۔ یا یہ ماننا پڑے گا کہ کہیں کہیں اقبال کے فلسفیانہ تصورات اور کلام میں تضاد ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ اقبال نہ تو عملی سیاست کا علمبردار ہے اور نہ اسلام کے بے شمار فرقوں میں کسی خاص فرقہ کا مبلغ۔ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی شرح کرنے اور مغرب زدگی اور عجمیت سے نجات دلانے کے لئے اٹھا ہے۔ وہ تقلیدِ جامد کا ہم نوا نہیں بلکہ تحقیق و اجتہاد کا پیامبر

ہے۔اس لئے اس کے کلام میں کسی وقتی سیاسی معاملے یا کسی جزوی اختلافی شرعی مسئلے کو تلاش کرنا عبث ہے۔وہ حیات وکائنات کا راز آشکارا کرنے کے لئے نکلا اور اسے حقائق اسلام میں سب کچھ مل گیا۔اس نے نجات وفلاحِ انسانیت کو اسلام اور صرف اسلام کی تعلیمات میں مضمر پایا اور اس کا کلام اسی کی شرح ہے۔

عمر ہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تازِ بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں
بروں از گنبدِ دربستہ پیدا کردہ ام را ہے
کہ از اندیشہ برترمی پردآہِ سحر گاہی

اس لئے اقبال کی ضدین کا صرف ایک حل ہے کہ کلامِ اقبال کو نہ ان کے ذاتی اعمال سے جانچا جا سکتا ہے اور نہ ان کے فلسفیانہ افکار کی ترازو پر تولا جا سکتا ہے۔کلامِ اقبال صرف EXPOSITION OF ISLAM (اسلام کی شرح) ہے اور یہی وہ اصل حقیقت ہے جسے نمایاں کرنے کے لئے میں نے چند اوراق کو مرتب کیا ہے۔اس کے ساتھ جب یہ بات بھی شامل کر لی جائے کہ اقبال کے خیالات میں برابر تغیر ہوتا رہا ہے۔اور ان کا کلام عملی سیاست سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تو کسی قسم کا ابہام باقی نہیں رہتا ہے۔جہاں تک اقبال کے شاعرانہ کمالات یعنی اندازِ بیان ندرت مصوری وموسیقی کا سوال ہے تو ان کے معترف تو وہ لوگ بھی ہیں جو کلام کے اصل پہلو یعنی اس کے مغز پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ع

ایک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
بغداد سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

مجھے اپنی کوتاہیوں کا علم بھی ہے اور احساس بھی۔لیکن جب اقبالؔ کا ''ادبی نصب العین''، تسلسل کے ساتھ ہفتہ وار ''ندائے ملت'' میں شایع ہوا تو بعض ممتاز علماء نے مجھ سے کہا کہ اول بار وہ اقبال سے روشناس ہوئے۔اس سے میری ہمت افزائی ہوئی اور میں نے ''کلام اقبال'' کو عام کرنے کی کوشش کا فیصلہ کیا اور یہ کتاب اس کا نتیجہ ہے۔اگر اس سے کچھ نیم تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی اسلام کی روح کو سمجھنے کے لئے کلامِ اقبال کے مطالعہ کا ذوق پیدا ہو گیا تو مجھے قلبی اور روحانی سرور حاصل ہوگا اور میں سمجھوں گا کہ میری سعی بار آور ہوئی۔

قاضی محمد عدیل عباسی
۲۲ر مئی ۱۹۶۹ء

اقبال کا ادبی نصب العین

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

مجھے ادبی نصب العین کا عنوان خود اقبالؔ کے ''دیباچہ اسرار خودی'' (اشاعت بار دیگر) سے حاصل ہوا۔ علامہ اقبال نے جب اول بار اپنے فارسی کلام کا پہلا مجموعہ ''اسرارِ خودی'' کے نام سے شایع کرایا تو اس میں خواجہ حافظ پر سخت لہجہ میں نکتہ چینی کی تھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ع

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار — جامش از زہر اجل سرمایہ دار
گوسفند است ونوا آموخت است — عشوہ وناز ادا آموخت است
آں فقیہہ طت نے خوار گاں — آں امامِ امتِ بے چارگاں
آں چناں مست شراب بندگی است — خواجہ محروم ذوقِ خواجگی است
نعرہ زن با عرفی ہنگامہ خیز — زندۂ با صحبتِ حافظ گریز

حافظ کیوں کہ اشاروں کنایوں میں شراب و مستی کی تشبیہات سے معرفت الٰہی و عرفان و محبت کا پیام بر تصور کیا گیا ہے۔ اور عام طور پر صوفیائے کرام اس کے بادہ رند و مئے خانہ کو نور وتجلیات حقیقۃ الحقائق کے لئے استعارہ قرار دیا ہے۔ اس لئے اقبال کے خلاف تمام ہندوستان میں ایک طوفان بپا ہو گیا۔ اور اخبارات ورسائل میں اس حصہ نظم کی سخت مذمت کی گئی۔ اس مخالفت کے کاروانِ سالار خواجہ حسن نظامیؒ تھے اور انہوں نے اقبال کی حافظ پر نکتہ چینی کو تصوف سے عناد اور مسلمانوں میں دینوی ترقی کے فروغ کی خواہش پر محمول کیا۔ یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ مگر اس تمام ہنگامہ آرائی میں کوئی ذائقہ پیدا نہ ہو سکا۔ کیونکہ علامہ اقبالؔ نے کامل سکوت اختیار کیا تا آنکہ ''اسرارِ خودی'' کی دوسری اشاعت ہوئی اور بارِ دیگر اشاعت میں یہ اشعار کلام سے خذف کر دئے گئے تھے۔ علامہ اقبالؔ کا اگر کوئی جواب شایع ہوا تو وہ اس دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ تھا۔ جو جواب کم اور اعتذار زیادہ تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ حافظ پر میری تنقید کسی اور وجہ سے نہ تھی اور نہ ان کی ذات پر حملہ تھا صرف ان کے کلام کے ''ادبی نصب العین'' پر اعتراز کرنا مقصود تھا۔ مگر کیوں کہ سخت قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں اس لیے میں ان اشعار کو اپنے کلام سے نکال دیتا ہوں اور تب سے آج

تک یہ اشعار طبع نہیں ہوئے۔ اس تمام دور میں میرا خیال تھا کہ ''ادبی نصب العین'' کی چونکا دینے والی اصطلاح کے بارے میں علاّمہ اقبال کا جائزہ لوں مگر یہ کام سخت مشکل تھا۔ میری تہی مائگی، اچھے کتب خانوں سے بُعد اور وقت کی کمی کے باعث بہت سی دشواریاں حائل رہیں۔ مگر وقت ہے کہ گزرا چلا جاتا ہے۔ آج خیال گزرا کہ جو کچھ اثاثہ سرسری طور پر اتنے دنوں کی غور و فکر سے دماغ میں یکجا ہوا ہے اسے نقش اول کے طور پر پیش کر دوں۔ ہو سکتا ہے کوئی صاحب نظر و علم و فکر و قلم اس موضوع پر سیر حاصل بحث کر سکے۔

ادبی نصب العین کا مفہوم

شعر و شاعری نے ابتدائے آفرینش سے انسانی ذہن و خیال کو متاثر کیا ہے اور عالم میں جو بڑے بڑے کام انسان کی رفعت و اصلاح اور اس کی جسمانی روحانی اور دماغی ترقی کے ہوئے ہیں ان سب میں شاعری نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ کہنے میں مبالغہ نہ ہوگا کہ ہر نیک اور عظیم کارنامہ کے لئے اس کی اوّلین بنیاد یعنی اس کی جذباتی تحریک کو شاعر کے نغموں نے تعمیر کیا ہے۔ مذہب جو کسی نہ کسی طرح سارے عالم پر چھایا ہوا ہے۔ اس کی زبان رومانی ہے اور اس کا شاعری سے گہرا لگاؤ شروع سے رہا ہے۔ وید جو دنیا کی قدیم ترین اور الہامی کتاب کہی جاتی ہے نظم میں ہے۔ رامائن جسے کروڑوں انسان روزانہ پڑھتے ہیں اور اس پر وجد کرتے ہیں شعر و نغمہ ہے۔ قرآن اگرچہ نثر میں ہے مگر اس کی زبان اس درجہ پر کیف ہے کہ ابتداء میں مخالفینِ اسلام اسے شاعری کہا کرتے تھے۔ ایک فقرہ ملاحظہ ہو۔ ''بعض انسانی دل پتھر کی طرح سخت ہوتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکر پتھر تو پھٹ جاتے ہیں اور ان سے چشمے ابلتے ہیں۔ لیکن بعض انسانوں کے دل نہیں پسیجتے۔'' احادیث کا بھی یہی حال ہے ایک فقرہ اس کا بھی گوش گزار کرتا ہوں۔ ''اے امتی جلدی کرو نیک کام کرنے میں ان فتنوں کے آنے سے پہلے جو اس طرح آتے ہیں جیسے آسمان پر ابر کے ٹکڑے آتے ہیں۔'' اصلاحِ اخلاق تزکیۂ نفس، سادگی، بلند فکری، نیکی اور احسان، مہر و مروت، خوش خلقی و پاکیزگی، ایثار و قربانی، خدمتِ خلق، عفو و درگزر الغرض جتنے بھی انفرادی اعمالِ صالحہ ہیں وہ سب مدعائے تصوف میں داخل ہیں اور تصوف ہمہ تن شاعری ہے۔ سور داس و کبیر داس کے بھجن گائے جا رہے ہیں، مثنوی مولانا روم متقشف علماء لحن سے پڑھ رہے ہیں..... نعت خوانی دینِ اسلام کا جزو بن چکی ہے۔ بڑے بڑے زاہدان خشک مدینہ

منورہ کا تصور کرتے ہی شعر کی رنگینی کے دائرے میں آجاتے ہیں۔ جامی اور حافظ، شمس تبریز، عثمان ہارونی، نصیرالدین چراغ دہلوی، میرزا مظہر جانجاناں اور بے شمار صوفیہ معرفتِ الٰہی کی سرمستی شعر و نغمہ میں کھو گئے۔ قوالی بعض کے نزدیک ایک مذہبی رسم قرار پائی گئی۔ سیکڑوں اولیاء کرام کے مزاروں پر سالانہ عرس ہوتے ہیں اور سماع کی محفلیں ذوق و شوق سے منعقد کی جاتی ہیں جن میں خدا جویانِ معنی آشنا مدہوش ہو کر رقص کرتے ہیں۔ ایک دن مولانا حسرت موہانی نے دورانِ گفتگو میں مجھ سے کہا کہ بزمِ سماع میں ایک شعر سے جو رفعت روحانی حاصل ہو جاتی ہے وہ سالہا سال کی عبادت سے حاصل نہیں ہوتی۔

رزم میں بھی شاعری کا مقام بزم سے کم نہیں رہا ہے۔ زمانہء قدیم میں مختلف ملکوں کے اندر یہ رواج رہا ہے کہ عورتیں میدانِ جنگ میں موجود رہتی تھیں اور جوش دلانے والے اشعار پڑھ کر مردوں کا دل بڑھاتی تھیں۔ ہر ملکی جدوجہد اور ہر انقلاب کی پشت پر کسی شاعر کی پکار کارفرما رہی ہے۔ اس کی پکار نے کمزور حق کو مضبوط باطل سے ٹکرا دیا اور یہ اسی وجدان کا طفیل تھا کہ باطل پاش پاش ہو گیا۔ خود اقبال کے کلام میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ ع

خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

اٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں　　نفسِ سوختہ شام و سحر تازہ کریں
یا گنبدِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل　　یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مسلکِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست　　یہ مسلکِ ملا و جمادات و نباتات

انسان تو انسان جانوروں تک کو شاعری نے مغلوب و سرمست کیا ہے۔ عرب میں حدی اس نغمہ کو کہتے ہیں تو شتربان اپنے ناقہ کو تیز گام کرنے کے لئے الاپتا ہے جس سے اونٹنی مدہوش ہو کر دوڑنا شروع کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایک عاشقانِ رسول ﷺ کا قافلہ مدینہ کی جانب جا رہا ہے اور ساربان سے کہہ رہا ہے ع

ساربان یاراں بہ یثرب ما بہ نجد
آں حدی گوناقہ آرد بہ وجد

یعنی اے ساربان میرے احباب تو مدینہ پہنچ گئے اور میں ابھی نجد میں ہوں ایسا نغمہ گا کہ اونٹنی مست ہو کر دوڑنا شروع کر دے تا کہ ہم جلد پہنچ جائیں۔

شاعری سراسر وجدان و کیف، محرکِ جذبات اور تلاشِ حق ہے۔ نقادِ فن کے پاس

جا کر اس میں صنائع و بدائع، نکتہ آفرینی، نازک خیالی، تمثیل کی ندرت اور اس طرح کی بہت سی باتیں جانچی اور پرکھی جاتی ہیں اور بیچارہ شاعر فریاد کرتا ہے کہ شعر مرا بمدرسہ کہ برد۔ اصل حقیقتِ شعر یہ ہے کہ وہ حیات و کائنات کے بارے میں کوئی مستحکم فکر دیتا ہے۔ وہ انسان کے دل پر چوٹ مارتا ہے اور اسے عمل کے جوش میں لاتا ہے۔ اسے نہ امیدی میں ڈھارس، مصیبت میں تسکین، مشکلات میں مقابلہ اور حالاتِ بد میں ہمت دلاتا ہے۔ اور خود آگاہی کی لذت بخشتا ہے۔ کون سا وہ انسان ہے جسے روزمرہ اپنے ذاتی معاملات، اپنے فکر و نظریہ عالم اپنے ذوق، خدمتِ خلق اور خود اپنے نفس کے محاسبہ کے لئے ایسے حالات کا سامنا نہیں ہوتا۔ جہاں اسے صاف دماغ سے ایک بات سمجھنے اور اس پر کوئی فیصلہ کر کے عمل کرنے اور اپنے آپ کو غلط روی سے روکنے اور معرکۂ حق و باطل میں اپنے جذبات کو برتر از اندیشۂ سود و زیاں بنانے کی ضرورت نہ ہوتی ہو۔ ان سب معاملات میں ایک واعظ کی تقریر، ایک فلسفی کے تصورات، ایک حکیم کے اقوال سے زیادہ شاعری اس کی دلگیری کرتی ہے۔ اور یہی وہ جگہ ہے جہاں ایک آمی جو محاسنِ شاعری کی فنی باریکیوں سے ناواقف ہوتا ہے شاعر کے فکر و وجدان و کیف سے استفادہ کرتا ہے اور اسی لئے کہا گیا ہے کہ "شاعری جزوے ست از پیغمبری"

الغرض شعر ایک عجیب دل کش چیز ہے۔ انسانی افکار و جذبات کو جتنی چیزیں متاثر کرتی ہیں ان میں شعر کا درجہ سب سے بلند ہے ع

صد نالہ شبگیرے حد صبح بلا خیزے صد آہ شرر ریزے یک شعر دلاویزے

شعر کی جادوگری کے بے شمار واقعات ہیں اور یہ ہمارے روزمرہ کے تجربات میں شامل ہے۔ مگر دو ایک کا تذکرہ کرنا مناسب ہوگا کیونکہ مثالوں سے حقیقتیں بہتر طریقہ پر ذہن نشین ہو جایا کرتی ہیں اگرچہ جو مثالیں میں پیش کروں گا وہ پرانی اور عام واقفیت کی ہیں اور ان میں کوئی جدت نہیں ہے۔ لیکن موضوعِ سخن کے لئے موزوں ہیں۔

مشہور واقعہ ہے کہ فارسی کا پہلا شاعر رودکی جو مغنی بھی تھا اور نابینا بھی۔ بخارا کے بادشاہ کے دربار میں رہتا تھا اور ہر روز بادشاہ کو گا کر اپنا کلام سنایا کرتا تھا۔ ایک دن بادشاہ اپنے وزراء و عمراء خدام وغیرہ کے ساتھ سیر و شکار کرتا ہوا ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں چشمے جاری تھے اور سبزہ زار تھا۔ مناظرِ فطرت ایسے دلکش اور دلربا تھے کہ وہاں سے جانے کو جی نہ چاہا اور تلون طبعی بادشاہان پر عمل کر کے بادشاہ وہیں مقیم ہو گیا اور بخارا واپس ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔

عمراء وخدام دربار عاجز آ کر آخر رودکی کے پاس پہنچے روزانہ دوپہر کے کھانے کے بعد جب بادشاہ قیلولہ کرتا تھا تو وہ ستار پر کچھ اشعار گا کر سناتا تھا۔ ایک لاکھ روپیہ لوگوں نے نظر کرنے کو کہا۔ رودکی کو اپنے فن پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے سب کو آگاہ کر دیا کہ تیار رہیں، چنانچہ اس دن اس نے اپنا وہ معرکتہ آرا قصیدہ گایا "جوآید ہمے" کی ردیف کے ساتھ شہرہ آفاق ہے۔ اس نے بادشاہ کا بخارا میں داخلہ اور وہاں کا خیر مقدم کچھ اس طرح نظم کیا تھا کہ بادشاہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اس کا ایک شعر حسب ذیل ہے۔ ع

اے بخارا شاد باش و شاد زی　　شاہ اسویت میہماں اید ہمے

چنانچہ بادشاہ فوراً وہاں سے بھاگا۔ اسطبل میں جا کر خود گھوڑے پر زین کسی اور اس وقت تک باگ نہیں کھینچی جب تک بخارا پہنچ نہ گیا۔ یہ ہے شعر کا سحر انگیز اثر۔ اسی طرح حفیظ جالندھری لندن گئے وہاں جو پنجابی ہندو مسلمان موجود تھے۔ انہوں نے ان کی چائے پر دعوت کی کسی نے کہہ دیا کہ ان لوگوں میں بہت سے عرصے سے لندن میں پڑے ہوئے ہیں گھر نہیں جاتے اور ان کے بیوی بچے پریشان ہیں۔ چنانچہ حفیظ نے اس موقع کے لیے ایک نظم لکھی ع

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

وہ بھولی بھالی بچوں کی مائیں
دامن میں جن کے ٹھنڈی ہوائیں
چھوڑا ہے ان کو کس کے سہارے
اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

فوراً لوگوں نے پروانہ راہداری کے لئے درخواستیں دیں اور وطن کی محبت کا جذبہ موجزن ہو گیا اور پردیسی دیس سدھارے۔

شعر کو دلآویز بنانے کے لئے تین چیزیں درکار ہیں: (۱) مفہوم (۲) حسنِ کلام اور (۳) حسنِ بیان، مفہوم وہ پیام ہے جسے شاعر دانستہ یا نادانستہ لوگوں کے دلوں میں اتارنا چاہتا ہے۔ یہ اصل چیز ہے یعنی یہ کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے حسنِ کلام اور حسنِ بیان طرزِ ادا کا نام ہے۔ یعنی وہ اپنی بات کہنے کے لئے کس طرح کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور کس ڈھنگ سے کہتا ہے۔ اگر اچھی سے اچھی بات کے لئے شاعر کے پاس زبان و الفاظ کی شگفتگی اور طرزِ ادا کی ندرت نہیں ہے تو اس کا شعر پھسپھسا رہ جائے گا۔

اقبال اور حافظ

حافظ کے کلام میں حسنِ کلام اور حسنِ بیان اور شاعرانہ محاکات تو بدرجہء اتم موجود ہیں۔ حافظ کی رنگین بیانی اور تصویر کشی ناقابلِ انکار ہے۔ ایک دن مولانا حسرت موہانی ایک فارسی کا شعر کانپور میں اپنی دوکان پر گنگنا رہے تھے۔ مولانا آزاد سبحانی بھی موجود تھے۔ سن کر بے خود ہو گئے اور پوچھا کس کا کلام ہے۔ مولانا حسرت نے کہا کہ سوائے حافظ رنگین بیاں کے اور کس کا ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا قادر الکلام اور سحر نگار

شراب وساقی وآبِ رواں وروئے نگار

کی عکاسی کرنے لگے تو اختلاف نمودار ہو سکتا ہے ورنہ ایک عامی تا ناقابلِ توجہ ہوتا ہے۔ حافظ کے کلام کے بارے میں اقبال کا خیال ہے کہ وہ دنیا سے بیزاری اور غوغائے عالم سے فرار کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اور اس طرح یا تو وہ عیش وتن آسانی کی تعلیم دیتا ہے یا اس تصوف اور فقر کی جو گوشہ نشینی اور خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات یعنی جہادِ عالم سے رد گردانی ہے

ع

دلے باغم بسر برون جہاں یکسر نمی ارزد
بلے بفروش دلق ما کر و بہتر نمی ارزد
بے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغان گوید
کہ سالک بے خبر نہ بود زراہ ورسم منزلہا

"سکوں پرستی راہب" کا وہ منظر جو غالب کے زمانے میں عام ہو چکا تھا اور جسے حاصلِ زندگی خیال کیا جاتا تھا۔ اس کا فتویٰ حافظ کے کلام سے اس طرح ملتا تھا کہ اسے باضابطہ درس ومطالعہ میں شامل کر دیا گیا تھا اور اقبال نے "ادبی نصب العین" سے یہی مراد لیا تھا کہ حافظ کے کل کلام کا قلوب انسانی پر کیا اثر مرتب ہو رہا ہے یعنی اس کے پیام کا نچوڑ کیا ہے۔ اگرچہ اقبال کو یہ خوب معلوم تھا کہ حافظ جگہ جگہ جرأتِ رندانہ مبسکار کا بھی امام ہے۔

بیا تا گل بر افشانیم وے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشکافیم وہ طرحِ دیگر اندازیم

اقبال کا دور ایک خاص مزاج رکھتا ہے۔ اقبال کے دور میں عالمِ اسلام کی عام

تباہی اور ملک و وطن کی غلامی رگوں میں خون کو گردش دے رہی تھی اور مختلف جماعتیں اپنے اپنے لائحہ عمل کے ساتھ دارورسن کو دعوت دے رہی تھیں۔ ع باجاں رسد بہ جاناں باجان زتن برآید کا عام نعرہ تھا۔ اس لئے شراب وساقی وآب رواں وروئے نگار کی جانب توجہ کرنے کی فرصت نہ تھی۔ کلامِ شاعر میں بمسکار، للکار، جرآتِ رندانہ ولغزشِ مستانہ کی تلاش تھی سیاسین اور مفکرین کے ساتھ ادیب ونقاد بھی اس سے مستثنیٰ نہ رہے اور یہ زمانے کا اثر تھا اس لئے مولانا ابوالکلام آزاد اور پروفیسر ناصرالدین (الٰہ آباد یونیورسٹی) اور بہت سے کلام فارسی کے ماہرین عرفی ونظیری کے قدرداں ہوگئے تھے اور حافظ سے اجتناب رکھتے تھے۔ مولانا ابوالکلام، نظیری کو ''فطرت نگارِ نیشاپور'' لکھنے کے عادی تھے مگر آیئے ایک جگہ نظیری اور حافظ کا اسی نقطۂ نظر سے مقابلہ کریں۔

عبادت سحری راکمن نظیری کم
کہ ہرچہ کرد دعاہائے صبح گاہی کرد

یعنی اے نظیر عبادتِ سحری کو کم نہ کر جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ دعاہائے صبح گاہی سے حاصل ہوا ہے کیا عمل سے فرار کا اس سے زوردار سبق کہیں ملے گا۔

بہ خلاف اس کے حافظ کہتا ہے ع

دل گفت کہ کارم بدعا باز تواں یافت
عمریست کہ عمرم ہمہ درکار دعا رفت

یعنی دل نے کہا کہ کام شاید بدعا سے نکل جائے جتنی بھی عمر ہے وہ دعا ہی میں تو گزری ہے۔ یعنی ع تمناؤں سے بنا کرتی ہیں تقدیریں کہیں کام عمل سے ہوگا نہ کہ دعا سے۔ اسی طرح حافظ یہ بھی کہتا ہے کہ

قومے بجدوجہد گرفتند وصل دوست
قومے دگر حوالہ بہ تقدیر می کند

یعنی کسی قوم نے جدوجہد کی تو وہ مقصد برآری میں کامیاب ہوگئی اور ایک قوم ایسی بھی ہے جو معاملہ تقدیر کے حوالے کردیتی ہے۔ دیکھئے عمل کے گریز پر کتنا زبردست طنز ہے۔ اسی طرح جستہ جستہ اشعار کا تقابل کیجئے تو کہیں کہیں نظیری میں بھی قنوطیت اور حافظ میں جابجا پیامِ جہدوعمل ملے گا۔ لیکن دونوں کے کلام کے مجموعی اثرات مختلف ہیں اور اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ حافظ کا میخانہ، مفہوم عام میں اس صوفی تارک الدنیا کی آماجگاہ تھا

جس کی لغزشِ مستانہ صرف لاہوت اور ناسوت میں تھی۔ اور جس کا اس عالمِ آب و گل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اقبال جو مجاہدِ اعظم تھا جس کی تعلیم کا پیام "برہم زن" اور ع خوف باطل کیا ہے کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو اور جو یہ کہتا ہے کہ ع

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل

اور طنز کرتا ہے کہ ع

صوفیٔ ما چارہ غیر از رم نداشت
طاقتِ غوغائے ایں عالم نداشت

اور جس نے اپنے مفہوم کی وضاحت کے لئے صوفیائے کرام سے بغاوت کر کے خودی کی اصطلاح ایجاد کی، یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ عوام و خواص خوب و زشت کے امتیاز میں ترکِ دنیا کو عملِ صالح اور ذریعہء معرفتِ الٰہی قرار دیں۔ اس لئے اس نے نقطۂ نگاہ سے حافظ پر کڑی نکتہ چینی کی، اقبال کی نگاہ میں حافظ اس تصوف کا علمبردار تصور کیا جاتا تھا تو تعطل بے کاری اور بے عملی کا دوسرا نام ہے اور حیات کے معرکوں سے کنارہ کش ہو کر صرف تسبیح و سجود میں گم کر دیتا ہے۔ گویا کہ وہ اس ذکر و فکر صبح گاہی میں اس طرح مست کرتا ہے۔ جس سے خانکاہی مزاج پیدا ہو اور دنیا سے مکمل اجتناب پیشِ نظر رہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دعوتِ خیر اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر آبائی وراثت اللہ ہو اللہ ہو میں گم ہو کر رہ جائے۔ یعنی حافظ کے کلام کا اثر جہادِ زندگی میں حصہ لیکر قیامِ حق و غارت گری باطل کے منافی تھا۔ یہ تھا کلامِ حافظ کا بنیادی تصور جس پر اقبال نے بھرپور ضرب لگائی۔ جب علامہ اقبال نے اسرارِ خودی کی دوسری اشاعت میں حافظ پر جو اشعار لکھے تھے تو ہمارے دوست مولانا غلام رسول مہر جو اخبار زمیندار کے ادارہ میں بزمانہء خلافت میرے رفیق تھے اور جو خود کلام اقبال کے بڑے شیدائی تھے جوش میں کہا کرتے تھے کہ اقبال نے بزدلی دکھائی مگر یہ ان کے مذہبی عقائد کا اثر تھا۔ وہ تصوف سے حد درجہ بیزار تھے اور اس کا تو حال معلوم نہیں۔ اس وقت وہ اپنے گیر مقلد ہونے پر بڑا فخر کرتے تھے۔ ان کے مطالعے میں ہمہ وقت امام ابن تیمیہ، ابوالکلام آزاد، عرفی، نظیری، غالب (فارسی) اور اقبال کی کتابیں رہتی تھیں۔ اور اپنے کو وہابی کہنے کے باوجود غالب کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ ضرور لگاتے تھے۔ مہر صاحب غصہ میں آتے تھے تو اپنے کو وہابی بھی کہتے تھے لیکن اسی کے ساتھ وہ بڑے روادار

اور بلند نظر تھے۔ ان کا ساتھ میری زندگی کی بہترین یادوں سے بھرا ہوا ہے۔ بہر حال یہ تھا اقبالؔ کا نظریہ حافظ کے بارے میں۔

اقبال

اب آیئے کلام اقبالؔ کا جائزہ لیں۔ اقبالؔ نے جب اس دنیا میں آنکھ کھولی تو دو زبردست طاقتیں مسلم معاشرہ میں کارفرما تھیں اور عوام و خواص کے دماغوں پر چھائی ہوئی تھیں۔ ایک تو خانقاہی قسم کا تصوف جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور اس مئے خانۂ معرفت کے ساقیوں میں ایک ساقی حافظ بھی تھا۔ اور دوسرے علومِ مغرب کی چکاچوندھ کر دینے والی کرنیں۔ اس طرح مسلمان دو متضاد حصوں میں بٹے ہوئے تھے یا تو وہ رہبانیت اختیار کر لیتے تھے یا مغرب زدگی۔ اس کو اقبالؔ نے یوں بیان کیا ہے ع

کہا اقبال سے پیرِ حرم نے — یہ محراب و منبر سو گیا کون
صدا مسجد کی دیواروں سے آئی — فرنگی بت کدے میں کھو گیا کون

اب دونوں کے خلاف اقبالؔ نے جہاد کی ٹھانی۔ حسنِ کلام اور حسنِ بیان دونوں کا وہ امام تو متفقہ طور پر تسلیم ہی کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ ایک مستقل ارادہ اور نیت لے کر میدان میں کودا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبالؔ نے جس ''ادبی نصب العین'' کو اپنا طرۂ امتیاز بنایا اس کے لئے کیا طریقہ کار اختیار کیا۔ لیکن قبل اس کے کہ اس موضوع پر جو اصل بحث ہے کچھ کہا جائے یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ اقبالؔ کے کلام کو ابہام تصوف سے خالی تصور کرنا یا اسے تصوف سے خالی کرنا یا اسے تصوف کا مخالف قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔ وہ ایک مصلح تھا جو شریعت حقہ کی تعلیمات میں ہی جوہرِ حقیقت کو دیکھتا تھا اور جہاں جہاں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا وہاں وہاں درست کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ خشک مزاج منقشف زاہد بھی نہ تھا۔ سودائے عشق اس کے سر میں بھی سمایا ہوا تھا اور مستی و جنونِ عشق میں وہ کسی سے پیچھے نہ تھا۔ چنانچہ ملاحظہ ہو ع

حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ کے مزار پر دعا کرتے ہوئے لکھتا ہے ع

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا

بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظامِ مہر کی صورت نظام ہے تیرا

اقبالؔ کے کل پیغام کا نچوڑ ''عشق رسولؐ'' ہے اور اس لئے وہ تب وتابِ دل سے کس طرح بیگانہ ہوسکتا ہے اور یہی تب وتابِ دل ہے جس پر تصوف کی پوری عمارت کھڑی ہے لیکن وہ زندگی سے فرار بھی اختیا کرنا نہیں چاہتا۔ اپنے مفہوم کو اس نے ایک شعر میں ظاہر کردیا ہے ع اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام

حرام میری نگاہوں میں نائے چنگ ورباب

''خودی''

اقبالؔ نے اپنے مدعا کو طرح طرح سے ظاہر کیا ہے۔ صبح شام، ستارے، سورج چاند تمام مناظرِ فطرت اور ہر شے اور ہر نقطۂ نگاہ سے اسے اجاگر کیا ہے اور چونکہ شاعرانہ محاکات کا امام تھا اور الفاظ کو نگینوں کی طرح ثبت کرتا تھا بات سیدھی دل میں اتر جاتی ہے۔ کہیں سے دو اشعار لے لیجئے انتخاب میں دقت نہ ہوگی۔

مشرق خراب ومغرب ازاں بیشتر خراب
عالم تمام مردہ و بے ذوق آرزو است

ساقی بیار بادہ و بزم شبانہ ساز
مارا خراب یک نگہِ محرمانہ ساز

یعنی مشرق تو خراب ہے مغرب اس سے زیادہ خراب ہے تمام عالم مردہ و بے ذوق جستجو ہے۔ اے ساقی شراب لا اور بزم شبانہ کو اور ہم کو ایک نگہِ محرمانہ سے مست کردے اسی بزمِ شبانہ کو سجانے اور نگہِ محرمانہ کو عام کرنے کے لئے اقبالؔ نے بالکل نئی تشبیہات اور انوکھے محاورے استعمال کئے ہیں۔ جس سے دنیائے ادب میں انقلاب آگیا اور صرف الفاظ بدل دینے سے یا ان کے معنی تبدیل کردینے سے ایک دوسری حقیقت آشکارہ ہوگئی۔ ان الفاظ ومحاورات میں سب سے پہلے جس کا خیال آتا ہے وہ لفظ ''خودی'' ہے۔ اقبالؔ سے پہلے ''خودی'' کا لفظ نہایت مکروہ تصور کیا جاتا تھا۔ معرفت الٰہی حاصل کرنے کے لئے

ضروری تھا کہ انسان اپنے کو بالکل مٹادے تا آنکہ وہ قطرہ بن کر حقیقت الحقائق کے دریا میں گم ہوجائے۔ خودی پر اقبالؔ نے بہت کچھ لکھا ہے اور اس پر دوسروں کی تشریح بھی بہت کچھ آچکی ہے۔ موضوعِ سخن کے اعتبار سے یہاں صرف اتنا عرض کردینا کافی ہے کہ اس خاص معاملے سے انتخاب کا منشاء ''وحدت الوجود'' اور رہبانیت کے عقیدوں پر ضرب کاری لگانا تھا۔ اقبالؔ کے کلام کے مطالعے سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کا منشاء یہ تھا کہ ''وحدت الوجود'' کا عقیدہ غلط اور بے بنیاد ہے اور مشہورات بے اصل سے ہے..... اور اسلام کی تعلیم کے منافی ہے۔ اور جب انسان اپنی ہستی کو ہستئ الٰہی میں گم کردینے کا آرزامند ہوتا ہے تو اس سے خانقاہی اور رہبانیت پیدا ہوتی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ سامنے ہے جب بدھ مذہب یہاں بہت ترقی کرگیا تو سوامی شنکر آچاریہ ''ویدانت فلسفہ'' لے کر اٹھے۔ بدھوں کے منادر گروادئے گئے اور مٹھ قائم کئے۔ یہ مٹھ دو قسم کے تھے ایک تو ''نہنگ'' جہاں کا گرو غیر شادی شدہ ہوتا تھا اور دوسرے ''گرہست'' یعنی جہاں کا گرو شادی بھی کرسکتا تھا۔ موخر الذکر بہت کم مقبول تھے۔ ان مٹھوں میں کسی نہ کسی دیوتا یا دیوی کی پوجا ہوتی تھی۔ کہیں پاربتی اور کہیں شیو جی اور کہیں کسی اور کی اور اسی لحاظ سے ان کے لباس تھے۔ سب گرو ابستر پہنتے تھے۔ اور پاربتی جی کے پجاری کان میں زیور بھی رکھتے تھے۔ گرو کا کام چیلوں کی روحانی تربیت تھا۔ وہ یا تو اپنا جانشین نامزد کردیتے تھے یا اگر ایسا نہیں کیا تو چیلے اپنوں میں سے کسی کا انتخاب کرلیتے تھے۔ سوامی شنکر اچاریہ نے تمام ہندوستان میں اس قسم کے مٹھ بنوادئے۔ کیونکہ گوتم بدھ واجب الوجود کے بارے میں نہ ہاں کہتے تھے اور نہ نا۔ اور ویدانت فلسفہ کی تعلیم یہ تھی کہ بجز خدا کے اور کسی کا وجود ہی نہیں ہے۔ اس لئے معرکہ صاف اور کھلا ہوا تھا۔ مسلمانوں میں جو خانقاہیں قائم ہوئیں ان میں قریب قریب یہی طریقہ کارفرما تھا۔ پیرِ خانقاہ مٹھ کے گرو کی طرح دنیا اور دنیا کے آلام سے کوئی مطلب نہیں رکھتے تھے۔ ان کی غرض صرف ترکِ دنیا اور حصولِ معرفتِ الٰہی تھی اور عام طور پر ''وحدت الوجود'' عقاید اور خیالات کا سدرۃ المنتہیٰ تھا۔ اقبالؔ نے کہا کہ انسان کے روحانی سفر کی اول منزل اس کا خود وجود اس مادی دنیا کا وجود ہے۔ جب تک وہ اپنی معرفت حاصل نہ کرے حیات وکائنات کے فلسفہ کو سمجھ ہی نہیں سکتا اور کارگاہِ ہستی میں محض ناکارہ ہوکر رہ جائیگا۔ ازل سے انسان حیات وکائنات کو سمجھنے اور اس کی گتھی کو سلجھانے میں لگا ہوا ہے کہ وہ کیا ہے اور یہ دنیا جہاں خوبصورت اور دل لبھانے والے مناظر، اس کو آرام وراحت پہنچانے والے سامان۔ مادی

کیا ہیں اور کیا اس عالمِ آب و گل کا کوئی خالق ہے۔ کوئی ایسی ہستی ہے جس نے اسے بنایا ہے اور وہ اسے بگاڑ سکتا ہے۔ وہ اس پر کارفرما ہے اور اس میں قادر المطلق کی صفات ہیں۔ دنیا نے عہد بہ عہد اور عصر بہ عصر ان معاملات میں بڑی ٹھوکریں کھائیں اور بڑی بڑی بحثوں کے دروازے کھلے۔ مذہب، فلسفہ، سائنس اور عقل انسانی نے مختلف النوع عقائد و تخیلات قائم کئے، کسی نے خدا کا کسی نے روح کا کسی نے مادہ کا انکار کیا۔ آج بھی وہ گروہ موجود ہیں اور ہمیشہ سے رہے ہیں۔ آج بھی دنیا دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے ایک وہ جو شدت سے وجود باری کا انکار کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو اسے حقیق الحقائق مانتے ہیں۔ جو لوگ خدا کا وجود مانتے ہیں وہ مذہبوں میں تقسیم ہیں اور ہر مذہب کا الگ عقیدہ ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جو خدا کو مانتے ہیں لیکن کسی ایک مذہب سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ عیسائی مذہب خدا کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور روح القدس (حضرت جبریل علیہ السلام جن کو ناموس اکبر بھی اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ کا پیغام یعنی وحی اللہ کی طرف سے پیغمبروں کے پاس لاتے تھے) کو بھی خدائی میں شریک کرتے ہیں اور اسی کو عقیدۂ تثلیث کہا جاتا ہے۔ سوامی شنکراچاریہ جو ویدانت فلسفہ کے خاص مبلغ ہیں مادہ اور روح کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے ہیں اور صرف خدا کو مانتے ہیں۔ مادہ کو وہ فریب نظر یا فریب خیال تصور کرتے ہیں۔ بارکلے فلاسفر نے بھی مادہ کے وجود سے انکار کیا ہے۔ سوامی ویویکانند جو ویدانت فلسفہ کے آخری عظیم مبلغ تھے جب کسی کو خط لکھتے تھے تو ان الفاظ میں خطاب کرتے تھے MY SELF IN THE GARB OF MR. یعنی میں خود بہ لباس فلاں۔ آریہ سماجی خدا، روح اور مادہ تینوں کے وجود کے قائل ہیں۔ لیکن وہ تینوں کو ازلی مانتے ہیں۔

اس الجھن کو دور کرنے کے لئے اسلام کا ایک واضح اور روشن نظریہ ہے جس سے اتفاق یا اختلاف کرنے کا ہر شخص کو حق ہے لیکن اس میں کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں ہے۔ اسلام تعلیم دیتا ہے کہ خدا، روح اور مادہ تینوں کا وجود ہے لیکن خدا روح اور مادہ کا خالق ہے اور صرف خدا وند کریم ازلی ہے۔ وہ غیر محض ہے اور اس کی صفات لامتناہی ہیں۔ قرآن پاک جگہ جگہ اللہ کی صفتِ تخلیق پر زور دیتا ہے اور جا بجا اس کو زوردار الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی گرد کو انسان اپنی تمام علمی ترقیوں کے باوجود ابھی تک نہیں پا سکا۔ اب یہ طے ہو چکا ہے کہ ایجاد (INVENTION) بھی تک کوئی نہیں ہوئی صرف دریافت (DISCOVERY) ہوئی ہے۔ ڈے کارٹس (مشہور فلاسفر) نے اپنی دلیل کا آغاز

اس طور پر کیا کہ اس نے کہا کہ آیئے ہر چیز سے انکار کریں اور جو ثابت ہو اسی کو مانیں اس نے کہا کہ ایک شے یقینی ہے۔ یعنی کہ میں ہوں تب یہاں سے وہ آگے چلا اور اس نے کہا کہ میں اس کائنات کے اندر ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتا۔ لہذا اس کا ضرور کوئی خالق ہے۔ اسی کو اقبالؔ نے اس مصرعے میں بیان کیا ہے

ع ہم از خدا خودی طلب ہم از خودی خدا طلب

بعض دانشوروں کو اس مصرعہ کے مفہوم میں تسامح ہو گیا اور خواہ مخواہ اسے کھینچ تان کر ''وحدۃ الوجود'' کے ڈانڈوں سے ملا دیا حالانکہ بات صاف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے معرفت طلب کرو۔ کیونکہ بلا توفیق الٰہی کچھ حاصل نہیں ہو سکتا اور معرفتِ نفس سے معرفتِ الٰہی کے کمالات پیدا کرو۔ اس سے زیادہ واضح حسب ذیل۔

میں از بود نبود خود خموشم
اگر گویم کہ ہستم خود پرستم
ولیکن ایں نوائے سادہ کیست
کسے در سینہ می گوید کہ ہستم

یعنی میں خود اس بات پر چپ ہوں کہ میں ہوں یا نہیں ہوں کیونکہ اگر میں کہتا ہوں کہ میں ہوں تو خود پرست قرار دیا جاؤں گا یہ معتقدین وحدۃ الوجود پر طنز ہے کہ وہ اپنے وجود کو تسلیم کرنے ہی کو خود پرستی قرار دیتے ہیں پھر کہتا ہے لیکن یہ نوائے سادہ کس کی ہے کہ کوئی میرے سینے میں کہتا ہے کہ میں ہوں یعنی وہی ڈے کارٹیکس والی بات یعنی اندر سے ہر شخص کے یہ احساس پکارتا ہے کہ وہ ہے۔ اسلامی عقائد کے مطابق روح احسن تقویم پر تخلیق کی گئی ہے۔ لیکن جب وہ ابتذال کی جانب رجوع ہوتی ہے تو اسفل السافلین کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے تزکیہ و تہذیب کے لئے ایمان اور عملِ صالح کے طریقہ بتلائے گئے ہیں اور عملِ صالح میں رفع فساد قیامِ خیر کے لئے جہاد بھی شامل ہے۔ اسی لئے یہ بھی لازم کیا گیا ہے کہ وہ صفاتِ الٰہیہ پیدا کرنے کی کوشش کرے اور دنیا سے ہر برائی اور خرابی کو دور کرنے کے لئے خود کو نائبِ الٰہی بنائے اور حکومت اللہ قائم کرے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ فرد اور ملت دونوں قانونِ الٰہیہ کے پابند ہو جائیں کیونکہ انسانی عقل اس کی رہنمائی سے قاصر ہے۔

اسلام نے رہبانیت اور ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں دی۔ اسلام کے پیغمبر علیہ السلام نے ہر شخص پر نکاح کو واجب کیا اور قرآن نے جہاں نمازِ جمعہ کے لئے اذان سن کر نماز کے

لئے دوڑنے کا حکم دیا۔ وہیں یہ بھی کہا کہ جب نماز سے فراغت حاصل کرلو تو نجات کے لئے زمین پر پھیل جاؤ۔ لیکن تزکیہ نفس کے قائم رکھنے کے لئے اکلِ حلال اور صدق متعال کی وزنی زنجیریں پیروں میں ڈال دیں اور ہر وقت ذکر اللہ کا شغل قائم رکھ کر قلوب کو متحرک کر دیا۔ اس طرح اسلام نے دنیا اور دین کا ایک معجزہ نما امتزاج پیش کیا۔ اکبر الہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے۔ قطعہ -

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو
رَہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
پر ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اسلام کی اس کھلی ہوئی غیر ابہام پزیر تعلیم کے باوجود اس کا اثر و اقتدار جب دور و دراز ملکوں تک پھیلا تو اس پر عجمی تصورات کی چھائیاں پڑنے لگیں۔ حکومت کے زوال اور طاقت کے انحطاط نے جہاد کا دروازہ بند کر دیا۔ اور فقط اللہ ہو اللہ ہو باقی رہ گیا۔ اسی عجمی تصورات میں ایک مسئلہ وحدۃ الوجود کا تھا جو اسلام میں داخل ہو گیا اور رفتہ رفتہ چھا گیا۔ اب جس کو دیکھو اسی راگ کو الاپ رہا ہے۔ مرزا غالب دنیا کے عظیم شعرا میں تھے لیکن فلسفہ اور تصوف میں ان کا دخل معرض بحث ہے۔ لیکن یہ سیلاب ایسا عام ہو چکا تھا کہ اس کی زد میں وہ بھی آ گئے اور کہا ع

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو منظور تنک ظرفیِ منصور نہیں

میرزا ایک ذہین انسان تھے انہوں نے اتباع عام تو کر دیا لیکن عقل پر زور دیا تو شک میں پڑ گئے۔ فرماتے ہیں۔ قطعہ -

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

اقبال نے اس پھیلے ہوئے عقیدے پر بھرپور وار کرنے کا ارادہ کیا اور سوچ سمجھ کر شاعرانہ شوخی اور بلاغت کے ساتھ ایک لفظ اپنے کل بیان و کلام کا ایجاد کیا جس سے ایوان تصوف میں زلزلہ آ جائے۔ گویا کہ ایک بم تھا جو پھٹا جسے بہروں نے بھی سنا اور سونے والوں نے بھی۔ وہ تھا لفظِ ''خودی''..... خودی کا لفظ عام طور پر غرور اور شخصی امتیاز بالائے

امتیاز کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اقبالؔ کا نہ یہ مطلب تھا اور نہ یہ مطلب لگایا گیا لیکن اس لفظ نے خیالات کی دھارا بدل دی اور جو مفہوم وہ ظاہر کرنا چاہتے تھے اس کے لئے دماغ تیار ہو گئے۔ فلسفہ خودی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن اسے تصوف، ادب اور شاعری کی تاریخ میں مغلق اور غیر عام فہم زبان میں ایسا الجھا دیا گیا ہے کہ اچھے پڑھے لکھے لوگوں کی فہم کی رسائی وہاں تک نہیں ہوتی۔ میں نے اسے عام فہم اور سادہ الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبالؔ کا پیام خالص اسلامی تعلیم ہے۔ 'خودی' کے لفظ کی ایجاد نے ان کلام کو سمجھنے اور اس کے ادبی نصب العین کو واضع کرنے میں بڑی امداد کی ہے۔ وہ کیسی زبردست دلیل دیتا ہے ع

جہاں پیدا و محتاجِ دلیلے　　نمی آید بہ فکرِ جبرئیلے

اور للکارتا ہے۔

وگرازشنکر و منصور کم گوئے

ایک لفظ خودی سے اقبالؔ کے "ادنی نصب العین" کا دور تک پتہ لگتا چلا جاتا ہے، وہ انسان کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور دونوں کے خالق رب السمٰوات والارض کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور تینوں عقائد کو ایک رشتہ میں پروتا ہے اور اس لئے خدا تک پہنچنے کے لئے عالم میں ستیزہ کاری اور اسے نوامسِ الٰہی کے مطابق قیام حق و غارت گری باطل کو لازمۂ حیات قرار دیتا ہے۔ اور اسی سے جہاد فی سبیل اللہ، استقامت بالحق، خلافت و نیابت الٰہیہ کے فرض کی ادائیگی، خود داری..... خود نگاہی، خود گری، خود شکنی الغرض ہزاروں چشمے پھوٹتے ہیں۔ اور وہ سب کا نغمہ خواں ہے مگر اصل ان کی خودی ہے۔ وہ فقر و استغنا، عبادت و ریاضت، زہد و تقویٰ، اشک سحر گاہی سے وضو کو بھی بڑی اہمیت دیتا ہے۔ مگر اقبالؔ کی رائے یہ سب اس وقت قابلِ مدح ہے جب اس کا سلسلہ خودی یعنی معرفتِ نفس سے ملا ہو۔ اور آشکارا ہو انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی اور عالم پر چھا جائے اس کا نمایاں اور کارفرما ہونا، حق اور انسانیت کی جیت اور اس کا چھپ جانا، مغلوب ہو جانا، باطل کے عملی دخل کا کرشمہ ہے۔ خودی یعنی اپنی ہستی سے انکار یا اعماض کے بعد یہ سب قنوطیت باطل پرستی یا باطل سے مغلوبیت ہے۔ اس طرح ایک لفظ خودی نے وہ انقلاب عظیم برپا کر دیا جو فلسفہ کی کئی کتابیں نہ کر سکتی تھیں۔ اور خود آگاہی کو وہ درجہ حاصل ہوا کہ وہ خدا آگاہی کا پیش خیمہ قرار دی گئی۔ مگر وہ خود آگاہی نہیں کہ ہم نہیں ہیں یہ تو خود آگاہی کے منافی ہے بلکہ یہ کہ ہم

ہیں اور ہم کو اپنے آپ کو سنوارنا اور فرمان واجب الاذعان کے مطابق ہمیں فطرت اور کائنات پر تصرف کرنا ہے۔ شعر کی رومانی زبان میں اور کبھی کبھی گستاخانہ الفاظ کے ساتھ وہ اس مقصد کو واضع کرتا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔ محاورہ مابین خدا اور انسان۔ انسان خدا سے کہہ رہا ہے ع

تو شب آفریدی چراغ آفریدم　　سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیاباں وکہسارو زاغ آفریدی　　گلستان وگلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

یعنی اے خدا تو نے رات بنائی تو میں نے چراغ بنایا، تو نے مٹی بنائی اور میں نے ایاغ بنایا، تو نے بیاباں و کہسار و زاغ بنائے اور میں نے گلستان وگلزار و باغ بنائے، میں وہ ہوں جو زہر سے تریاق تیار کرتا ہوں اور میں وہ ہوں کہ پتھر سے آئینہ بناتا ہوں۔ مختصر یہ کہ انسان کا وجود ہے۔ اور حکم الٰہی سے وہ فطرت کی تسخیر کرتا اور اس پر تصرف کرتا ہے۔ میلادِ آدم پر لکھتا ہے کہ ع

نعرہ زدِ عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

یعنی جب انسان کی تخلیق ہوئی تو عشق نے نعرہ مارا کہ اب خونیں جگر پیدا ہو گیا اور حسن کانپ گیا کہ صاحبِ نظر آ گیا۔ مطلب یہ کہ انسان کا خود وجود ہے وہ عشق سے مملو ہے اور حسن شناس یعنی خدا شناس ہے۔ اس طرح انسان اور خدا دونوں کی الگ الگ ہستیاں ہیں اور انسان جب نوامیس الٰہیہ میں ڈوب جاتا ہے تو اسے خدا آگاہی ملتی ہے۔ مسلم کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس میں اپنا مقصد صفائی سے واضع کر دیا ہے ع

ہم نشیں مسلم ہوں میں　　توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہد عادل　　ہوں میں
نبضِ موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے
اور مسلم کے تخیل میں جسارت اس سے ہے
حق نے عالم اس صداقت کے لئے پیدا کیا

اور مجھے اس کی حفاظت کے لئے پیدا کیا
دہر میں غارت گر باطل پرستی میں ہوا
حق تو یہ ہے حافظِ ناموس ، ہستی میں ہوا

زندگی کے بارے میں کہتا ہے ع

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی

یعنی انسان کا وجود قطرہ نہیں ہے کہ دریا میں جا کر گم ہو جائے بلکہ وہ قائم بالذات ہے اور روح انسانی نجات پانے کے بعد برابر ترقی کرتی رہے گی اور یہی ٹھوس اسلامی نظریہ ہے۔ یعنی انسانی روح ابدالاباد تک زندہ و پائیندہ رہ کر ترقی کرتی رہتی ہے اسی کو حافظ نے یوں کہا ہے ع

مانہ دانیم کہ منزل گہہ مقصود کجا است
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

یعنی یہ تو معلوم نہیں کہ ہماری منزل کہاں ہے۔ مطلب یہ کہ درحقیقت کوئی منزل ہے ہی نہیں۔ اور قافلہ کی روانگی کے لئے جرس کی آواز ہر وقت آتی رہتی ہے یعنی روح انسانی برابر اپنے مدارج بلند کرتی جاتی ہے اور چونکہ وہ خدا کبھی نہ بن سکے گی اس لئے ابدالاباد تک ترقی اور سفر کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ مگر اقبالؔ ایک قدم آگے بڑھ جاتا ہے۔

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

یعنی خودی میں تسخیر کائنات کی بھی طاقت ہے جس کا مفصل تذکرہ آگے آئے گا۔ اس سے بھی مثبت طور پر اس کا وجود ثابت ہے۔

خودی کا تجزیہ

اقبالؔ کا فلسفۂ خودی ایک مربوط منظم قانون ہے جس کے اجزائے ترکیبی حسب ذیل قرار دئے جا سکتے ہیں یا جو خود بخود اس سے نمودار ہو سکتے ہیں۔

(۱) روح، انسانی مادہ اور خدا تینوں کا وجود ہے۔ روح و مادہ کا خالق خدا

ہے۔ روحِ انسانی لافانی ہے اور ابدالآباد تک ترقی کرتی جائے گی مگر خدا کبھی نہ بن سکے گی۔ انسان کے اپنے اس اعلیٰ منصب کا نام ''خودی'' ہے۔

(۲) انسان اس کائنات پر تصرف کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ مگر وہ تصرف نوامیسِ الٰہی کے تابع ہونا چاہئے۔ اسی حالت میں وہ اپنے مقصد کو پورا کر سکے گا، اس لئے خودی کا صرف احساس کافی نہیں ہے، اسے آشکارہ ہونا چاہئے۔ اور جب وہ اپنے کمالات وصفات کے ساتھ آشکارا ہوگی تو عالمگیر قوت وشوکت اس کے جلو میں ہوگی۔

(۳) انسان کا پہلا کام اپنے وجود کا اقرار، اس کی حقیقتوں کا فہم، اس کے اختیارات اور پنہائیوں کا ادراک ہے تاکہ وہ امر بالمعروف نہی عن المنکر سے اس دنیا کو رہنے کے قابل اور اپنے فرائضِ خلافت اور نیابتِ الٰہی کو پورا کر سکے۔ اس لیے ستیزہ کاری بوجہ احسن بغیر خودی محکم نہیں ہو سکتی۔

(۴) اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان عقل کا غلام نہ ہو بلکہ عشق کا مطیع ہو یعنی نوامیسِ الٰہیہ کا پابند ہو تاکہ اپنے اندر وہ اعلیٰ صفات پیدا کرے جن کی تفصیل طویل ہے اور جنہیں اقبال نے انتہائی دلکش پیرایوں میں بھی ابہام شاعرانہ کے ساتھ اور بھی صاف صاف بیان کیا ہے۔ اب خودی پہلوؤں پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ قطعات:

تیری خودی سے ہے روشن ترا حریمِ وجود
حیات کیا ہے؟ اسی کا سرور وساز و ثبات
نہیں مقام کی خوگر طبیعت آزاد
ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمے تری سنگ راہ سے پھوٹیں
خودی میں ڈوب کر ضربِ کلیم پیدا کر
ہو اگر خودنگر وخودگرد وخودگیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے
خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی
یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار

اسی مقام سے آدم ہے ظلِ سبحانی
یہ جبر و قہر نہیں ہے یہ عشق و مستی ہے
کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہاں بانی
ترا وجود سراپا تجلی افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تو زر نگار و بے شمشیر

یہ حکمت ملکوتی، یہ علم لا ہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سجود
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
وحدت کی حفاظت نہیں بے قوت بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقل خدا داد
اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد
مسکینی و محرومی و نومیدیٔ جاوید
جن کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد
خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز
یہی ہے سیر کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب وشبانی ہمہ روز
خودی کی موت سے مغرب کا رازداں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جزام
خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی

خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

مندرجہ بالا اشعار سے بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے کہ "خودی" سے اقبال کیا مراد لیتا ہے۔ اور اس کے مدارج ولوازمات کیا ہیں۔

حرم اور فرنگ

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اقبال دو محاذوں پر جنگ کرنے کے لئے میدان میں کودا تھا۔ ایک تو رہبانیت مآب تصوف اور دوسرے مغرب زدگی۔ اور وہ خود ایک مثبت فلسفہء زندگی بھی رکھتا تھا۔ حیات وکائنات کی تشریح کے لئے اس کا نظریہ جامع تھا۔ کیونکہ شاعری کے ذریعہ اس نے اپنا پیغام نشر کرنے کا ارادہ کیا اس لئے ادب میں انقلاب پیدا کرنا ضروری تھا۔ ادب میں الفاظ کی بڑی قیمت ہے۔ وہ اصطلاح بن کر دھیرے دھیرے دل و دماغ پر قبضہ کر لیتے ہیں اور ان سے ہٹنا دشوار ہوتا ہے۔ اقبال نے اس کے لئے ایک نئی لغت ایجاد کی اور وہ ایسی جاذب ہے کہ دل و دماغ پر قبضہ کر لیتی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ آج اقبال اس معرکہ میں اس حد تک کامیاب ہے کہ پرانے دواوین اور ادب پارے اور ان کی مرتبہ اصطلاحیں مع ان معنی کے جو قلب و دماغ پر قبضہ کر چکی تھیں۔ گلدستہ طاق نسیاں ہو چکی ہیں۔ ان نو ایجاد الفاظ میں یہ الفاظ "حرم و فرنگ" ہیں۔ جو اقبال نے خاص اصطلاح اور معنی میں استعمال کئے ہیں۔ حرم سے اقبال کل واثاثہء فکر مراد لیتا ہے جو اسلامی تعلیمات کا پس منظر ہے۔ وہ کبھی کبھی اسے حجاز بھی کہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں الفاظ ایسے دلکش ہیں کہ جو بات ان کے نام پر کہی جائے گی وہ دلوں پر اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی ع

جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کو
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے
زایرین کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زم زم کے سوا کچھ بھی نہیں
ربط و ضبط ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

اقبالؔ نے حرم کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اس لفظ کے زبان پر آتے ہی سارا اسلام سامنے آجاتا ہے ع

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے
ہیں ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق
یہ حکمت ملکوتی یہ علم لا ہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس طرح فرنگ یا مغرب سے وہ پوری تعلیم مراد لیتا ہے جو فلسفہء مغرب کی رہین منت ہیں۔ یہ تعلیمات کچھ زبانی و تحریری ہیں اور کچھ عملی ع

تری حریف ہے یارب سیاست افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تونے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس
ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیش جہاں کا دوام
وائے تمنائے خام وائے تمنائے خام
پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ
ستِ بنیاد بھی ہے آئینہ دیوار بھی ہیں
مغرب میں بہت روشنئ علم و ہنر ہے
سچ یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

وہ قوم کہ فیضان سماوی سے وہ محروم
حد اس کے کمالات کی ہو برق و بخارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خرد مندانِ حکمت کو
ہوس کے پنجہ ء خونی میں تیغ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

کو یہ پوچھے حکیمِ یورپ سے
ہند و یونان ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بے کار وزن تہی آغوش

یاد ایام کہ بودم در چمنستاں فرنگ
جام او روشن تراز جامِ جم واسکندر است
چشم مست مئے فروش بادہ را پرور دگار
بادہ خواراں را نگاہِ ساقی اش پیغمبر است
جلوہ او بے کلیم و شعلہء او بے خلیل
عقل نا پردا متاع عشق را غارت گر است
در ہوا عیش گرمی یک آہ بینا بانہ نیست
اندریں میخانہ را یک لغزشِ مستانہ نیست

اس طرح اقبال نے مغربی تمدن وتہذیب وطرزِ معاشرت پر بھرپور وار کیا اور طرح طرح

سے اس کے نقائص اور اس کی غلطیاں اور غلط کاریاں اور کج فہمیاں واضح کیں۔ اپنے فرزند جاوید کو لندن سے جو خط بھیجا اس میں نصیحت ہے کہ ع

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احسان
سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

اقبالؔ خود فلسفہء قدیم و جدید کا ایک بڑا عالم تھا۔ وہ مغرب کے طرزِ تمدن، طرزِ معاشرت، طرزِ زندگی الغرض کل فلسفہء مغرب کو "فرنگ" کا نام دیتا ہے۔ اس نے اس کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے۔ کتابیں پڑھیں ہیں اور خود سفر کر کے اپنی آنکھوں سے بھی اس کے اثرات دیکھے ہیں۔ اس کو اپنے علم فلسفہ پر ناز ہے چنانچہ وہ فلسفی زدہ سید زادہ کے نام مکتوب میں تعلّی طور پر نہیں اظہار حقیقت کے طور پر کہتا ہے ع

میں اصل کا خاص سومناتی — آبا میرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد — میری کفِ خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ مرے آب و گل میں — پوشیدہ ہے ریگہائے دل میں

اس علم اور واقفیت کی بنا پر وہ مغرب کے فلسفہ حیات کو جسے وہ افرنگ کا نام دیتا ہے ناقص اور لائقِ رد سمجھتا ہے اور مشرق کی تعلیم کو جس کا آخری لفظ اسلام اور اسلامی تعلیمات ہیں۔ نبیؐ برحق اور انسان کو اپنا صحیح مقام حاصل کرنے کے لئے ضروری مانتا ہے۔ لیکن اس کی فریاد یہ ہے کہ مشرق یعنی اسلام خانقاہوں اور ترکِ خودی میں جا کر گم ہو گیا ہے اور مغرب اپنی تمام خام کاریوں اور باطل پرستیوں کے ساتھ عالم کو مسخر کئے ہوئے ہے۔ اور اسی انقلاب کے لئے اس کا کلام وقف ہے وہ کہتا ہے۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں کمیاب ہے صہبا

مکتب

اقبالؔ کی ایک اور اصطلاح ہے مکتب۔ اس سے بھی اس نے ادب میں انقلاب پیدا کیا اور اپنے کلام کے ادبی نصب العین کو مزین کیا۔

مکتب سے اس کی مراد عملی اور روحانی دونوں قسم کی تعلیم گاہیں ہیں اور دونوں قسم کے مراکز ہیں۔ وہ اس زوال کا مرثیہ خواں ہے جو علم دین اور تصوف دونوں میں آ گیا ہے۔ وہ اپنا پیغامِ قلندری دونوں کو سناتا ہے۔ اور اس کے رموز و نکات کو اجاگر کرتا ہے۔ مکتب جیسے جامع الفاظ سے اقبالؔ نے ادنیٰ نصب العین میں تغیر پیدا کرنے میں بڑا کام لیا ہے اور ذہن و مزاج کو صحیح تربیت دی ہے ع

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا

قطعہ

اقبالؔ یہاں نام نہ لے علم خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقالات
مکتب و میکدہ جز درس نہ بودن نہ ہند
بودن آموز کہ ہم باشئی و ہم خواہد بود

پروانہ اور جگنو

اقبالؔ نے اپنا پیغامِ جہاد و عشق دلوں میں اتارنے کے لئے تمام پرانی اصطلاحیں بدل دیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہمیت پروانہ کو حاصل ہے۔ کہا گیا ہے کہ قطعہ۔

در شعر کس پیمبرانند - ہر چند کی لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را - فردوسی و انوری و سعدی

علامہ شبلی نے انوری کی نبوت ج پر کوئی معجزہ نہ ہونے کی وجہ سے اسے رد کر دیا۔ مگر منکرِ سعدی آج تک پیدا نہ ہوا۔ شیخ شیرازی فرماتے ہیں ع

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز کاں سوختہ را جاں شدہ آواز نیامد

پروانہ کی عظمت صدیوں سے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ گلستانِ سعدی کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ محتاج بیان نہیں۔ اور یہی حال ہر شاعر و ادیب کا رہا ہے۔ کون ہے جو پروانہ کی مدح میں رطب الاسان نہیں ہے۔ اسی طرح ہر گھر میں "پروانہ" عاشقِ خود سوز کی حیثیت سے ایک بلند مقام پر فائز رہا ہے۔ مگر اقبال علمِ جہاد لے کر اس وقت میدان میں اترا جب ایک طرف شمعِ مغرب کی طرف طواف ہو رہا ہے اور دوسری طرف شنکراچاریہ کی رہبانیت کارفرما ہے۔ اقبال جو نورِ خودی کی تعلیم دیتا ہے اس کا پیغام یہ ہے کہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔ اسے کسی دریوزہ گری کی ضرورت نہیں۔ اس نے تشبیہ بدل دی۔ پروانہ کو "دریوزہ گر آتشِ بیگانہ" قرار دیا اور کل تک جو شہید اعظم تھا اس کی لاش بے گور و کفن پڑی ہے کوئی کندھا دینے والا نہیں۔ اور جگنو کے اندر کیونکہ خود روشنی ہے۔ اس لئے جگنو کا مرتبہ اونچا ہے۔ ان استعاروں نے اقبال کے فلسفہ خودی کو جامعیت عطا کی اور اسے مسلسل اور مدون قرار دیا۔ اسی طرح وہ ہر اس چیز کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو دوسرے سے اکتساب کرے۔ چنانچہ چاند کو بھی کیونکہ سورج روشنی دیتا ہے اس لئے اقبال کی نگاہ میں وہ قابلِ عزت نہیں۔ چاند کے حسن و زیبائی پر تمام دنیا کے ادب میں کتنا لکھا گیا ہے۔ لیکن یہ اقبال ہی تھا جس نے چاند کے اس نقص کو واضع کیا۔ اس کا تو ایک موضوع ہی ایک مضمون ہے اور اسی کے لئے اس پر وہ اپنی پوری قوت صرف کرتا ہے۔ چنانچہ چاند کو مخاطب کر کے جو نظم لکھی ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ع

آہ میں جلتا ہوں سوزِ اشتیاق دید سے
گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں سراپا نور
تو سینکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو
تو سراپا سوز داغِ منت خورشید سے
جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے

ملاحظہ کیجئے کہ کن پرشکوہ الفاظ میں وہ جگنو کی تعریف کرتا ہے۔

وہ جگنو جواب تک ناقابلِ توجہ تھا ع

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یاں نمایاں سورج کے پیرہن کا

اور پھر پروانہ اور جگنو کا مقابلہ کر کے اپنا مقصد واضع کرتا ہے ع

پروانہ ایک پتنگا، جگنو بھی اک پتنگا

وہ روشنی کا طالب، وہ روشنی سراپا

دوسری جگہ جگنو کی آواز سے کہلوایا ہے کہ ع

لباسِ نور میں مستور ہوں میں پتنگوں کے جہاں کا طور ہوں میں

اور پھر کہتا ہے ع

اللہ کا لاکھ شکر کہ پروانہ نہیں میں دریوزہ گرِ آتشِ بیگانہ نہیں میں

اور پھر پیغام دیتا ہے ع

کر مکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

اسی طرح تہذیبِ حاضر کے عنوان سے اس کی چمک دمک بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے ع

فروغ شمع نور سے بزمِ مسلم جگمگا اٹھی
مگر کہتی ہے پروانوں سے میری کہنہ ادرا کی
تو اے پروانہ! این گرمی ز شمعِ محفلے داری
چو من در آتشِ خود سوز اگر سوزِ دلِ داری

بلبل اور شاہین

پرندوں میں سب سے زیادہ مقبول بلبل ہے۔ ادب و شعر میں بلبل کا مقام قابلِ رشک ہے۔ بلبل گل پر عاشق ہے اور نغمہ خوانی و نوحہ و فغاں اس کا شعار ہے۔ محمد حسین آزاد

لکھتے ہیں کہ انہوں نے خود بلبل کو ایران میں تمام شب غزل پڑھتے سنا ہے اور وہ قافیہ پر تان ہر شعر کی توڑتا ہے۔ بلبل کا ترنم اور اس کا عشق تب و تاب زندگی اور اصل محبت کے اظہار کے لئے بہترین تمثیل ہے۔ مگر اقبالؔ نے نارِ خودی اور نورِ خودی کے ظہور کے لئے جو ادنیٰ نصب العین مقرر کیا تھا اس کے لئے بلبل کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ بلبل میں ایک فرسودہ رگِ صبر ہے۔ اس میں مثبت فعل کوئی نہیں اور نہ اس کے سامنے بجز نغمہ خوانی کوئی عمل ہے۔ وہ گلشن اور آشیانہ تلاش کرتا ہے اور شب و روز محبت گل میں نغمہ خواں ہے۔ اقبالؔ کے مطمع نظر یہ صفاتِ محمود نہیں یا اس کے فلسفہ جہاد کے فریم میں نہیں موزوں ہوتی ہیں۔ وہ کچھ اور چیز چاہتا ہے جس کے لئے شاہین کا انتخاب کیا۔ شاہین صحرا نورد ہے وہ آشیانہ نہیں بناتا یعنی اس کا مسلک فقر و غیور ہے۔ پرندوں میں سب سے زیادہ تیز پرواز ہے۔ خود شکار کرتا ہے اور وہی کھاتا ہے۔ دوسرے کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا اور نہ مردہ شکار کھاتا ہے۔ صحرا اور دریا اس کے بال و پر کے نیچے ہیں۔ خود اپنی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ آزاد ہے اور قوت و شوکت رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ ایک نظم "ماہی و شاہین" کے عنوان سے لکھتا ہے۔ اس میں ماہی بچہ و شاہین بچہ کا ایک مکالمہ ہے۔ ماہی بچہ کہتا ہے کہ اس دریا میں بڑے بڑے خوفناک مگرمچھ ہیں مگر کیا کروں اس سے باہر نکلنا ممکن نہیں کیونکہ دریا کی لہریں ع

بیروں نہ تواں رفت ز موجِ ہمہ گیرش
بالائے سر ماست تہہِ پاست ہمہ جاست

یعنی اس کی ہمہ گیر موجوں سے باہر نکلنا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ہمارے سر پر ہمارے پیر کے نیچے ہر جگہ موجود ہیں۔ اتنا کہہ کر ماہی بچہ کا چہرہ سوزِ سخن سے سرخ ہو گیا۔ شاہین بچہ ہنسا اور ساحل سے ہوا میں اڑ گیا۔ اور وہاں سے چلایا کہ یا میں شاہین ہوں۔ دریا ہو کہ صحرا میرے بال و پر کے نیچے ہیں۔ اس مکالمہ کے بعد اقبالؔ پیغام دیتا ہے۔ ع

بگذر ز سرآب و پنہائے ہوا ساز ایں نکتہ نہ بیند مگر آں دیدہ کہ بیناست

یعنی پانی کی لہروں سے نکلو اور ہوا میں پرواز کرو۔ اس نکتہ کو کوئی نہیں دیکھتا سوائے اس کے جس کو دیدۂ بینا نصیب ہوئی ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے تصادم فرائض کا منظر دیکھا ہے جو عصر حاضر کی تہذیب کے بندھنوں کو توڑ کر آزادی کی فضا میں سانس لینا چاہتے تھے اور اس کے لئے کوشش بھی کی ہے مگر آخر کار ماہی بچہ کی طرح اسی وکالت اسی ملازمت اور اسی آہن نو کی زنجیر میں پھر واپس آ گئے ہیں اور نکل نہیں پاتے۔ جب ۱۹۲۰ء

میں تحریکِ خلافت کا ظہور ہوا اور کثرت سے نوجوان گریجیوٹوں نے تعلیم گاہوں کا بائی کاٹ کیا تو علی گڈھ اس کارواں کا سالار تھا۔ بہت سے میدان میں نکلے مگر کتنے ثابت قدم رہے۔ اقبالؔ نے علی گڈھ کے طلبہ کو ایک پیغام دیا ہے ع

عرب از سرشک خونم ہمہ لالہ زار بادا
عجم رسیدہ بور انفسم بہار بادا
تو جوانِ خام سوزے ختم تمام سوزے
غزلے کی می سرایم بہ تو سازگار بادا

میں اکثر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے کہا کرتا تھا کہ ہم سب خام سوزوں میں صرف ایک آپ تمام سوز نکلے۔ میرے ایک دوست محمد بہاری بی۔ اے۔ آنرز تھے۔ وہ مجھے ۱۹۲۴ء میں دلی میں ملے اور یہ سن کر بہت مغموم ہوئے کہ میں وکالت پڑھنے جا رہا ہوں۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں دس روپیہ میں ایک خوانچہ خرید لوں اور گلے میں لٹکا کر بیچوں۔ عرصے تک یہ محترم رفیق کانپور میں چمڑے کی تجارت کے چکر میں رہے اور آخر کار ہم ماہی بچوں کی محفل میں شریک ہو گئے۔ کتنی حقیقت ہے کلام اقبالؔ میں۔ میں کس طرح کل باتیں ایک مضمون میں سمو دوں۔ ہم لوگوں نے اقبالؔ کو پڑھا اس کو سمجھنے کی کوشش کی۔ میں تو ایک عرصہ تک ان کی صحبت میں بیٹھا اور ان کی زبان سے ان کے کلام کی شرح سنی۔ مگر موجودہ تمدن کے بحرِ ناپیدا کنار کی موجوں نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہم کلامِ اقبالؔ کی روح پر عمل نہ کر سکے اور خود اقبالؔ نے اس کی پیشین گوئی کر دی تھی ع

عصرِ من دانندۂ اسرار نیست
یوسفِ من بجز ایں بازار نیست
اے بسا شاعر کی بعد از مرگ زاد
سرِ مرگ درندگی برما کشاد

اور ع طورِ من سوزد کہ می آئید کلیم

لیکن بلبل کا ترنم اور ماہی بچہ کا سوزِ سخن ختم ہونے کو ہے۔ شاہین بچہ عالمِ وجود میں آنے والا ہے۔

دلیلِ صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی

اب آیئے پھر ایک بار شاہین کی اصطلاح کی طرف ایک لمحہ کے لئے واپس ہوں اور کلامِ اقبال سے اس کا مفہوم واضح کریں۔ جاوید کو نصیحت کرتے ہوئے اقبال نغمہ خواں ہے ع

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا اللہ کی شانِ بے نیازی
کنجشک و عام کے لئے موت ہے اس کا مقام شاہ بازی

اس کے بادمختلف جگہوں پر اور طرح طرح شاہین کی تمثیل سے جو حقائق رونما ہوتے ہیں انہیں واضع کیا ہے۔ حسب ذیل اشعار سے ان کا پتہ خود بخود چل جائے گا ع

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا پتہ کہ کیا ہے رہ و رسم و شاہ بازی
خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی تو بے لذتِ نیاز نہیں
نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے
شکار مردہ سر ادا شاہ باز نہیں
فقیرانِ حرم کے ہاتھ اقبال آگیا کیونکر
میسر میر و سلطاں کو نہیں شاہین کا فوری
ہے یاد مجھے نکتہ ء سلمان خوش آہنگ
دنیا نہیں مردان جفا کش کے لئے تنگ
چیتے کا جگر چاہیئے شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنی دانش افرنگ
کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

قطعہ

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے ترے پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری تری آنکھوں میں بے باکی نہیں ہے

قطعہ

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو　　فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور　　کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو

قطعہ

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذان اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

گل ولالہ

ایک عجیب وغریب اصطلاح ''لالہ'' ہے۔ لالہ کا پھول صحرا میں کھلتا ہے اور خودرو ہوتا ہے۔ اس لئے منت کشِ باغباں نہیں ہوتا۔ اقبالؔ جو تہذیب حاضر کی ظاہری چمک سے مرعوب نہیں ہے۔ بلکہ اسے دل کے لئے موت تصور کرتا ہے اور سادگی وخودداری، فقر و آزادی کو ضمیر انسانی کا جوہر بنانے کا خواہشمند ہے۔ شعرائے قدیم کے ترانہء مدح گل کا ہم سخن کیسے ہوسکتا تھا۔ وہ جو تعلیم دینا چاہتا ہے وہ ''گل'' کی تمثیل کے بالکل خلاف ہے۔ پھول باغ میں مسکراتا ہے، ہنستا ہے اور پھر مرجھا جاتا ہے۔ اسے نہ آزادئ صحرا میسر ہے نہ میدان کی پنہائیاں، نہ آزادی اور نہ خودداری۔ اسے توڑ کر لوگ اپنے لباس اور میز کے گلدستوں کی زینت بناتے ہیں۔ چنانچہ گل کے بارے میں ایک جگہ لکھتا ہے ع

نہیں یہ شانِ خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیبِ گلو کر لے

اپنی اصلیت پر قائم رہنا اور اسی پر مرنا اور مٹنا حاصلِ حیات ہے۔ اسی لئے پورے اسلام کو بھی ایک لفظ ''لالہ'' کی تشبیہ سے ظاہر کرتا ہے۔

اس طرح گل وبلبل کی کہانی جو صدیوں سے چلی آرہی تھی۔ اقبالؔ کے ہاتھوں دفن ہوئی اور اس کی جگہ ''شاہین اور لالہ'' نے لے لی اور اس طرح اس نے ادبی نصب العین کو مکمل کیا اور اپنا پیام دلوں کی گہرائیوں میں اتار دیا۔

ساحل اور موج

عام طور پر تمام دواوین میں موج سے مراد مصیبت اور بلا ہے اور اس سے پرہیز لازم ہے۔ ساحل منزلِ مقصود ہے اور آرام اور اطمینان کا مقام ہے مگر مجاہد اقبالؔ کی نگاہ میں ایسا نہیں ہے۔ وہ موج اور دریا کو سائل پر ترجیح دیتا ہے۔ کیونکہ اس کا فلسفہ عمل ہے اور موج میں حرکت ہے۔ جبکہ ساحل سکون پزیر ہے۔ ایک مثال اسے واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ ع

ساحل افتادہ گفت — من کہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد — آہ کہ من کیستم
موج خودز رفتہء — تیز فراعیدہ گفت
ہستم اگرمی روم — گر نہ روم میستم

موتی اور شبنم

شبنم ایک قطرۂ آب اور حقیر ہے اور چمک دار موتی لائق تعریف ہے مگر موتی پانی کی بدلی ہوئی اصلیت کا دوسرا نام ہے۔ ابر نیساں کا قطرہ جب صدف میں جاتا ہے تو وہ درخشندہ موتی بن جاتا ہے اور آج تک سب لوگ اسی تب وتاب کے قصیدہ خواں تھے۔ مگر اقبالؔ اسے اپنی فطرت سے تغیر کی بنا پر لائق اعتنائے نہیں سمجھتا اور شبنم کا مداح ہے کہ وہ اپنی خودی پر قائم اور اپنی گوہر ذات کی نگراں ہے۔ چنانچہ ایک عجیب نظم میں شبنم کی زبان سے کہتا ہے کہ مجھ سے کہا گیا کہ آسمان سے نیچے اترو اور سمندر میں جا کر موتی بن جاؤ لیکن میں نے اس لئے انکار کر دیا کہ میری اصلیت بدل جائے گی۔ چنانچہ میں ایک بوند پانی ہی رہی اور ''لالہ'' پر آ کر ٹپکی۔ میں اس شراب کو چکھنا نہیں چاہتی جس سے میں اپنے آپ سے منحرف ہو جاؤں۔

گفتند فرود آئے زواج مہ و پرویز
برخود زن و با بحر بر آشوب در آویز

یا موج در انگیز
تا بندہ گہر خیز
من عیش ہم آغوشیِ دریا نہ کشیدم
آں بادہ کہ آں خویش رباید نہ چشیدم
از خود نہ امیدم
ز آفاق بریدم
بر لالہ چکیدم

مجموعوں کے نام

اقبالؔ کے ''ادبی نصب العین'' کا اندازہ ان ناموں سے بھی لگے گا جو اس نے اپنے مجموعوں کے رکھے ہیں۔ ''بانگ درا''، ''بالِ جبریل''، ''ضربِ کلیم''، ''ارمغانِ حجاز''، ''پیامِ مشرق''، ''خضرِ راہ'' وغیرہ وغیرہ

خاتمۂ کلام

ابھی اور بہت سے محاورات باقی ہیں۔ کتنی اور اصطلاحیں رہ گئیں جن کا ذکر نہیں آیا۔ نقش اول ہے۔ ممکن ہے زمانہ فرصت دے تو بہتر کشد اوّل نقاشِ نقشِ ثانی کوئی اس سے بہتر چیز پیش کر سکوں۔ پھر بھی مندرجہ بالا مثالوں سے اقبالؔ کے ''ادبی نصب العین'' کا ایک دھندلا سا خاکہ سامعین کے ذہن میں ضرور آجائے گا اور اس سے بھی یہ واضح ہو جائے گا کہ حافظ پر اقبالؔ نے کس زاویۂ نگاہ سے اعتراض کیا تھا۔ حافظ کا اقبالؔ معتقد نہ ہو مگر حافظ کے اشعار کو جا بجا نقل کیا گیا ہے۔ اس سے بھی اس کا یہی ثبوت ملتا ہے جو میں نے اوپر شروع میں عرض کیا کہ اقبالؔ کا منشاء ان اشعار سے کیا تھا جو اس نے حذف کر دیئے۔

اقبالؔ نہ تصوف کا مخالف تھا نہ کشف و کرامت کا۔ وہ ایک مصلح تھا اور دین میں جو فساد کسی طرف سے آگیا تھا اسے مٹانا چاہتا تھا۔ اس کا ہر اعتراض تعمیری ہے کہیں بھی تخریبی نہیں۔ وہ مجدد الف ثانیؒ اور دوسرے اولیائے کرام کا بڑا معترف و معتقد اور بڑے وثوق سے کہتا تھا۔

ولایت پادشائی علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

اقبالؔ کا ''ادنی نصب العین'' اس طرح الفاظ و معنی و اصطلاحات میں وہ عظیم انقلاب ہے جس کے ذریعے وہ ذہنوں میں انقلاب پیدا کرنا چاہتا تھا۔

اقبال اور اسلام

سرورِ رفتہ باز آید کہ ناید　　نسیمِ از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگارے ایں فقیرے　　وگر دانائے راز آید کہ ناید

تحریکِ خلافت زوروں پر تھی۔ حکومت سے مکمل بائکاٹ کا اعلان کیا جاچکا تھا۔ خطابات واپس کردو۔ اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم ترک کرو۔ کچہریوں میں مقدمات نہ لے جاؤ۔ کسی ادارے کے لئے سرکاری امداد نہ لو۔ الغرض کہ انگریز کی حکومت کے وجود سے انکار کرو اور جو تکلیف آئے اسے برداشت کرو اور عدم تشدد پر عمل پیرا رہو۔ یہ تھا مہاتما گاندھی کا پیغام، کانگریس کا فیصلہ اور علماء دین کا متفقہ فتویٰ۔ اس لائحہ عمل کا نام عرف عام میں 'ترک موالات' تھا اور اس کی بنیاد ''استقامت بالحق'' کہی جاتی تھی۔ سارا ہندوستان نعروں سے گونج رہا تھا۔ اور جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ جو لوگ اس تحریک کا ساتھ نہیں دیتے تھے۔ ان میں سے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ پبلک میں منظرِ عام پر آکر کچھ بول سکیں۔ وہ خود اپنی نظروں سے گر گئے تھے۔ عمل درامد کا یہ حال تھا کہ جو لوگ گرفتار ہوتے تھے اور جن پر کچہریوں میں مقدمے چلائے جاتے تھے وہ اپنا بیان دینا یا اپنا نام تک بتلانا گناہ تصور کرتے تھے اور ملزم کے کٹہرے میں کھڑے ہوکر یوں پکارتے تھے۔ ''عدالت کو جس کے سامنے میں کھڑا ہوں معلوم ہونا چاہئے کہ میں آپ کے اختیار کو تسلیم نہیں کرتا اور کسی بیان دینے سے انکار کرتا ہوں۔''

میں یونیورسٹی اسکول آف الہ آباد میں پڑھ رہا تھا کہ ترک موالات کا اعلان ہوا میں وہاں سے کالج چھوڑ کر نکل آیا۔ کچھ دن مولانا حسرت موہانی کے ساتھ کانپور میں رہنے کے بعد اخبار ''مدینہ'' بجنور میں نائب مدیر کی حیثیت سے کام کیا اور غالباً ۱۹۲۲ء میں اخبار ''زمیندار'' لاہور کا مدیر خصوصی مقرر ہوا۔ مولانا غلام رسول مہر نے بھی شاید اعلان ترکِ موالات سے قبل ہی بی۔ اے۔ پاس کیا تھا اور وہ میرے ساتھ معاون مدیر تھے اور مرتضیٰ حسین میکش بھی ادارے کے ایک رکن تھے۔ حفیظ جالندھری اس وقت دفتر میں کام کرتے تھے۔ اس زمانے کے جوش و عمل کی انتہا پسندی کے دو واقعات ذیل میں درج کئے جاتے

ہیں۔ اسی زمانے میں بٹالہ میں کانگریس کی جانب سے ایک کانفرنس ہوئی جس میں سردار ولبھ بھائی پٹیل بھی تشریف لائے میں خود ''زمیندار'' کے نمائندے کی حیثیت سے اس کانفرنس میں شریک تھا۔ میں نے سردار پٹیل سے انٹریو بھی لیا تھا۔ ایک کپتان پولیس نے اخبار ''زمیندار'' عدالت سول ججی میں پچاس ہزار روپیہ کا دعویٰ ازالہ حیثیت عرفی کے تحت کیا تھا اور سوال یہ تھا کہ مقدمہ لڑا جائے یا نہ لڑا جائے۔ گاندھی جی گرفتار ہو گئے تھے۔ اور پنڈت مدن موہن مالویہ جی سارے ہندوستان کا دورہ کر کے تحریک ترکِ موالات کو نئی شکل دے رہے تھے۔ اور یہ بتلانے میں مصروف تھے کہ کچہریوں، عدالتوں، تعلیمی درس گاہوں کا بائکاٹ ترکِ موالات میں شامل نہیں ہے۔ وہ تحریک ترکِ موالات سے انکار نہیں کرتے تھے مگر وہ اس کی جدید تشریح کرتے تھے اور ایک جداگانہ فلسفہ بیان کرتے تھے۔ اخبار ''زمیندار'' شدت سے ان کی رد میں لگا ہوا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ جس دن میرا اداریہ ''ممدوح الطرفین پنڈت مالوی'' شایع ہوا اسی دن صفحہ اول پر اقبال کا حسب ذیل قطعہ بھی چھپ گیا ع

کتنی خدمت کی ہے خلق اللہ کی — دیکھئے ہوتے ہیں کب سر مالوی
مسلمِ ناداں کو کیا معلوم ہے — کس خدا کے ہیں پیمبر مالوی
خوب تھا یہ خالصہ جی کا بچن — کب ہے گاندھی کے برابر مالوی
مردِ میداں گاندھی درویش — اور کونسل کے اسپیکر مالوی

لیکن مالوی جی کی خدمات اور ان کے خلوص و عظمت کا اتنا احترام تھا کہ نچتہ سے نچتہ کانگریسی اخبارات حتیٰ کہ ''بندے ماترم'' لاہور بھی ہماری مخالفت کرتا تھا۔ پنڈت مالوی جی بھی بٹالہ آئے تھے۔ اور میرا ارادہ دونوں سے انٹریو کر کے دونوں کے بیانات کو شایع کرنا تھا۔ افسوس ہے کہ میری یہ آرزو پوری نہیں ہوئی۔ کیونکہ مالوی جی نے انٹریو میں ایک لمبا بیان کئی صفحات کا لکھانے کے بعد اسے نظر ثانی کے لئے واپس لے لیا اور پھر وہ مجھے نہیں ملا۔ غالباً وہ ان کی بے پناہ مشغولیتوں کی نذر ہو گیا۔ یہ وہی بٹالہ کانفرنس ہے جہاں سے واپسی کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک عالیشان مسجد بن کر تیار ہے۔ جس پر کتبے بھی لکھے گئے ہیں اور یہی وہ مسجد ہے جس کے لئے علامہ اقبال نے فرمایا ہے ع

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

میں نے سردار پٹیل سے انٹرویو کے دوران جب یہ کہہ کر سوال کیا کہ پنڈت مالوی ایسا ایسا کہتے ہیں۔ ان سب کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ نام نکال کر اصولی سوال کیجئے۔ اور نام نکالنے پر انہوں نے پنڈت مالوی کے خیالات کی بھرپور تردید کی۔ اور بعدہٗ جب میں نے کپتان پولیس کے مقدمہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ ''مسٹر زمیندار'' ''جب آپ مالوی پر اس طرح اعتراض کرتے ہیں تو آپ مقدمے میں جواب دہی نہیں کر سکتے۔'' اس سوال کی ضرورت اس لئے پیدا ہوئی تھی کہ ہم لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اخبارات کو ترکِ موالات کے تحت اس کے ہمہ گیر ضوابط سے مستثنیٰ ہونا چاہئے۔ اس وقت کی پچاس ہزار روپیہ کی زرِ خطیر کو اپنے سر اس حالت میں لاد لینا خلافِ مصلحت نظر آیا تھا۔ خصوصاً جبکہ حکومت اخبار بند کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ تقریباً ہر ہفتے ہمارے دفتر کی تلاشی ہوتی تھی۔ ہر آدمی پر سی. آئی. ڈی. مقرر تھا۔ پرچے ضبط کئے جاتے تھے۔ اور پریس ایکٹ کے ماتحت دس دس ہزار کی ضمانتیں طلب ہوتی تھیں۔ لیکن پٹیل جی کے حکم کے بعد ہوا یہی کہ مقدمہ میں جواب دہی نہیں کی گئی۔ اور پچاس ہزار روپیہ کی مع خرچہ مقدمہ ڈگری ہوگئی جو روزنامہ زمیندار کو ادا کرنی پڑی۔

دوسرا واقعہ اسی دوران کا یہ ہے کہ انجمن حمایت اسلام لاہور کا سالانہ جلسہ ہوا۔ انجمن حمایت اسلام لاہور، ہندوستان کی ایک مشہور ترین انجمن تھی۔ اس کی سرپرستی میں ایک عالیشان عربی مدرسہ، ایک وسیع یتیم خانہ، ایک ہائی اسکول، ایک انٹر کالج اور ایک اسلامیہ ڈگری کالج تھا۔ اس کا ایک شعبہ نشر و اشاعت بھی تھا جہاں کتابیں لکھی اور چھاپی جاتی تھیں۔ وہاں کی کتابیں اب بھی یہاں کے مکاتبِ اسلامیہ کے نصاب میں داخل ہیں اور بڑی کارآمد ہیں۔ انجمن حمایت اسلام نے اپنے تمام اداروں کے لئے حکومت کی امداد بند نہیں کی تھی اور اس لئے اس کا بائیکاٹ تھا۔ چونکہ انجمن مذکور کے کارناموں سے میں بہت متاثر تھا۔ اس لئے میں خود بطور نمائندہ زمیندار، رپورٹنگ کے لئے اس میں شریک ہوتا تھا۔ اس جلسہ کی صدارت مولانا محمد علی ایم.اے. مفسر قرآن قادیانی صاحب نے کی اور دوسرے جلسہ کی صدارت جب میں موجود نہیں تھا اور ایک دن کے لئے کہیں چلا گیا تھا مولانا محمد علی صاحبؒ شیرانوالہ دروازہ لاہور نے کی۔ مولاناؒ، مولانا عبید اللہ صاحب سندھیؒ کے شاگرد تھے اور قرآن کی تعلیم دیتے تھے اور خود کما کر یعنی کبھی صابن بنا کر کبھی کتابت کی تصحیح کر کے اپنی گزر اوقات کرتے تھے۔ وہ جمعرات کا پورا دن اور جمعہ کی نماز تک

آدھا دن کمانے میں صرف کرتے تھے اور جو مل جاتا تھا اس سے ایک ہفتہ گزارہ کرتے تھے۔ یکہ والوں، تانگہ والوں اور جہلا کو ناظرہ قرآن اور بی.اے. اور ایم.اے. کو قرآن شرح اور علماء فارغ التحصیل کو ترتیب آیات پڑھانے میں ان کا پورا وقت صرف ہوتا تھا۔ ہر روز صبح بعد نماز فجر قرآن پاک کی تفسیر بیاں کرتے تھے۔ ۲ر شوال کو الحمد اللہ سے شروع کرتے تھے اور ۲۹ر رمضان کو والناس پر ختم کر دیتے تھے۔ یعنی اگر کوئی شخص پورے سال بلا ناغہ بعد نماز فجر ان کے وعظ میں شریک ہو تو پورا قرآن معنی و مطلب و شرح کے ساتھ سن لے۔ حق گوئی اور بے باکی کا یہ عالم تھا کہ برابر جلسہ میں سی.آئی.ڈی. والے موجود رہتے تھے اور تقریر نوٹ کرتے تھے۔ مگر مولانا پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ موقع آنے پر انتہائی جرآت کے ساتھ انگریز اور انگریز کی حکومت کے خلاف بیان کرتے تھے اور ایسا بیان کہ دل گرم ہو جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے درویش صفت عالم باعمل کی شہر میں کتنی عزت ہوگی۔ لیکن کبھی بھی پچاس ساٹھ آدمیوں سے زیادہ جلسے میں نہیں آئے۔ مولانا نے صدارت کی تب بھی معلوم ہوا کہ یہی حال رہا۔ بلکہ میکش نے ''زمیندار'' کے مزاحیہ کالم میں مولانا کی شان میں نازیبا الفاظ بھی لکھ دئے۔ لکھا کہ معلوم ہونا چاہئے کہ مولانا احمد علی صاحب جنہوں نے انجمن حمایت اسلام کے جلسہ کی صدارت کی ہے کون ہیں۔ وہی مہاجر الی الکابل ثم الی الاہور۔ مولانا میرے استاد بھی تھے۔ میں ان سے ''ترتیب آیاتِ قرآنی'' صف علماء میں باوجود فہم عربی کے قاصر ہونے کے پڑھتا تھا اور میرے بزرگ بھی تھے۔ میں نے زبانی اور تحریری بذریعہ اشاعت اخبار معافی مانگی۔ واقعہ یہ تھا کہ مولاناؒ کابل سے جبراً ہندوستان بحکم مولانا عبید اللہ سندھی تعلیم قرآن کی اشاعت کے لئے واپس کئے گئے تھے اور بادل ناخواستہ محض بہ تعمیل ارشاد واپس آئے تھے۔ جیسا کہ ظفر حسن بیگ کی آپ بیتی سے بخوبی ظاہر ہے۔ ظفر حسن ایبک ان تقریباً ایک درجن طالب علموں میں تھے جو ۱۹۱۵ء میں لاہور کالج چھوڑ کر بغرض جہاد ہجرت اختیار کئے ہوئے تھے۔ ایبک اور مولانا عبداللہ سندھی کا شب و روز کا ساتھ رہا۔ اور نہوں نے آپ بیتی میں افغانستان، روس اور ترکی کے سفر کے حالات بڑی وضاحت سے قلمبند کئے ہیں۔ مگر یہ سب تو جملہ معترضہ تھا۔ میری غرض تو اس جوش و جنون کو ظاہر کرنا ہے جو تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کے زمانہ میں کارفرما تھا۔

سر ذوالفقار علی خاں بیرسٹر انجمن حمایت اسلام کے ان دنوں سکریٹری تھے یہ وہی سر ذوالفقار علی خاں ہیں جن کا تذکرہ اقبال کے حسب ذیل اشعار میں آیا ہے۔

کیسے پتہ کی بات جگندر نے کل کہی — موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش
ہنگامہ آفریں نہیں اس کا خرامِ ناز — مانند برق تیز مثالِ ہوا خموش
میں نے کہا نہیں ہے یہ موٹر پہ منحصر — ہے جادۂ حیات میں ہر تیز پا خموش

سر ذوالفقار علی خاں نے علامہ اقبال پر انگریزی میں ایک کتاب بھی شروع زمانے میں لکھی تھی۔ سر ذوالفقار علی کو محسوس ہوا کہ انجمن اب چل نہیں سکتی ہے۔ کیونکہ سالانہ جلسہ ہی میں اس کا چندہ ہوا کرتا تھا۔ اور اب جلسوں میں کوئی شریک ہی نہیں ہو رہا تھا۔ چنانچہ وہ علامہ اقبال سے ملے اور ان سے کہا کہ انجمن ٹوٹ رہی ہے اور یہ قوم کا بڑا خسارہ ہے اور یہ درخواست کی کہ اپنی کوئی تازہ نظم پڑھیں اور اس کا اعلان کیا جائے۔ اقبال راضی ہو گئے اور سر ذوالفقار علی خاں نے اس کو شہرت دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا کہ علامہ اپنی ایک تازہ نظم سنائیں گے۔ بدقسمتی کہ جس شام کو یہ جلسہ ہوا مجھے سخت بخار آ گیا اور میں اس میں شریک نہ ہو سکا مگر مہر و میکش وغیرہ گئے تھے۔ ان لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ کوئی پچاس ہزار کا مجمع تھا اور صوبہ خلافت کمیٹی، ضلع خلافت کمیٹی، صوبہ کانگریس کمیٹی اور ضلع کانگریس کمیٹی کے تقریباً جملہ اراکین و عہدہ داران آئے تھے لوگ ترکِ موالات اور اس کا لائحہ عمل اور بائیکاٹ وغیرہ سب بھول گئے اور حیرت پر حیرت یہ کہ بعد کو بھی کسی نے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اقبال کے کلام کو تمام احکام اور فتاوٰں سے مستثنٰی کر دیا گیا ہو۔ علامہ اقبال کو عرق النساء کا عارضہ تھا اور انہوں نے میز پر بیٹھ کر ترنم سے اپنی غیر مطبوعہ نظم "خضرِ راہ" پڑھی۔

اس وقت کمیونزم کا روس پر تسلط ہو چکا تھا۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے روس میں ۱۹۱۷ء میں زار کی سلطنت کا تختہ الٹ دیا گیا اور بولشویک برسرِ اقتدار آ گئے۔ اور جب بولشویک غالب آئے تو منشویک دوست طاقتوں کو شکست دے کر روس سے خارج کر دیا گیا۔ اب لینن کا راج تھا۔ لینن کے متعلق جو کہانیاں ہندوستان آئی تھیں وہ انتہائی وحشت خیز تھیں۔ وہ تمرد اور سرکشی کے ساتھ خدا کے وجود کا انکار کرتا تھا۔ اور شاہی خاندان، امراء اور متوسط طبقہ پر طرح طرح کے مظالم توڑتا تھا۔ وہ کارل مارکس کے حوالے سے کہتا تھا کہ "مذہب لوگوں کے لئے افیون ہے"۔ اور اس مقولہ کو ماسکو کے سرخ میدان میں ایک نمایاں جگہ پر کندہ بھی کرا دیا تھا۔ یہ بھی مشہور تھا کہ وہاں نکاح کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔ نہ صرف یہ کہ تمام املاک حکومت کی ملکیت ہو گئے ہیں بلکہ اشتراک احوال کے ساتھ اشتراک

عورات کا بھی قانون جاری کردیا گیا ہے۔ اوران کے مال پر غریبوں اور ناداروں کو دست درازی کرنے سے روکتا ہے۔ لہذا مذہب کیوں کہ ذاتی ملکیت کو جائز سمجھتا ہے اس لئے وہ قدامت پسند اور ناقص ہے۔ کیونکہ وہ غریبوں کو مالداروں کا غلام بناتا ہے اور کسانوں اور مزدوروں کو پیہم غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھتا ہے۔ اس لئے مذہب سے اجتناب کرکے مزدور راج قائم کرنا چاہئے اور تمام عالم میں مزدوروں کی مطلق العنانی حکومت (DICTATORSHIP OF THE PROLE TRIATE) قائم ہونا چاہئے اور ایسا نہیں ہوسکتا جب تک کہ مذہب کا جامہ قطعی اتار نہ پھینکا جائے۔

اس تمہید کے بعد اب جلسہ کی سرگذشت بیان کی جاتی ہے جو لوگ موجود تھے ان سے معلوم ہوا کہ لوگوں نے فوراً لکھنا شروع کیا تو علامہ نے منع کیا اور کہا کہ کوئی میرے اشعار نوٹ نہ کرے ایک بند پڑھتے تھے اور چندہ کا مطالبہ کرتے تھے۔ اور دس دس ہزار روپیہ چندہ ہوتا تھا۔ جب حسب ذیل بند کی نوبت آئی۔:

بندۂ مزدور کو جاکر میرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات

نسل قومیت کلیسا سلطنت تہذیب انگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سکر کی لذت میں سب لٹوا دیا نقد حیات

دست دولت آفریں کو مزدیوں ملتی رہ
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوات

اٹھ کہ اس بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

تو ایک شخص کھڑا ہو گیا اور اس نے کہا کہ ہم ڈاکٹر اقبالؔ کو سن رہے ہیں یا ڈاکٹر لینن کو، ہمیں کیمونزم کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ علامہ اقبالؔ نے فوراً تردید کی اور کہا کہ میں اسلام پیش کر رہا ہوں۔ اسلام کی یہی تعلیم ہے اور چند جملوں کی ایک مختصر تقریر کی۔

اس طویل تمہید سے یہ اندازہ ہوگا کہ علامہ اقبالؔ کی شخصیت کا عوام و خواص پر کیا اثر قائم ہو چکا تھا لیکن اس سے زیادہ یہ بات ثابت ہوگی کہ اسلام پر غلط نظریات کس طرح غالب آ گئے تھے۔ اور فکر اسلامی بادلوں میں چھپ گئی تھی۔ اسلام نے عرب سے تمام عالم کا سفر کیا۔ زمانہ سلف میں وہ جہاں گیا اس کے تخیلات غالب رہے اور اس کے ذہنی فتوحات کی کوئی انتہا نہ تھی۔ لیکن جب سلطانی آ گئی تو تاج و تخت کے لئے کشمکش جاری ہوئی۔ اور امویوں کو خارج کر کے عباسیوں نے جو حکومت قائم کی وہ ایرانیوں کی مدد سے وجود میں آئی تھی اور ایرانی حکومت میں بے انتہا دخیل تھے۔ انجام یہ ہوا کہ عجمی کلچر خالص عربی تہذیب میں شامل ہو گیا۔ یہی حال افکار عالیہ کا ہوا۔ مفسرین اور شارحین دنیا میں پھیلے ہوئے خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور حقیقتِ اسلام پردہ میں چھپ کر رہ گئی۔ نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ سرمایہ داری کا جزو اسلام سمجھا جانے لگا۔ اور جب اقبالؔ نے "بندۂ مزدور" کو خضر کا پیغام سنایا تو ایک چیخ بلند ہو گئی۔ وہ مذہب جس کی تاریخ میں سرمایہ دارانہ نظام اور سرمایہ داری سے مسلسل جہاد ہے اس میں مزدور کیوا جبی اجرت پر غوغا بلند ہو جانا اس زمانے کے میلانات کو ظاہر کرتا ہے۔ اقبالؔ انہیں عجمی تخلیقات کی اصلاح کا پیغام سنانے کے لئے زمزمہ سنج ہوا تھا۔ اور وہ اپنے کو عصر حاضر کا اسی طرح کا مصلح تصور کرتا ہے جس طرح کہ اپنے زمانے میں حضرت مولانا رومؒ تھے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ ع

چوں رومی در حرم دادم اذاں من — از و آموختم اسرارِ جاں من
یہ دو ر فتنہ عصر کہن او — یہ دورِ فتنہ عصر رواں من

یعنی رومی کی طرح میں نے حرم میں اذاں دی ہے۔ یعنی جس طرح حرم کا موذن پکارتا ہے کہ کاروبارِ دنیوی کو ترک کر کے حرم میں نماز پڑھنے چلو۔ اسی طرح میں ملت اسلامیہ عالم کو آواز دے رہا ہوں کہ عجمی تصورات کے پھندے سے نکل کر خالص اسلام کے دائرے میں آؤ۔ اپنے زمانے کے فتنہ کا سدباب کرنے کے لئے رومی تھے اور اپنے زمانے کے فتنہ کا سدباب کرنے کے لئے میں ہوں۔

چنانچہ وہ رسول پاک ﷺ کی بارگاہ میں اپنے اس مشن کی کامیابی کے لئے فریاد کرتا ہے۔

مسلماں آں فقیرے کج کلاہے　　رمیدازسینہ اوسوز آہے
دلش نالاچرا نالا نداند　　نگاہِ یا رسول اللہؐ نگاہے

مسلمان تو اک فقیر کج کلاہ تھا یعنی حکمرانی اور درویشی دونوں اس کے نصیب میں تھی۔لیکن اب اس کے سینے سے ایک ایک آہ رخصت ہوگئی۔اس کا دل نالا کرتا ہے کس طرح نالا کرتا ہے کیا نالا کرتا ہے اسے معلوم ہی نہیں یارسول اللہ ﷺ آپ اک نگاہ کرد یجئے۔

اقبالؔ نے جابجا جو کچھ انگریزی اور اردو نثر میں لکھا ہے۔ان سے بھی یہی بات یقینی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ اسلام جس دورِ انحطاط سے ذہنی اور سیاسی دونوں طرح پر گزر رہا ہے اس سے وہ بہت متاثر تھے۔اور وہ ایک طرح اس زمانے کے تمام مفکرین اتحاد اسلام (مین اسلام ازم) کے ذریعے اسلام کا دینوی اقتدار واپس لانا چاہتے تھے اور دوسری طرف ملت اسلامیہ میں جو غلط نظریات پیوست ہوگئے تھے ان کی اصلاح کرنے کے خواہش مند تھے۔اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنا کلام فارسی میں پیش کیا۔فارسی زبان عموماً دنیائے اسلام میں سمجھی جاتی ہے اور کم سے کم وہ فارسی کے ذریعہ بہت سے اسلامی ملکوں میں اپنے خیالات کی تبلیغ و اشاعت کر سکتے تھے۔اس طرح اقبالؔ نہ صرف ایک مفکر اسلام تھا بلکہ ایک مجدد تھا۔اور اس نے آب سرچشمہ اسلام سے تشنگانِ معرفت کو سیراب کیا ہے۔اس کو اسلام سے کاٹ کر محض شاعر کی حیثیت سے جانچنا اور پرکھنا اور صرف یہ کہہ دینا کہ اس کے کلام میں آفاقیت اور عالمگیریت ہے روزِ روشن سے انکار کے مترادف ہے۔آفاقیت اور عالمگیریت مبہم الفاظ ہیں۔اور اقبالؔ نے ابہام کو اپنے نصب العین اور پیام کے پیش کرنے میں روا نہیں رکھا۔وہ صاف صاف تاویل کی ادنیٰ ترین گنجائش دئے بغیر حقائق اسلام کو اجاگر کرتا ہے اور جب اپنا مقصد بیان کر لیتا ہے تو اس کو دل میں اتارنے کے لئے کبھی مناظرِ فطرت کا سہارا لیتا ہے اور کبھی صبح صادق وطلوع آفتاب کی جانب اشارے کرتا ہے۔کبھی گورِ غریباں پر جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنے مفہوم کو واضع کرنے کے لئے شاعرانہ محاکات کے وہ نوادر پیش کرتا ہے جو دنیائے ادب میں عدیم المثال ہیں۔جناب مجنوں گورکھپوری ہندوستان میں ادب وتنقید کے اماموں میں تصور کئے جاتے ہیں،ان کا فلسفہ اور تاریخ ادبیات کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ایک مرتبہ دورانِ گفتگو انہوں نے اقبالؔ کے اس شعر پر سخت اعتراض کیا۔ع

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اور کہا کہ "نغمۂ توحید" کے الفاظ استعمال کر کے اقبال نے اپنی پوری نظم کا ستیاناس کر دیا۔ مجنوں صاحب کی غرض غالباً یہ تھی کہ شمع اور شاعر کا آخری بند بہت ہی بلند تھا۔ اور مبہم ہونے کی وجہ سے ہر جگہ چسپاں ہو سکتا تھا۔ ع

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل — موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی
نالۂ صیاد سے ہوں گے نواساماں طیور — خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی

اب حسب ذیل اشعار سے وہ عمومیت غائب ہوگئی اور یہ پیامِ امید صرف مسلمانوں کے لئے محدود ہو کر رہ گیا۔ ع

پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود — پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں — محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے — یہ چمن مامور ہوگا جلوۂ توحید سے

مجنوں صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ بالکل صحیح ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کی اقبال کا پیام اس حیثیت سے محدود ہے کہ وہ اسلام اور حقائقِ اسلام کی شرح ہے۔ لیکن ادب میں احتساب کا محکمہ قائم کرنا جائز نہیں ہے۔ اس کا کیا علاج کہ اقبال کی فکر و نظر میں کل آفاقیت اور عالمگیریت اسلام اور صرف اسلام ہی میں پنہاں ہے اور کیا اس عقیدے کے اظہار پر کسی قسم کی پابندی عائد کی جا سکتی ہے۔ اگر مارکسی ادب میں "سرخ سویرا" جیسے کھلے ہوئے اشارے آسکتے ہیں۔ اور اگر ان کی شاعری میں کھلم کھلا مذہب کو وہم اور اس کے نتائج کو افیون زدگی ظاہر کیا جا سکتا ہے تو اسلام کو کیوں نہ شاعرانہ انداز میں پیش کیا جائے۔ کرشن چندر اپنی ناول "جب کھیت جاگے" میں لکھتے ہیں۔ ماسکو ایک شہر ہے پھر کیا ماسکو ایک خیال بھی ہے۔ اور پھانسی سے پہلے ہیرو کو سرخ قمیص پہنائی جاتی ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے۔ اور کیا اقبال نے کوئی انوکھی بات کی ہے۔ اور اس کے پہلے کسی عظیم شاعر نے ایسا نہیں کیا۔ اور بہت سی مثالوں کو جانے دیجئے مثنوی مولانا روم نے صدیوں تک اسلام کی تشریح و وضاحت

وتبلیغ کا ایسا کام کیا کہ اس کا مطالعہ اور اس کی تعلیم اسلامی درس گاہوں کا ایک جزو بنی رہی اور علامہ اقبالؔ نے اسلامی فکر ونظر کو عصر حاضر کے سانچے میں ڈھال کر وہی خدمت انجام دی ہے جو مثنوی مولانا روم نے صدیوں پہلے کی تھی۔ چنانچہ مثنوی مذکور کے متعلق یہ ضرب المثل کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ع

مثنوی ومولوی ومعنوی ہست قرآں درزبانِ پہلوی

یعنی مولانا روم کی مثنوی فارسی زبان میں قرآن ہے۔ یعنی قرآن کی جو تعلیم ہے بجسنہ وہی تعلیم مثنوی مذکور میں دی گئی ہے۔ اقبالؔ کا کلام اس ادعا سے بھرا ہوا ہے کہ وہ مولانا روم کا متبع ہے اور ان کو ہر جگہ مرشد رومی کے نام سے یاد کرتا ہے اور اس نے وہی کام عصر حاضر میں کیا ہے۔ جو مولانا روم نے پہلے کیا تھا۔ ع

مطرب غزلے بیتے از مرشد روم آرد ناغوطہ زند جانم در آتش تبریزے

یہ اور بات ہے کہ جناب مجنوں گورکھپوری اور دوسرے مارکس ازم کے معتقدین کو اسلام سے عار آتی ہو۔ جس طرح ممکن ہے کہ ایک طبقہ کو مارکس ازم کے اس فلسفہ سے نفرت معلوم ہو جس کا کل نچوڑ اقبالؔ نے ایک مصرعہ میں ظاہر کیا ہے۔ ع

برمساواتِ شکم دارد اساس

مارکسی عقائد کے لوگوں کا تو یہ حال ہے کہ یہ لوگ ادب میں پروپگنڈہ کرتے ہیں۔ ادب میں پروپگنڈہ ایک سخت معیوب بات ہے۔ ادب کا پروپگنڈہ ہمیشہ سے جائز رہا ہے اور ہمیشہ جائز رہے گا۔ کسی ادب کی تخلیق بلا اس کے ممکن نہیں ہے کہ حیات وکائنات کے بارے میں ذہن کے اندر نچتہ عقائد ونظریات ہوں۔ ان عقائد ونظریات کا حسین الفاظ میں حسن بیان اور ندرت اظہار کے ساتھ واضح کرنا کمالِ فن ہے۔ مارکسی حضرات جنہوں نے ''ترقی پسند ادب'' کے خوش نما الفاظ کا نقاب اپنے چہروں پر ڈال لیا ہے روس کی بدلتی ہوئی پالیسی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ادب اور فن کو جائز طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان جب زمانہ جنگ عظیم میں برطانیہ سے یہ پوچھ رہا تھا کہ آپ جنگ کا مقصد واضع کریں اور عوام لڑائی سے الگ کھڑے ہو کر آزادی کی موت وحیات کی جنگ لڑ رہے تھے۔ مکانات پھونکے جا رہے تھے۔ بچے الٹے لٹکا کر آگ پر بھون کر مار ڈالے جاتے تھے۔ والنٹروں کو گھوڑوں سے روندا جاتا تھا۔ کپکپاتی سردی میں آزادی کے رضا کار پانی میں کھڑے کئے جاتے تھے اور پھر نکال کر ان کو پیٹا جاتا تھا اور پھر پانی میں کھڑا کیا جاتا تھا۔

مال واملاک قرق ہو رہے تھے اور ظلم وستم کا پہاڑ توڑا جا رہا تھا۔ ان حالات میں یہ حضرات صرف اس لئے کہ روس برطانیہ کی طرف تھا اسے جنگ آزادی قرار دینے میں منہمک تھے اور اپنے فن کا پورا زور اس پر صرف کر رہے تھے۔ ملاحظہ ہو ع

یہ جنگ ہے جنگ آزادی، آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہندی اور ہم افرنگی ہم چینی جانبازانِ وطن
ہم سرخ سپاہی ظلم شکن، آتش پیکر فولاد بدن
یہ جنگ ہے جنگ آزادی، آزادی کے پرچم کے تلے

ان کے کانوں میں اس وقت بیواؤں کی آہیں یتیموں کی کراہ، مظلوموں کی سسکیاں آتی تھیں۔ اور بلا کچھ اثر کے ختم ہو جاتی تھیں۔ اسی طرح ان لوگوں نے پہلے پاکستان بننے کی موافقت کی پھر مخالفت کی۔ ہر موڑ پر ان کی نگاہ روس کی پالیسی پر رہتی ہے اور اسی قسم کا لٹریچر یہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ہے ادب میں پروپگنڈہ جو قابلِ اعتراض ہے۔ کسی شخص کو حق ہے کہ وہ بت، بت خانہ یا انکار خدا کو اپنا مطمع نظر بنائے خالص فنی بنیادوں پر اس کا کلام تولا جائے گا اور دیکھا جائے گا کہ حیات وکائنات میں وہ فرار کی راہ اختیار کرتا یا جدوجہد زندگی میں حصہ لے کر امید کا پیغام دیتا ہے۔ بنیادی عقائد وتصورات پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔

اب غور کیجئے کہ اگر اقبال شمع اور شاعر کے آخری بند میں ''حرم'' اور ''توحید'' کے الفاظ نہ لاتا تو کسی کی سمجھ میں کیا آتا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

اس طرح ایک نظم ''مسلم'' میں پہلے وہ اپنے کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ع

گوش آواز سر ودرفتہ کا جویا ترا　　اور دل ہنگامۂ حاضر سے ہے بے پروا ترا
قصہ گل ہم نوایانِ چمن سنتے ہیں　　اہلِ محفل ترا پیغامِ کہن سنتے ہیں
اے صدائے کارواں خفتہ پا خاموش ہو　　ہے، بہت یاس آفریں تیری صدا خاموش ہو
زندہ پھر وہ محفلِ دیرینہ ہو سکتی نہیں
شمع سے روشن شب دوشینہ ہو سکتی نہیں

پھر امید کے چراغ جلا کر پیغام دیتا ہے

ہم نشیں مسلم ہوں میں توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہد عادل ہوں میں

حق نے عالم میں صداقت کے لئے پیدا کیا
اور مجھ کو اس کی حفاظت کے لئے پیدا کیا

میری ہستی پیرہن عریانیِ عالم کی ہے
میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے

کب ڈرا سکتا ہے غم کا آنمی منظر مجھے
پے بھروسہ اپنی ملت کے مقدر پر مجھے

یادِ عہدِ رفت میری خاک کی اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

اس طرح ''برہنہ گفتن'' پر عمل کر کے اقبال نے اپنا مقصد پورا کیا اگر وہ یہ نہ کرتا تو اس کا پیغام تشنہ رہ جاتا۔ پیغام کی نوعیت ہی صاف گوئی کی متقاضی تھی۔ ''سرودِ رفتہ'' کا ازسرِ نو جگانا اور ''محفل دیرینہ'' کا زندہ کرنا اور ''شبِ دشینہ'' میں سحر کا نور بھرنا اقبال کا منشائے خیال ہے۔ اسی طرح ایک دوسری نظم میں یہ کہنے کہ بعد کہ۔ ع

مشرق خراب و مغرب ازاں بیشتر خراب　　عالم تمام مردہ و بے ذوق جستجو است

یعنی مشرق خراب اور مغرب اس سے زیادہ خراب ہے۔ عالم تمام مردہ ہو چکا ہے اور اس میں ذوق جستجو باقی نہیں ہے۔ اس طرح پیغام دیتا ہے ع

ساقی بیار بادہ و بزم شبانہ ساز　　ما را خراب یک نگہِ محرمانہ ساز

یعنی اے ساقی شراب لا اور ''بزم شبانہ کو پھر آراستہ کر اور نگاہ محرمانہ سے ہم کو بد مست کر دے'' یعنی اقبال کے خیال میں ''نگہ محرمانہ'' بلا بزم شبانہ کے آراستہ کئے ممکن نہیں ہے۔ اقبال کے یہاں لفظ ''ساقی'' بھی ایک خاص معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ عام ادب میں شاعر کے ماسوا کوئی ہستی ہے لیکن اقبال جو اپنی فطرت کے سوز میں جلنا ہی اصل حیات تصور کرتا ہے۔ اکثر جگہ ساقی سے مراد خود کو لیتا ہے۔ چنانچہ دیکھئے۔ و

خیر تو ساقی سہی لیکن پلائے گا کسے　　اب نہ وہ میکش رہے باقی نہ وہ میخانہ رہے

دوسری جگہ کہتا ہے۔ ع

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے　　مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں　　کہیں سے آبِ بقا دوام لے ساقی

کٹی ہے رات تو ہنگامہ گستری میں ترنی
سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی

حیات بعد الممات

اسی طرح مناظرِ فطرت کی عکاسی میں کمالِ فن ظاہر کرنے کے بعد اپنا پیغام کبھی نہیں بھولتا۔ چکبست کا حسبِ ذیل شعر بہت مشہور ہے ع

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا

شعری خوبیوں کے لحاظ سے کیا خوب ترتیب ہے اور اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ لیکن معنوی اعتبار سے مادہ پرستی کی تعلیم ہے۔ عناصر کے ظہور ترتیب سے زندگی بن گئی اور یہی اجزاء پریشاں ہو گئے تو ان کا نام موت ہے۔ یعنی موت کے بعد کچھ نہیں ہے۔ یہ زندگی اور موت صرف نیچر کا ایک کھیل ہے اس کے مقابلے اقبالؔ موت کو ایک جدید اور دائمی حیات کا دروازہ قرار دیتا ہے۔ اس طرح حیات بعد الممات کے فلسفہ کو پیش کرتا ہے ع

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

اسی طرح والدہ محترمہ کی یاد میں جو دلدوز فلسفیانہ مرثیہ لکھا ہے۔ اس میں یہی پیغام دیتا ہے ع

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوق حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام اس کو یوں نہ کر دیتا نظامِ کائنات
موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

آگے چل کر کن مرصع الفاظ میں اور حسنِ بیاں کی بے پایاں خوبیوں کے ساتھ کس طرح اس خیال کو ادا کیا ہے اور اس میں فطرت کی عکاسی کا کیسا عجیب مرقع ہے ع

پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
داغ شب کا دامن آفاق سے دھوتی ہے صبح

لالہء افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ
بے زباں طائر کو سرمستِ نوا کرتی ہے یہ

سینہء بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہے
سیکڑوں نغموں سے یادِ صبح دم آباد ہے

خفتگانِ لالہ زارو کوہسارو رودبار
ہوتے ہیں آخر سرودِ زندگی سے ہمکنار

یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ ہستی کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

حیات بعد الممات جسے حیاتِ ابدی بھی کہہ لیجئے۔ اسلام کا سنگ بنیاد ہے۔ اور اس میں مسلسل حرکت ہے۔ روحِ انسانی برابر مدارج ترقی طے کرتی جائے گی۔ وہ موت سے مرتی نہیں اور جاودانی ہے اور رواں دواں چلی جارہی ہے۔ اس کو اقبالؔ نے طرح طرح سے بیان کیا ہے۔ ''اخترِ صبح'' کے عنوان سے یہ لکھنے کے بعد کہ صبح کا ستارہ روتا تھا اور کہتا تھا کہ میری بھلا بساط ہی کیا ہے میں تھوڑی دیر میں ختم ہو جاتا ہوں۔ مجھے حباب کا نفس اور ترارے کی تابندگی ملی ہے۔ اقبالؔ اپنا تسکین دہ جواب اس طرح سناتا ہے کہ اگر تجھے غمِ فنا ہے تو گنبدِ فلک سے مثلِ شبنم میرے ریاضِ سخن کی جاں پرور فضا میں اتر۔ ع

میں باغباں ہوں محبت بہار ہے اس کی
بنا مثالِ ابد پائدار ہے اس کی

اس طرح ''چاند اور تارے'' میں تارے چاند سے کہتے ہیں کہ ہم کو تو ہمیشہ چلنا ہی چلنا ہے تو کیا ہماری منزل کبھی آئے گی۔ ہم ٹھہر گیا تو چاند نے جواب دیا۔ ع

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

اور اسی طرح ساحل افتادہ اور موج کی کہانی بیاں کی ہے۔ ع

ساحل افتادہ گفت منکہ بسے زیستم ہیچ نہ معلوم شدہ آہ کہ من کیستم
موجِ زِ خود رفتہء تیز خرامید و گفت ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم

ساحلِ افتادہ جو بے حرکت رہتا ہے اس نے کہا کہ میں اگرچہ بہت دنوں زندہ رہا

لیکن افسوس مجھ کو کچھ معلوم نہ ہوا کہ میں کون ہوں از خود رفتہ موج تیزی سے چلی اور اس نے یہ راز بتلایا کہ زندگی حرکت کا نام ہے اگر میں چلوں تو میں ہوں اور نہ چلوں تو میں نہیں ہوں۔

اس طرح صبح کا نقشہ بڑی ندرت سے اس طرح کھینچنے کے بعد کہ ع

اجالا جب ہوا رخصت جبینِ شب کی افشاں کا
نسیم زندگی پیغام لائی صبح خنداں کا

کہتا ہے کہ ع

سوئے گورِ غریباں جب گئی زندوں کی بستی سے
تو یوں بولی تماشہ دیکھ کر شہرِ خموشاں کا
ابھی آرام سے سوتے رہو میں پھر بھی آؤں گی
سلادوں گی جہاں کو خواب سے تم کو جگاؤں گی

یہ قیامت کا نقشہ ہے جب سارا عالم فنا ہو جائے گا۔ اور مردے قبروں سے اٹھیں گے اور حیات بعد الممات کی دوسری منزل شروع ہوگی۔ پہلی منزل قبر سے قیامت تک تھی اور حرکت سے مراد وہی روح کا مسلسل سفر ہے جس پر پہلے بحث ہو چکی "حیات ابدی" کے عنوان سے لکھا ہے۔ ع

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی وہ صدف کیا کہ جو قطرہ کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گرو خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

موت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ ع

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے — اگر ہو زندہ تو دل ناصبور رہتا ہے
ستارہ، شال شرارہ یک دو نفس — مئے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا — ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

اس کے بعد شاہکار ملاحظہ کیجئے۔ ع

فریب نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر زرہ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوق پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند — سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

خودی کی ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریِ کائنات

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقدیم کا راز ہے

ازل سے یہ ہے کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پزیر

یہ عالم یہ ہنگامہ رنگ وصورت
یہ عالم کی ہے زیر فرمان موت

یہ عالم یہ بت خانہء چشم و گوش
جہاں زندگی ہے فقط خورد نوش

خودی کی ہے یہ منزل اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں چھوڑ کر

اقبالؔ کے ہاں ''حرکت'' اور ''سفر'' تقاضائے حیات ہیں۔ ''سکون پرستی'' نہ صرف غلط بلکہ ایک مرض ہے۔ فلسفہء اقبالؔ میں اس کے خاص معنی ہیں۔ جب انسان اپنی انا کو بھول جاتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ میں جذب کر دینے کا طالب ہوتا ہے تو گویا اسے ایک منزل قرار دیتا ہے۔ حالانکہ ''روح انسانی'' جو ہمہ وقت انسان کو اپنا وجود یاد دلاتی رہتی ہے۔ منزل اور قیام سے بیگانہ ہے۔ اس کا ایک وجود ہے اور جس رنگ میں نمودار ہوا اپنی ہستی برقرار رکھتی ہے۔ بچہ، جوان اور بوڑھا ہوتا ہے لیکن اس کے اندر ایک احساس باقی رہتا ہے کہ وہ وہی ہے۔ یہ ہے خودی کا وجود اور پھر اس تقویم پر قائم رکھ کر ابدالاباد تک ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ وہ لافانی اور ابدی ہے۔ اسی سے یہ شاخ بھی پھوٹتی ہے کہ کشمکشِ حیات میں حصّہ لے کر جدوجہد کا میدان آراستہ کیا جائے۔ اور روحِ انسانی کا غلط تصور جب وحدت الوجود کے عقیدے کے سانچے میں ڈھلتا ہے تو اس سے جہاد زندگی سے گریز اور فرار کی راہ پیدا ہوتی ہے۔

جس حال میں اقبالؔ نے مسلمانوں کے ذہن و دماغ کو پایا اس کا رونا جگہ جگہ رویا ہے اور بڑی ہی وضاحت سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ عجمی تخیلات جس طرح مسلمانوں پر مسلط ہو گئے تھے جس سے اصل حقیقت مذہب اسلام پوشیدہ ہو گئی تھی۔ اس کا بڑے پرزور الفاظ میں تذکرہ ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو ع

مسلمان ہے توحید میں گرم جوش — مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تمدن ، تصوف ، شریعت، کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام
شریعت روایات میں کھوگئی — یہ امت خرافات میں کھو گئی
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے — مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

شیطان نے ایک مجلسِ شوریٰ منعقد کی ہے اور دریافت کر رہا ہے کہ اہلِ بیت کو کیا خطرات درپیش ہیں۔ ہر ایک اپنے فہم کے مطابق جب رائے دے چکا تو شیطان کہتا ہے۔

ع

ہے خطرہ کوئی اگر مجھ کو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب بھی نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو

اور اس پر موجودہ انحطاط اور کمزوری کو دیکھتے ہوئے اخوان الشیاطین کے لبوں پر مسکراہٹ آئی ہوگی تو پھر وہ یوں تشریح کرتا ہے۔ ع

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ یثرب کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عہدِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

یہ تو شاعرانہ فن کاری کے سلسلے کی بات ہے کہ خواہ شاعر کوئی بات ابلیس کی زبان سے کہے یا جبریل کی زبان سے لیکن اس سے حسب ذیل باتیں ثابت ہوئیں

(۱) اقبال کو شدت سے اس کا احساس تھا کہ عجمی تخیلات امنڈے ابر کی طرح آفتابِ اسلام کو چھپا لیا ہے اور اس بادل کو اڑانا اور آفتاب کی کرنوں سے عالم کو منور کرنا ہے۔

(۲) اس کا پختہ عقیدہ ہے کہ اسلام دینِ فردا ہے اور خود دنیا ذہن کی جن ارتقائی منزلوں سے گزر رہی ہے اور ان کا تقاضا یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کا لایا ہوا دین آشکارا ہو کر رہے۔ ع

مسلم ہستی سینہ راز آرزو آباد را
ہر زماں پیش نظر لا یخلف المیعاد را

یعنی اگر تو مسلم ہے تو اپنا سینہ امید سے آباد رکھ اور ہر وقت اس کا دھیان رکھ کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہوسکتا۔ اور وہ اشارہ ہے اس جانب کہ اسلام تمام ادیان پر فائق ہوکر رہے گا۔

اِدّعا

اقبالؔ نے بہت صاف لفظوں میں اس کا دعویٰ بھی کیا ہے کہ شاعری جو عرف عام میں معانی رکھتی ہے۔ اس سے اس کا کوئی سروکار نہیں ہے بلکہ وہ اس پیغام کو پیش کر رہا ہے جو جبریل امین رسول پاک ﷺ کے پاس لائے تھے اور بے غل وغش وہ ہدایت اور مرشد کا مبلغ ہے چنانچہ کہتا ہے ع

نہ بینی خیر ازاں مرد فرد ست — کہ بر من تہمتِ شعر وسخن بست
اگر آہم بدریائے نہ گنجم — اگر خاکم بصحرائے نہ گنجم
نہاں تقدیر ہا در پردۂ من — قیامت ہا بغل پروردہ من
بریل ۔ امیں ہم داستانم — رقیب وقاصد ودرباں نہ دانم

یعنی اقبالؔ للکارتا ہے کہ اگر کوئی شخص میرے اوپر شعر وسخن کی تہمت باندھتا ہے تو خبردار اس تنگ مایہ شخص سے کسی بھلائی کی امید نہ رکھنا۔ میں اگر پانی ہوں تو دریا میں نہیں سما سکتا۔ میں اگر خاک ہوں تو صحرہ میں نہیں سما سکتا۔ تقدیریں میری جلو میں پرورش پاتی ہیں اور قیامتیں میری بغل پروردہ ہے۔ یہ سب اس لیے کہ میں جبریل امیں کا ہم داستاں ہوں۔ رقیب قاصد اور دربان کی مجھے حاجت نہیں حاصل یہ کہ میں اسی طرح پیغام ربانی کو پیش کرتا ہوں جس طرح جبریل امین اصلی حالت میں خدا کے سچے نبی محمد الرسول اللہ ﷺ کے پاس لائے تھے۔

بعض کم فہم لوگوں نے اقبالؔ پر اعتراض کیا ہے کہ وہ اپنے ذات کی شاعرانہ تعلّی میں اس قدر بڑھ گئے کہ اپنے کو ثانی جبریل امین قرار دے دیا اور یہ ایک عظیم گستاخی ہے لیکن مجھے تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی بلکہ مجھے اس شعر پر وجد آتا ہے۔ اس ایک شعر میں کہ ع

بجبریلِ امیں ہم داستانم　　　رقیب و قاصد و درباں ندانم

اقبالؔ نے اپنے پیغام کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ وہ کسی طرح اپنی ذات کو درمیان میں نہیں لایا بلکہ اپنے کلام اور اپنے پیغام کی بابتہ کہہ رہا ہے وہ اگر سادہ لفظوں میں خلاصہ کے طور پر بیان کیا جائے تو یہ ہوگا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ وہی ہے جو جبریل امین نبی پاک ﷺ کے پاس لے کر آئے تھے۔ یہ اِدِّعا بذاتِ خود اس نظریئے کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اقبالؔ نے اسلام کو اپنی اصلی اور خالص صورت پیش کرنے کے لئے اپنے کلام پر محنت کی تھی۔

اسی طرح ایک جگہ اپنے مرشد رومی کے پیغام کی بھی وضاحت کی ہے۔ اقبالؔ مولانا رومؒ سے بڑی گہری عقیدت رکھتے تھے اور جا بجا انہوں نے آشکارہ کیا ہے کہ فکر و نظر کی منزل میں انہوں نے کل اکتساب مولانا روم ہی سے کیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ غالب اور رومی کا مقابلہ کیا ہے۔ برونگ نے کہا کہ میرے ساغرے میں آبِ خضر کی آمیزش ہے۔ بائرن نے جگر کے پانی کو ساغر میں ملایا اور غالب نے گرم جوشی میں آبگینہ کو پگھلا کرے میں اس کی آمیزش کی۔ آخر میں جب مولانا روم کا نمبر آیا تو وہ فرماتے ہیں۔ ع

آمیزشے کجا گہر پاک او کجا
از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

یعنی کہاں وہ گہر پاک اور کہاں آمیزش، میں تو خوشۂ انگور سے بادۂ خالص نچوڑتا ہوں اور اسی کو اپنے ساغر میں ڈالتا ہوں۔ یہاں بھی مقصد وہی ہے کہ رومی کا پیام خالص وہی پیام ہے جو سردارِ دو جہاں رسول اللہ ﷺ کے پاس جبریل امین لائے تھے مرشد رومی و برید ہندی دونوں کا مقصد اور منصب ایک ہی ہے۔

اگر چہ اقبالؔ کے کلام کو اقبالؔ کی زندگی سے خواہ وہ ذاتی ہو یا سیاسی مطابق کرنا اقبالؔ کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری مزاحاً کہا کرتے تھے کہ اس کی شان میں تو قرآن کی آیت ”یقولون مالا یفعلون“ نازل ہے۔ قرآن پاک میں شعرا کا جہاں ذکر آیا ہے وہاں یہ کہا گیا ہے کہ وہ جو کر رہے ہیں کرتے نہیں۔ خود اقبال نے اپنے بارے میں بار بار اس کا اظہار کیا ہے ع

اقبالؔ بڑا اپدیشک ہے من باتوں سے موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

اور کہتا ہے ع

جو بے نماز کبھی بڑھتے ہیں نماز اقبالؔ
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

میں ایک دن علامہ اقبالؔ کی محفل میں بیٹھا تھا اب وہ مجھے جان گئے تھے اور زمیندار اخبار میں میرے ایڈیٹوریل مضامین سے خوش ہو کر کئی مرتبہ مجھے چائے پلا چکے تھے کہنے لگے کہ آپ وسط ایشیا میں جا کر کام کیجئے۔ اس وقت وہ صحیح میدان ہے اور پھر خود ہی کہنے لگے کہ آپ کے دل میں سوال پیدا ہوگا کہ میں ایسا کیوں نہیں کرتا تو میرا جواب یہ ہے کہ میرے اندر ذوق یقین اور جذبہ صادق تو موجود ہے لیکن توفیقِ عمل نہیں ہے۔ اس موقع پر ایک صاحب بول اٹھے کہ جی ہاں! اسی لئے تو آپ نے کہا بھی ہے کہ ع

از خاکِ سمرقندے ترسم کہ دگر خیزد آشوب ہلاکوئے ہنگامہ چنگیزے

علامہ نے چونک کر کہا کہ میرے شعر کا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں نے سمرقند نہیں کہا بلکہ سمرقندے کہا ہے اور میرا منشا یہ ہے کہ جس طرح ہلاکو کی غیر متمدن طاقت نے بغداد کی متمدن حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ اسی طرح کوئی غیر متمدن قوم اٹھے گی اور یورپ کی متمدن حکومتوں کی بساط الٹ دے گی۔ مطلب یہ ہے کہ اقبالؔ کی شاعری وجدان کا کرشمہ اور ذولیت از پیغمبری ہے جیسا کہ وہ خود کہتا ہے ع

اقبالؔ بھی اقبالؔ سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تصنع نہیں واللہ نہیں ہے

اور اس کا لگاؤ اس کے اعمال اور زندگی سے کماحقہ لگانا صحیح نہ ہوگا لیکن پھر بھی اقبالؔ کے افکار جو نثر میں اصول حیات کے متعلق ہیں ان کو اس کے کلام کی تشریح میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جا بجا انہوں نے اپنے مضامین میں پرزور طریقہ سے اس کا اظہار کیا ہے کہ ایک واحد اجتماعی نظام تمام عالم کا اگر بنایا جائے تو سوائے نظام اسلام کے اور کوئی اجتماعی نظام ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔ علامہ نے تاریخِ ادیان کے مطالعہ کے طور پر یہ بھی لکھا ہے کہ ''دین'' پہلے قومی تھا بعد میں نسلی قرار پایا جس سے یہ تھیوری پیدا ہوئی کہ دین پرائیویٹ عقائد کا نام ہے۔ اسی لئے انہوں نے جارحانہ وطنیت کی بھی مخالفت کی ہے۔ یعنی وہ وطنیت جو محرک جذباتِ انسانی کا واحد ذریعہ قرار دیا جائے۔ ویسے اپنے ملک و وطن سے جہاں وہ پیدا ہوا ہے، محبت کرنا ہر انسان کے لئے ضروری ہے۔ اور اس سے اور عالمی اجتماعی نظام سے جو معتقدات کی بنا پر قائم ہو کسی قسم کا تصادم یا دونوں میں کسی طرح کا تضاد نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ اگر کلام اقبالؔ کا سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو ایک طرف جہاں وہ مضبوط اسلامی عقائد کا اظہار کرتا ہے دوسری جانب وطن کی محبت میں سرشاری بھی اس کا شعار ہے۔ اگر چہ جیسا کہ میں نے کہا اقبالؔ اور کلامِ اقبالؔ دو چیزیں ہیں اور ایک کو دوسرے سے کلیتاً مطابق کرنا صحیح نہ ہوگا۔ مثلاً علامہ اقبالؔ نے سب سے پہلے بحیثیت صدر مسلم لیگ ''پاکستان'' کا تخیل دیا۔ لیکن اقبالؔ کے کلام میں پاکستان کی جانب اندنیٰ اشارہ بھی کہیں نہیں ملے گا۔ لیکن کوئی پیام خواہ وہ نظم میں ہو یا نثر بلا نچتہ عقائد کے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ وہ خود کہتا ہے ع

دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو
ہوتے ہیں یہ نچتہ عقائد کی بنا پر تعمیر

اور اقبالؔ کے کلام کا یہ پہلو کہ وہ اسلام کو اپنی اس صورت و رنگ میں پیش کرتا ہے تو ابتدائے نزول وحی سے ختم وحی تک پیغمبرِ اسلام ﷺ پر نازل ہوا تھا۔ بحث سے بالاتر ہو جاتا ہے۔

اسرارِ خودی کی کہانی

چوں رومی در حرم دادم اذاں من — از و آموختم اسرارِ جاں من
با دورِ رفتہء عصر کہن او — یہ دورِ رفتہِ عصرِ رواں من

اسرارِ خودی کی ابتدا میں علامہ اقبالؔ نے ایک کہانی لکھی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں محوِ خواب تھا کہ رومی کو دیکھا اس رومی کو جس نے فارسی کے الفاظ میں قرآن لکھا۔ عہ کہ بحرفِ پہلوی قرآں نوشت ہی سے حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے یعنی رومی کا کلام وہی ہے جو عربی میں قرآن پاک کی تعلیم ہے۔ اسلئے خود ان کے کلام کو بوجہ منصب مریدی وہی درجہ حاصل ہوگا۔ بہر حال مولانا روم نے آکر اقبالؔ سے کہا کہ میری مثنوی جس زمانے کے لئے لکھی گئی تھی وہ یکسر بدل گیا اور جدید تخلیقات اور نئے مسائل ذہن کے سامنے آگئے ہیں۔ اس لئے اب تم ایک دوسری مثنوی لکھو جس سے وہی مقصد حاصل ہو۔ چنانچہ بیدار ہونے کے بعد انہوں نے کمر ہمت باندھی اور لکھنا شروع کیا۔ عام طور پر یہ خیال ہے کہ جس طرح اقبالؔ نے اپنے آسمانوں پر جانے وہاں پر لوگوں سے ملاقات کرنے کے واقعات تمثیلاً لکھے ہیں یا جس طرح مکالمہِ ابلیس و جبریل میں اپنے مقصد کی وضاحت کے لئے فنکارانہ مہارت ظاہر کی ہے۔ اسی طرح اس خواب کا قصہ بھی ایک برجستہ تمہید یا ایک شاعرانہ تعلّی ہے۔ حقیقت سے اس کا واسطہ نہیں لیکن میں نے علامہ موصوف کے قریبی لوگوں سے بالتحقیق سنا ہے کہ وہ

ساقی ارباب ذوق

PDF BOOK COMPANY

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات :

Muhammad Husnain Siyalvi
0305-6406067
Sidrah Tahir
0334-0120123
Muhammad Saqib Riyaz
0344-7227224

خود فرماتے تھے کہ یہ ایک واقعہ ہے۔ بہر حال یہ ایک واقعہ ہو یا داستاں سرائی دونوں کا نتیجہ جہاں تک موضوع سخن کا تعلق ہے ایک ہی ہوگا۔ یعنی اقبالؔ کے دماغ میں مثنوی مولانا روم کے طرز پر شاعری میں افکارِ اسلام پیش کرنا اور ایک سوئی ہوئی امت کو خواب سے جگانا تھا۔ چنانچہ ایک نظم از خوابِ گراں خوابِ گراں خیز۔ از خوابِ گراں خیز کا آخری بند بھی اس کی نشان دہی کرتا ہے۔

فریاد از افرنگ و دلآویزیِ افرنگ
فریاد ز شیرینی و پرویزیِ افرنگ
الم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیِ افرنگ
معمار حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خیز از خوابِ گراں خیز

اس طرح انہیں کے قریبی تعلق والوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علامہ موصوف کہتے تھے کہ جب میں وطنی ترانہ نیا شوالہ وغیرہ لکھ رہا تھا تو میرا خیال تھا کہ ایک وقت آئے گا جب مجھے نوبل پرائز مل سکتا ہے لیکن جب میرے خیالات میں تبدیلی آئی اور میں نے اسلام پیش کرنے کا ارادہ کیا تو مجھے احساس ہوا کہ اب نوبل پرائز سے ہاتھ دھونا ہوگا۔ لیکن میں نے سوچا کہ اسلام کا حق میرے اوپر سب سے زیادہ ہے اور مجھے ان باتوں کی پرواہ نہ کرنا چاہئے۔ لیکن یہ بات بھی صحیح ہو یا غلط ان کا خود کلام ظاہر کرتا ہے اس کا ایک ایک مصرعہ ایک ایک شعر، ایک ایک بندش بتلاتی ہے کہ اس نے جو کچھ بھی کہا ہے اس کی تہ میں ہر جگہ ایک مفکرِ اسلام کی شان نمایاں ہے۔

اپنا تجزیہ

جب میں زمیندار روزنامہ کا ایڈیٹر تھا تو ہم اور غلام رسول مہرؔ اکثر رات میں علامہ اقبالؔ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ان کا دربارِ عام بہت رات گئے تک گرم رہتا تھا۔ ادنیٰ اور اعلیٰ کی کوئی تخصیص نہ تھی اور نہ علامہ میں کسی قسم کا احساس برتری تھا۔ میں نے خود دیکھا کہ ہائی اسکول کے لڑکے ان سے برابر کی بحث کرتے تھے۔ اور کبھی انہوں نے نہیں کہا کہ آپ لوگ یہ باتیں کیا سمجھیں۔ حالانکہ اکثر مباحث بین الاقوامی مسائل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہاں ہم سب لوگ دیکھتے تھے کہ وہ ایک حدیث بیان کرتے تھے اور اس کی شرح میں

اپنا کوئی شعر پڑھتے تھے۔ جتنی دیر صحبت رہتی تھی اسی قسم کے تذکرے ہوتے تھے اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان کا پورا کلام گویا قرآن وحدیث کی شرح ہے۔ انہوں نے شعوری طور پر اسلام کی تعلیمات کو موثر سے موثر رنگ میں پیش کرنے کے لئے شاعری اختیار کی تھی اور اقبالؔ کا کلام تعلیماتِ اسلامی کا ترجمان ہی نہیں تفسیر قرار دیا جاسکتا ہے۔ اپنے آخری زمانے میں جب وہ زندگی سے مایوس ہوئے اس وقت جو قطعہ کہا ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید　　نسیم از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگارے ایں فقیرے　　دگر دانائے راز آید کہ ناید

اب دیکھنا ہے جو ان کے مخالف تھے انہوں نے ان کے کلام کو کیا سمجھا۔ اور یہ بھی ایک کسوٹی ہے مولانا روم کی مثنوی کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ۔

مثنوی و مولوی و معنوی　　ہست قرآں اور زبانِ پہلوی

اس طرح علامہ اقبالؔ کو ''ترجمان حقیقت'' اور ''مفکر اسلام'' کے لقب بار بار دئے گئے ہیں اور وہ خود بھی فرماتے ہیں۔ ع

رازِ خدا کہ عارف وزاہد کسے نگفت　　در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

یعنی میں وہ رموزِ آلٰہیہ جو عارف اور زاہد کسی نے بیان نہیں کئے وہ میں بیان کرتا ہوں اور اصل اسلام کو پیش کرتا ہوں۔ حالانکہ میں ایک عارضی اور گنہگار ہوں۔ اور اس صف کا آدمی نہیں ہوں۔

اسرارِ خودی

اقبال جیسے مفکر شاعر کے کلام کے مرکزی خیال کو معلوم کرنے کے لئے تین معیار ہو سکتے ہیں۔

(۱)　کلام کی تاریخی نوعیت　(۲) خود صاحب کلام کا ادّعا اور کلام کی اندرونی شہادت ہم کلام کی تاریخی نوعیت کے سلسلے میں دیکھ چکے کہ علامہ موصوف محوِ خواب ہیں کہ۔ ع

روئے خود بخود بپیرِ حق سرشت　　کہ بحرفِ پہلوی قرآں نوشت

یعنی حضرت مولانا روم نمودار ہوئے اور علامہ موصوف کو پیغام دیا کہ جس عنوان سے مثنوی نے دنیا کو حیات کا فلسفہ بتلایا تھا امتدادِ زمانہ سے اب وہ پر اثر نہیں رہا۔ اس لئے اس پیام

کائنات وفطرت کو اب نئے طرز و انداز سے دینے کی ضرورت ہے پس یہ فرمایا کہ

ع

نالہ را انداز نو ایجاد کن　　بزم را از ہائے وہو آباد کن
خیز و جاں نو یدہ ہر زندہ را　　از قم خود زندہ گر کن زندہ را

یعنی نالہ تو وہی ہو لیکن نئے انداز سے اسے پیش کرتا کہ بزمِ ہائے وہو سے آباد ہو جائے اٹھ اور ہر زندہ میں نئی زندگی دوڑا دے اور اپنے ''قم'' یعنی اٹھ کے نعرے سے زندوں کو اور زندہ کر دے۔

چنانچہ اس تازہ و طرزِ نو پیغام دینے کے ارشاد میں علامہ موصوف میں ذوق و شوق پیدا کیا۔

زیں سخن آتش بہ پیراہن شدم　　مثل نے ہنگامہ آتش شدم
بہ گر ختم پردہ از رازِ خودی　　وا نمودم سر اعجازِ خودی

یعنی اس کلام سے میرے بدن میں آگ لگ گئی اور ہر مشکل سے لاپرواہ ہو کر رازِ خودی کو آشکارہ کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ اور اعجازِ خودی کو نمایاں کیا اور وہ رازِ خودی سے پردہ اٹھانے اور سر اعجاز خودی ظاہر کرنے کے لئے آمادہ ہوئے اور اس طرح ''اسرارِ خودی'' اور اس کے بعد تصانیف کا وجود ہوا۔

خود صاحب کلام کے ادّعا پر بھی بحث ہو چکی اور یہ ظاہر کیا جا چکا ہے وہ بار بار اپنے آپ کو اسلام کا داعی قرار دیتا ہے۔ اب آیئے کلام کی اندرونی شہادت کا جائزہ لیں۔

کلامِ اقبالؔ کی اندرونی شہادت

وہ کیا چیز تھی جس کے پیش کرنے کا ارادہ اقبالؔ نے کیا۔ وہ انسانیت کا پیام اور ملت بیضا کی تعلیم تھی۔ چند الفاظ میں شروع ہی میں دونوں کی یکسانیت کو واضح کر دیا ہے۔ ع

بہر انساں چشم اشبہا گریست　　تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست
از درون کارگاہِ ممکنات　　بر کشیدم سر تقویم حیات
من کہ ایں شب را چون مہ آراستم　　گرد پائے ملتِ بیضا ستم
ملتے در باغ و راغ آوازہ آش　　آتش و لہا سرورِ تازہ آش

محبت سے مستحکم ہوتی ہے اور اس کی مثال رومی اور تبریز سے لی۔ ملاحظہ ہو ع

عاشقی آموز و محبوبِ طلب — چشمِ نوحے قلب ایوبی طلب
کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے — بوسہ زن بر آستانِ کاملے
شمع خود را ہم چو رومی بر فروز — روم را در آتش تبریز سوز

یعنی خودی کو مستحکم کرنے کے لئے عاشقی سیکھ اور کسی محبوب کی تلاش کر کسی نوح کی آنکھ اور کسی ایوب کا دل تلاش کر اور کسی کامل کے آستانہ پر بوسہ دے کر اپنی مشت گل کو کیمیا بنا اور اپنی شمع کو رومی کی طرح خود روشن کر اور روم میں آتشِ تبریز سے سوز پیدا کر اور اس کے بعد فوراً وہ معرکۃ الآرا نعت کہی ہے جس کا غلغلہ آج بھی قائم ہے یعنی۔ ع

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ ست — آبروئے ماز نامِ مصطفیٰؐ ست
طور موجے از غبار خانہ اش — کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
بوریا ممنونِ خواب راحتش — تاج کسریٰ زیرِ پائے امتتش
در شبستانِ حرا خلوت گزید — قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشمِ او محرومِ نو — تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم
در جہاں آئینِ نو آغاز کرد — مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد
امتیازاتِ نسب را پاک سوخت — آتشِ او ایں خس و خاشاک سوخت
من چہ گویم از تو لالش کہ چیست — خشک چوبے در فراق او گریست
پیکرم را آفرید آئینہ اش — صبح من از آفتاب سینہ اش
آں کہ بر اعدا در رحمت کشاد — مکہ را پیغام لاتثریب داد

اور پیام یہ ہے کہ ع

لشکرِ پیدا کن از سلطانِ عشق — جلوہ گر شو بر سرِ فارانِ عشق
تا خدائے کعبہ بنوازد ترا — شرع انی جاعلٌ سازد ترا

اسی جگہ ایک واقعہ کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب حاتم طائی کے خاندان کی ایک لڑکی نبی پاک ﷺ کے سامنے پیش کی گئی تو اس کا حال یہ ہے کہ اس کے پیروں میں زنجیر تھی اور وہ بے پردہ تھی۔ آپ نے جب اس لڑکی کو بے پردہ دیکھا تو خود اپنی چادر اس کو دیدی۔ ع

دختر رو چوں نبی بے پردہ دید — چادرِ خود پیش روئے او کشید

اب اقبالؔ کے دل میں سوز پیدا ہوتا ہے اور وہ خودی کو عشق رسول ﷺ میں مستحکم کر کے ذہنی انقلاب کا پیغام دے چکا اور اس واقعہ کے تذکرے کے بعد اسے عالمِ اسلام کی کمزوری اور بے کسی یاد آتی ہے اور وہ تڑپ کر دربار رسالت میں فریاد کرتا ہے ع

ما ازاں خاتون طے عریاں تریم
پیش اقوامِ جہاں بے چادریم

یعنی ہم لوگ اس طے کی لڑکی سے بھی زیادہ ننگے ہیں اور دنیا کی قوموں کے سامنے آج بلا چادر کے ہیں۔ لیکن وہ مایوسی کا پیغامبر نہیں ہے اور دین و دنیا دونوں کے لئے رحمت اللعالمین ﷺ کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔ ع

روز محشر اغیار ماست او در جہاں ہم پردہ دارِ ماست او

خودی کے دیگر لوازمات بیان کرنے کے بعد اس کے تین مراحل بیان کئے ہیں۔ اول اطاعت، دوئم ضبطِ نفس، سویم نیابتِ الٰہی، جس کے آخر میں مجبوری میں فریاد کر کے جناب رسالت مآب ﷺ کو دوبارہ تشریف لانے کی غرض داشت پیش کی ہے۔ یہ اگرچہ ناممکن ہے لیکن جذبات کی شدت میں انسان منطق بھول جایا کرتا ہے۔ اسی سلسلے کا اقبالؔ کا وہ شعر بھی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کو لباسِ مجاز میں آنے کی دعوت دی ہے۔ ع

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

یہ کچھ اقبالؔ کے لئے انوکھی چیز نہیں۔ ملا جامی نے بھی جنونِ عشق میں ایسے اشعار کہے ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں کا بھی ایک قطعہ اسی رنگ کا ہے۔ ع

قول اکبر ہے کہ خوں ریزی مٹانے کے لئے حضرت عیسیٰ کو دنیا میں بلانا چاہئے
امن کے شہزادے کا لازم ہے دنیا میں نزول ظالموں پر بس یہی نزلہ گرانا چاہئے
بندہ کہتا ہے قیامت کی ابھی ساعت ہے دور ہم کو کچھ اور یوں ہی گڑ گڑانا چاہئے

وہ جو یثرب میں پڑا سوتا ہے میٹھی نیند اسے
مسلم بے کس کے نالوں سے جگانا چاہئے

چنانچہ اقبالؔ بھی بڑے سوز سے اس طرح نعرۂ الغیاث بلند کرتا ہے۔ ع

اے سوارِ شہب دوراں بیا اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
خیز و قانونِ اخوت ساز وہ جام صہبائے محبت باز وہ

باز در عالم بیار ایام صلح | جنگجویاں رابدہ پیغامِ صلح
نوعِ انساں مزرع وتو حاصلی | کاروانِ زندگی را منزلی
سجدہ ہائے طفلک برناؤ پیر | از جبین شرمسار ما بگیر
از وجود تو سر افراز یم ما
پس بہ سوزِ ایں جہاں سازیم ما

یعنی اے سوارِ اشہب دوراں اور اے فروغِ دیدۂ امکاں آیئے اور اٹھئے اور اخوت کا قانون جاری کیجئے اور پھر بادہ محبت کا جام دیجئے۔ دنیا میں پھر امن قائم کیجئے اور لڑنے والوں کو صلح کا پیغام دیجئے۔ تمام نوع انساں کھیتی ہیں اور آپ حاصل ہیں اور زندگی کے قافلے کی آپ ہی منزل ہیں۔ ہمارے نیاز کو قبول کیجئے کیونکہ آپ ہی سے ہمیں سرفرازی حاصل ہے۔ شاعرانہ تمثیل سے علٰحدہ ہوکر اس کے معنی سادہ لفظوں میں یہ ہوئے کہ دنیا کی نجات پیغامِ رسالت میں ہے۔ بعض لوگوں نے "سوارِ شہبِ دوراں" سے مراد ایک مرد کامل لیا ہے۔ جس کا اقبالؔ کو انتظار ہے۔ لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ یہ اشعار مرحلہ سویم "نیابت الٰہی" کے سلسلے میں آئے ہیں۔ اقبالؔ نے تربیت خودی کے تین مراحل قرار دیے ہیں۔ مرحلہ اول اطاعت، مرحلہ دویم ضبطِ نفس اور مرحلہ سویم نیابتِ الٰہی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ خودی کی پرورش و نمود سے ہر مومن کو نائبِ الٰہی اور خلیفۃ اللہ بنانا چاہتا ہے۔ لیکن نیابتِ الٰہی کا تذکرہ کرتے وقت وہ کارواں سالار نائبانِ الٰہی علیہ السلام کو کیسے فراموش کرسکتا۔ وہ جس کی ہر رگِ جاں میں عشقِ رسول کا نغمہ سرایا ہوا تھا۔ چنانچہ کلام کی اندرونی شہادت بھی اس جانب اشارہ کرتی ہے۔

نوعِ انساں رابشیر و ہم نذیر | ہم سپاہی، ہم سپہ گر، ہم امیر

یعنی بنی نوع انسان کے لئے بشیر بھی ہے اور نذیر بھی ہے خود سپاہی بھی ہے اور سپہ گر بھی اور امیر بھی اور سب باتیں در کنار "بشیر و نذیر" صرف ذات رسول پاک ﷺ کے لئے ہے کسی اور کے لئے یہ لفظ استعمال نہیں ہو سکتے۔ اقبالؔ بارگاہِ الٰہی میں تو بڑا گستاخ ہے لیکن بارگاہِ رسالت میں بڑا مودب رہتا ہے اس لئے ناممکن ہے کہ وہ کسی دوسرے کو بشیر و نذیر کہہ سکے یا کسی بشیر و نذیر کا منتظر ہو۔ نبی بعدی پر اس کا مکمل عقیدہ ہے۔ پھر ع

مدعائے علم الاسما ستے | سر سبحان الذی اسرا ستے

یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو جو علم اسما کی تعلیم دی گئی تھی وہ اس کا مدعا ہے اور سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْریٰ بِعَبْدِہٖ (معراج) کا راز ہے۔ یہ دونوں باتیں بھی صرف پیغمبر اسلام ہی میں جمع ہوسکتی ہیں اور آپ ہی کے لئے کہی جا سکتی ہیں۔

جلوہ ہا خیزد ز نقشِ پائے او
صد کلیم آوارۂ سینائے او

اس کے نقش پا سے جلوے اٹھتے ہیں اور ان کے سینے میں سینکڑوں کلیم آوارہ پھرتے ہیں۔

زندگی رامی دہد تفسیر نو
می دہد ایں خواب را تعمیرِ نو

زندگی کو ایک نئی تفسیر دینے والا اور زندگی کے خواب کی جدید تعمیر کرنے والا، یہ سب باتیں نبی علیہ السلام واصلوٰۃ وتسلیم ہی کے لئے مخصوص ہیں۔

رموزِ بیخودی

رموزِ بیخودی میں انسانی خودی کو نظم اجتماعی کا محتاج بتلایا ہے۔ اور فرد وملت میں ربط پیدا کرنے کی دعوت دی ہے۔ اسی سے وہ نیابتِ الٰہی یا خلیفۃ اللہ ہونے کا حقدار ہوتا ہے۔ اور اس کی تربیت وتدوین صرف بذریعہ نبوت ہی ممکن ہے۔ کیونکہ نبوت ہی ''نوامیس الٰہیہ'' انسانوں تک پہنچا سکتی ہے۔ اور بلا نوامیس الٰہیہ کی رہنمائی ورہبری عقل انسانی اس کی ہدایت سے قاصر ہے۔ عقل انسانی سے جس سوسائٹی یا اجتماعی زندگی کی تعمیر ہوگی وہ ہمیشہ ناقص رہے گی۔ اس اجمال کی تفصیل ارکانِ اساسی ملیہ اسلامیہ بیان کر کے کی ہے اور ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) توحید (۲) رسالت یعنی کلمہ طیبہ پر ملت کی اساس قائم کی ہے۔ باتیں وہی ہیں طرزِ ادا نرالی ہے اور خاتمہ عرض حال مصنف بحضور رحمت اللعلمین ﷺ پر ہے۔ جو تمناؤں، آرزوؤں، ذوق وشوق اپنی بے مائیگی اور غیر از تو مرا آخر سے لبریز ہے۔

جو مضامین ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بیخودی'' میں بیان کئے گئے ہیں ان کے عنوانات سے بھی اقبالؔ کے پیام کی مکمل وضاحت ہوتی ہے۔ اس لئے ان کا تذکرہ بھی مناسب اور ضروری ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ درشرح اسرار اسماء حضرت علی مرتضیٰؓ

۲۔ مقصدِ حیات مسلم اعلاء کلمۃ اللہ است جہاد اگر محرک جوع الارض باشد در مذہب

اسلام حرام است۔

یعنی مسلم کی زندگی کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہے اور جہاد اگر جوع الارض کی محرک ہو تو مذہب اسلام میں حرام ہے۔

اس کا پہلا شعر ع

اے ترا خاتم اقوام کرد　　　　بر تو ہر آغاز را انجام کرد

۳۔ مقصد رسالت محمدیہ تشکیل و تاسیس حریت و مساوات و اخوت بنی آدم است

۴۔ حیرت اسلام و سر حادثہ کربلا

۵۔ وطن اساسی ملت نیست

۶۔ ملت محمدیہ نہایت مکانی ندارد

۷۔ ملت محمدیہ نہایت زمانی ندارد کہ دوام ایں ملت شریفہ موعود است

۸۔ نظام ملت محمدیہ بغیر از آئین صورت نہ بند دار دائین ملت محمدیہ قرآن است

۹۔ پختگی سیرۃ ملیہ از اتباع آئین الٰہیہ است

۱۰۔ حسن سیرۃ محمدیہ از تادب بہ آداب محمدیہ است۔

۱۱۔ مرکز ملت اسلامیہ بیت الحرام است۔

۱۲۔ جمیعۃ حقیقی از محکم گرفتن نصب العین ملیہ است و نصب العین ملت محمدیہ حفظ و نشر و توحید است۔

۱۳۔ توسیع حیات ملیہ از تسخیر قوائے نظام عالم است۔

۱۴۔ کمال حیات ملیہ ایں است کہ ملت مثل فرد احساس خودی پیدا کند و تولید و تکمیل ایں احساس از امومت است و حفظ و احترام موت الیمل سلام است۔

۱۵۔ تفسیر قل ھو اللہ۔

خلاصہ پیامِ اقبال

اس طرح پیامِ اقبال کا خلاصہ جو بلا کسی ابہام اشارے یا رمز کے صاف صاف پیش کیا گیا ہے حسب ذیل ہے جو بعینہٖ تعلیمِ اسلام ہے۔

۱۔ وجود واجب الوجود کا اقرار اور توحید باری تعالیٰ پر مستحکم عقیدہ۔

۲۔ انسان کا اپنے وجود کا ایک الگ ہستی کی حیثیت سے احساس و ادراک و یقین۔

۳۔ تزکیہ وتہذیب وتزئین نفس کے لئے عالم میں خیر کی اشاعت وترویج کے لئے عقل پر بھروسہ نہ کرنا بلکہ نوامیسِ الہیہ کا پابند ہونا۔

۴۔ نوامیسِ الہیہ بذریعہ وحی ربانی آتے ہیں۔ اور آخری احکام بذریعہ وحی رسول اللہ ﷺ آئے اور آپ افضل البشر تھے۔ اور آپ کی اتباع میں انسان کی انفرادی وروحانی وجسمانی آراستگی اور عالم کی فلاح مضمر ہے۔

۵۔ ہر انسان کو مرد کامل یا مردِ مومن بننا چاہئے۔ اقبالؔ کی زبان میں مرد کامل اور مردِ مومن ایک ہی معنی کے دو الفاظ ہیں اور ہر مردِ مومن کا اولین فرض اعلاء کلمۃ اللہ ہے۔

۶۔ دنیا سے باطل کو مٹانے اور حق کو قائم کرنے کے لئے جہادِ باسیف ہر مومن کے لئے جائز ہے۔ لیکن اس کا محرک جوع الارض ہو تو وہ اسلام میں حرام ہے۔ اس میں اپنی کوئی غرض ذاتی یا قومی شامل نہ ہونی چاہئے۔ اور صرف رضائے حق مطلوب ہونا چاہئے۔

اس موضوع پر چونکہ اسلام کے بارے میں سخت غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ اس لئے اشارتاً اس کی تصریح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ عیسائی مشنریوں نے اسلام کو ایک خونخوار مذہب کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور اس کے جواب میں دانشورانِ اسلام نے بڑی بحثیں کی ہیں۔ لیکن اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ تمام نوع انسان عیال اللہ یعنی ایک گھرانہ ہیں اور مسلمان حزب اللہ ہیں۔ یعنی اللہ کے لئے۔ یعنی حق کے قائم کرنے کے لئے۔ جہاں کہیں ضرورت ہو اپنے جان ومال کی قربانی پیش کریں اور اسی کا نام جہاد ہے۔ دینوی جنگ میں خوں ریزی کرنا کسی طرح اسلام نے جائز قرار نہیں دیا۔ اور جہاد کے شرائط مدون میں اسلام کی تعلیم ہے کہ اگر کسی شخص نے ایک انسان کو قتل کیا اور اگر کسی نے ایک انسان کی جان بچائی تو گویا بنی نوع انسان کی جان بچائی۔ ایسی صورت میں کہاں ممکن ہے کہ اسلام قتل و خوں ریزی کی اجازت دے۔ یہ تعلیم عقیدت مندوں کے لئے اس درجہ عام ہے کہ اسے ہر عامی سمجھتا اور جانتا ہے۔ پرانی باتوں سے درگزر کر کے میں بالکل اس زمانے کی مثال دیتا ہوں۔ محمد علی کلے مشہور رستم عالم مکہ باز کو جب جبری بھرتی کے ذریعہ ویت نام میں جا کر لڑنے کا حکم ہوا تو اس نے انکار کیا۔ یہ امریکہ کا ایک نومسلم حبشی ہے۔ پہلے اس کا نام کیشیس کلے تھا۔ اس نے عالم میں مکے بازی کا ریکارڈ قائم کیا اور بڑے بڑے پہلوانوں کو منٹوں میں زمین دوز کر دیا۔ عالمی چیمپین کی حیثیت سے اس کو ایک معتد بہ رقم ملتی تھی اور

گاہے گاہے مکہ بازی میں حصّہ لینے کے سلسلے میں لاکھوں ڈالر الگ ملتے تھے۔ اس انکار کی بنا پر اس سے رستمِ عالم کا خطاب چھین لیا گیا۔ اسے مکہ بازی کے اکھاڑوں میں اترنے سے ممنوع کر دیا گیا اور اس پر قید و جرمانہ کی سزا دی گئی۔ جس کی اپیل دائر ہوئی۔ لیکن یہ سب قربانیاں اس نے دیں اور جادۂ حق سے انحراف نہیں کیا۔ اگر کوئی گنجائش ہوتی تو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اسی طرح ایک جگہ وہ گیا۔ اخباری نمائندوں نے اسے گھیر لیا اور کیشیس کلے کے نام سے پکار کر سوال کرنے لگے تو وہ خاموش رہا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ جب محمد علی کلے کے نام سے ایک نمائندے نے پکارا تو وہ بولا اور اس سوال کے جواب میں کہ اس کا کیا مذہب ہے اس نے کہا کہ میرا مذہب اسلام ہے اور کیسی مختصر اور جامع توضیع اسلام کی کی کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنی رضا کو رضائے الٰہی میں گم کر دیا ہے۔ یہ ہے وہ بے غل و غش اسلام جو سرچشمہ کے صاف پانی کی طرح نمایاں ہے۔ اگر مومن کی حیثیت یہ ہے کہ وہ اپنی رضا کو رضائے الٰہی میں گم کر دے تو پھر حرص و ہوس کی گنجائش ہی کہاں باقی رہتی ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک مومن بجز رضائے الٰہی کے اور کسی غرض کے لئے تشدد کا استعمال کرے۔ اسلام نے بیشک تشدد کو جائز کیا ہے۔ لیکن اس کے لئے ایک مجبوری بھی ظاہر کر دی ہے۔ قرآن نے قتل کو ایک بہت ہی قبیح چیز قرار دیا ہے۔ لیکن کیونکہ فتنہ اور فساد قتل سے بھی زیادہ قبیح اور معیوب ہے۔ لہٰذا اسے مٹانے کے لئے تشدد جائز کیا گیا ہے۔ اقبالؔ اسی تصور کا حامی ہے۔

۷۔ اقبالؔ نے اس تصور کی بھی تردید کی ہے جب وحی آنا بند ہو گئی اور نبی علیہ السلام نے اس دنیا سے ظاہری پردہ فرمایا تو ان کے وارث علماء ہوئے وہ پوری دنیا کو خاتم النبیین کا وارث قرار دیتا ہے۔ ع

اے ترا حق خاتم اقوام کرد — پر تو ہر آغاز کا انجام کرد
طرح عشق انداز انور جاں خویش — تازہ کن یا مصطفیٰ پیمانہ خویش

یعنی اے ملتِ اسلامیہ جسے حق تعالیٰ نے خاتم اقوام بنایا اور ہر آغاز کا انجام تیرے اوپر ہوا۔ اپنی جان میں طرح عشق کی بنیاد ڈالی اور جنابِ سرورِ کائنات محمد مصطفےٰ ﷺ سے جو پیمان کیا تھا اسے تازہ کر۔ لب لباب یہ ہے کہ تو ہی نبی علیہ السلام کی وارث ہے۔ وہ ہر مسلمان کو اس وراثت کے فرائض انجام دینے پر ایک ہے۔ وہ فرد و ملت کا ایک رابطہ قائم کرتا ہے۔ اور صرف فرد کو صوفیائے کرام کے مسلک کے خلاف حقیقی اہمیت نہیں دیتا۔

صوفیائے کرام فرد کی تہذیبِ نفس سے آگے نہیں جاتے۔ وہ ملت کی بھی اسی نہج پر تعمیر کرتا ہے تا کہ عالم کو سنوارا جا سکے۔ اور فرد کو ملت سے الگ دیکھ ہی نہیں سکتا۔ ع

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا سے اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اس کا مطلب یہ ہرگز نہ لینا چاہئے کہ وہ مارکسی عقیدے کے مطابق فرد کے تشخص و اہمیت ہی کا قائل نہیں ہے۔ مگر اس پر آگے چل کر مفصل بحث ہوگی۔

۸۔ آج جارحانہ وطن پرستی نے اقوامِ عالم کو ٹکڑوں اور ٹولیوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور ہر مظبوط کمزور کو ہضم کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ بے ایمانی، دروغ بانی، ستم پروری، ظلم و تشدد کچھ بھی ہو وطن کے لئے جائز ہے۔ وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل ہندوستان نے بنارس کے راجہ جیت سنگھ پر ظلم ڈھا کر اس سے رقم وافر وصول کی، بیگمات اودھ کو کمرے میں بے آب و دانہ بند کر کے ان کے زیورات انہیں بیگمات کے لڑکوں سے چھنوائے۔ کیوں؟ اپنے لئے نہیں بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا خزانہ خالی تھا اسے بھرنے کے لئے۔ پارلمینٹ کے ممبر برک نے برطانوی پارلمینٹ کے اندر اپنی شہرہ آفاق تقریر میں وارن ہیسٹنگز پر مقدمہ چلانے کی تجویز پیش کی۔ وزیرِ اعظم ولیم پٹ نے تجویز منظور کر لی، اور عدالت میں مقدمہ چلا۔ اس زمانے کے بہترین مقرر نے جو بیرسٹر بھی تھا۔ ثبوت کی جانب سے پیروی کی۔ پہلے اس نے ماں کے درجہ کو بتلایا۔ اسے پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے ہم عرشِ اعلیٰ کی جانب پرواز کر رہے ہیں۔ پھر کہا کہ اگر کوئی نالائق بیٹا ایسا ہو کہ ماں کو ستائے تو اسے کیا سمجھا جائے گا۔ عدالت کے کمرے میں ہر شخص پر ایک سکتہ طاری تھا اور کوئی یہ یقین کرنے کو تیار نہ تھا کہ کوئی ایسا نالائق فرزند بھی ہو سکتا ہے۔ پھر اس نے کہا کہ ماں بھی محبت کرنے والی بیٹا بھی اطاعت شعار وہ انسان کیسا ہوگا کہ بیٹے کو مجبور کرے کہ وہ ماں پر ستم ڈھائے اور اس کے زیورات چھینے۔ اس پر عورتیں چیخ چیخ کر بیہوش ہو گئیں اور روایت ہے کہ خود وارن ہیسٹنگز زیرِ لب بڑبڑایا کہ ''میں اس روئے زمین کا سب سے بڑا مجرم ہوں'' لیکن عدالت نے وارن ہیسٹنگز کو صاف بری کر دیا۔ اور سات سال جو مقدمہ چلا تھا۔ اس کی پوری تنخواہ بھی دے دی اور بعد کو اسے لارڈ کا بھی خطاب ملا۔ یہ کس لئے؟

کیا الزامات ثابت نہ ہو سکے، کیا واقعات غلط دریافت ہوئے، جی نہیں! عدالت نے کہا کہ مجرم پر کل الزامات ثابت ہیں لیکن اسے بری اس لئے کیا کہ اس نے جو کچھ کیا

اپنے لئے نہیں کیا بلکہ قوم کے لئے کیا۔ یعنی قوم کے لئے بدترین جرم بھی جائز ہیں۔ میں نے اس واقعہ کو کس قدر وضاحت سے اس لئے بیان کیا ہے کہ بے حیائی اور ڈھٹائی کے ساتھ وطن کے لئے ہر برائی اور بے ایمانی اور ستم پروری کو جائز قرار دینے کی اس سے بدتر مثال شاید ہی مل سکے۔ اس کے مقابلے میں تاریخ اسلام کا ایک واقعہ کتنا سبق آموز ہے۔ جسے علامہ شبلی نعمانی نے نظم بھی کیا ہے۔ انگریز مورخین بڑی مدح سرائی کے ساتھ لکھتے ہیں کہ جس سرعت کے ساتھ حضرت عمرو بن العاص نے خلیفہ دویم حضرت عمرؓ کے زمانے میں صحرائے سینا کو عبور کر کے مصر کو فتح کیا۔ اس کی مثال نپولین کے سوا کسی کی زندگی میں نہیں ملتی۔ فتح کے بعد انہیں کو مصر کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ ان کی گورنری کے زمانے میں ایک دن یہ ہوا کہ ایک قبطی اور ان کے لڑکے نے گھوڑے دوڑائے اور جب قبطی کا گھوڑا آگے نکل گیا تو حضرت عمرو بن العاص کے صاحبزادے نے اسے کوڑوں سے پیٹا۔ قبطی سیدھا دربارِ خلافت گیا اور فریاد کی اور یہ بھی کہا کہ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ فوراً حضرت عمرؓ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور کہا کہ اے خدا گواہ رہنا کہ میں ظلم سے بری ہوں۔ اور پھر باپ بیٹے دونوں کو طلب کر کے مجلسِ شوریٰ کے سامنے قبطی کو کوڑا دے دیا۔ اور اس نے حضرت عمر بن العاص کے بیٹے کو پیٹا۔ حضرت عمر کوڑے کی ہر ضرب پر گرماتے تھے اور کہتے تھے کہ ہاں لگے کوڑا یہ بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ جب صاحبزادے پٹ چکے تو حضرت عمرؓ نے قبطی سے کہا کہ باپ کی بھی کوڑے سے خبر لے مگر اس نے انکار کیا یعنی اگر وہ انکار نہ کرتا تو خود حضرت عمر بن العاص ایک غیر مسلم قبطی کے ہاتھوں صرف اس جرم میں کہ ان کی گورنری میں ایسا واقعہ کیوں پیش آیا کوڑوں سے پیٹے جاتے۔ آخر خلیفہ دویم نے حضرت عمر بن العاص کو مخاطب کر کے وہ کلاسکی جملہ کہا ہے کہ جو کئی صدیوں کے بعد فلسفہ سیاست کی بنیاد بنا۔ فرمایا۔ افسوس تم کن لوگوں کو طوق غلامی پہنا رہے ہو ان کی ماؤں نے تو ان کو آزاد جنا تھا۔

اقبالؔ اگرچہ اصلاح فساد اور قیامِ حق کے لئے جہاد کو جائز سمجھتا ہے تاکہ ملت اسلامیہ اس فریضہ سے غافل نہ ہو جائے اس کو طرح طرح سے بڑے زوردار اور پرجوش لفظوں میں ذہن نشین کراتا ہے لیکن اس کی تعلیم ہے کہ نبی آخرالزماںؐ کی رسالت کا مقصد ہی تشکیل و تاسیس حریت و مساوات و اخوت بنی آدم تھا۔ اور یہی ہے عیال اللہ کا وہ فلسفہ جو اسلام کا ایک مسلمہ بنیادی عقیدہ ہے اس لئے وطن کو اساس ملت قرار دینے کا منکر ہے۔ وہ

کہتا ہے کہ انسان کو وطنی نہیں عالمی بننا چاہئے۔ اسے تمام عالم کو اپنا وطن تصور کرنا چاہئے۔ اور قید مکانی سے آزاد ہونا چاہئے۔

یہ ہندی و خر اسانی یہ ایرانی وہ افغانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہوجا
غبار آلودۂ رنگ ونسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہوجا
خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہوجا

لیکن یہ قید مکانی سے آزادی ایک اصول کے ماتحت ہوگی۔ ملت اسلامیہ کا تعلق اگرچہ بنی نوع انسانی سے محبت صلح وآشتی کا ہوگا۔ لیکن ملت اسلامیہ فرد اور ملت کی خودی سے مزین ہوکر عالم میں کارفرما ہوگی۔ چنانچہ اس کے لئے ایک آئین کی ضرورت ہے وہ آئین کیا ہوگا؟ اسے عقل ترتیب نہیں دے سکتی بلکہ خود خالقِ موجودات کا فرمان ہوگا جسے جا بجا نوامیسِ الٰہیہ کہا گیا ہے اور وہ ہے قرآن یعنی ملت اسلامیہ قرآن کا آئین بن کر عالم میں جلوہ گر ہوگی اور انسان کی بلندی ورفعت وصحیح کارگردگی کا ایک نمونہ پیش کرے گی۔

آج ایک خواب معلوم ہوگا جب اسلامی مملکتیں ایک دوسرے سے رشک ورقابت میں مبتلا ہیں۔ اور خود جزیرۃ العرب ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے۔ اور صیہونی خطرے کے مقابلے میں متحد نہیں ہوسکتا ہے لیکن اقبالؔ نے جس دور میں اپنا نغمہ سنایا اس وقت اگرچہ ضعف وانحطاط حد درجہ کا آگیا تھا، لیکن ''مردِ بیمار'' کے جانبر ہونے کی امید بھی باقی تھی۔ اور اقبال کا اتحاد اسلام کے نعرے کا زبردست داعی محض سیاست کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ وہ اصولاً اس کا معتقد ہے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر
تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب وجگر

وہ مایوس ہونا تو جانتا ہی نہ تھا۔ چنانچہ سخت بحران کے زمانہ میں طلوع اسلام کی نظم لکھی ہے اور شروع سے آخر تک امید کا پیغامبر رہا ہے۔ قطعہ

نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خون گل چیں سے کلی رنگیں قبا ہوجائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی
دیکھ لوگے سطوتِ رفتار دریا کا مآل
موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہوجائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ
تونے دیکھ سطوتِ رفتار دریا کا مآل
موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ
کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ
آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائیِ تدبیر دیکھ
مسلم استی سینہ را از آرزو آباد را
ہر زماں پیشِ نظر لا تخلف المیعاد را

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوع فردا کا منتظر رہ کہ دوش وامروز ہے افسانہ
ہوائیں ان کی، فضائیں ان کی، سمندران کے، جہاز ان کے
گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر بھنور ہے تقدیر کا بہانہ

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی نے بنایا ہے قمار خانہ
ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دئے ہیں اندازِ خسروانہ

لیکن تحریک اتحاد اسلام کے تاریخی پسِ منظر سے قطع نظر اصولی طور پر اقبالؔ ملت اسلامیہ عالم کی انفرادی واجتماعی خودی کی بنیاد پر تعمیر کی تعلیم دیتا ہے اور اس کے لئے کوئی وقتی وزمانی مسئلہ محل غور نہ ہونا چاہئے۔

۹۔ ملت اسلامیہ کا نصب العین اقبالؔ کی نگاہ میں حفظ ونشرِ توحید ہے اور یہی عقیدہ ہے جو اسلام کا سنگ بنیاد ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ شروع زمانے سے ہر ملک اور ہر خطہ میں تمام عالم کے اندر انبیائے کرام اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوئے اور ان کی بعثت کی غرض اولین توحید کی تعلیم وتبلیغ تھی۔ چنانچہ مقامی اور زمانی احکام بذریعہ الہام آتے رہے PARTIAL AND LOCAL REVELATION اور آخر میں خاتم النبیین محمد الرسول اللہ ﷺ معبوث ہوئے۔ جن کی تعلیم قیامت تک کے لئے مکمل تھی اسی کو وہ اپنی شاعرانہ اور فلسفیانہ زبان میں طرح طرح سے بیان کرتا ہے تاکہ ذہن نشین ہو جائے۔ چنانچہ پیغمبرِ اسلامؐ چونکہ آخری اور کامل احکام نبی تھے۔ اور آپ کے بعد دین کے مکمل ہونے کی وجہ سے الہام تا قیامت بند ہو گیا اس لئے آپ ہمیشہ کے لئے پوری امت کے لئے اسوۂ حسنہ اور نمونہ عمل ہیں اور آپ ہی کی اتباع میں فرد کی تہذیب اور ملت کے سنورنے کا کام انجام پا سکتا ہے۔ ع

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اونہ رسیدی تمام بولہبی است

کس قدر صاف اور واضع طور پر کہتا ہے کہ عشق واتباع رسول ہی میں تمام دین مضمر ہے اور اگر یہ بات حاصل نہ ہوئی تو سب باطل پرستی اور خسارہ کی چیزیں ہیں۔ چنانچہ رسالت مآبؐ کی سیرۃ مبارکہ کو اعتقاد اور عمل دونوں کا ''سدرۃ المنتہیٰ'' قرار دینا اقبالؔ کے افکار عالیہ کا خلاصہ ہے وہ خود جہان جہاں حیلے تراش کر عشق رسولؐ کے مظاہرے کرتا ہے۔ اور اگر اس کے کلام کا نچوڑ دو لفظوں میں بیان کرنے کو کہا جائے تو اسے ''عشق رسول'' کہہ کر ختم کیا جا سکتا ہے۔

اقبالؔ اور دانش ورانِ عالم

اقبال کا احوال یہ ہے کہ ع

گفت حکمت را خدا خیر کثیر ہر کجا ایں خیر را یابی بگیر

یا جیسا کہ مولانا حالیؔ نے کہا ہے ع

حکمت کو اک گم شدہ لال سمجھو جہاں جاؤ اپنا اسے مال سمجھو

چنانچہ ہوشو پن ہار نیطشے، ٹالسٹائی، کارل بارکس، ہیکل مزوک حکیم، آئن سٹائن، بائرن، گیٹے، لینن، لاک، کانٹ گساں سب کی مدح و مذمت میزان عمل قرار دے کر کرتا ہے۔ اور جہاں جہاں ان کا مطالعہ حیات و کائنات اقبال کے پیام عشق اور دلِ بیتاب سے مماثلت رکھتا ہے، وہاں وہاں اسے سراہا ہے اور جہاں غلط پایا ہے رد کر دیا ہے۔ گویا فلسفہ اور ادب دونوں کے مطالعہ کے لئے طالبانِ حق کو عرفانِ کامل عطا کیا ہے۔ چنانچہ بطور مثال حکیم نطشہ پر یوں لکھا ہے ع

حریف نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم نگاہ چاہئے اسرارِ لاالٰہ کے لئے

خدنگ سینۂ گردوں ہے اس کا فکر بلند کمند اس کا تخیل ہے مہر و مہ کے لئے

اگرچہ پاک ہے طینت میں راہی اسکی ترس رہی ہے مگر لذتِ گنہ کے لئے

دوسری جگہ نیطشے کو ان الفاظ میں یاد کیا ہے ع

نیشتر اندر دل مغرب فرد آنکہ ہر طرح حرم بتخانہ ساخت

نیستر اندر دل مغرب فرد قلب او مومن دماغِ کافر است

اس کی تشریح خود اقبالؔ کی زبان سے سنئے جو حاشیہ کے طور پر درج ہے۔

نیطشے نے نصرانیت پر ایسا زبردست حملہ کیا ہے کہ یہ مذہب اس حملہ سے بمشکل جانبر ہو سکے گا۔ نیطشے کی تنقید نصرانیت خالص اسلامی نکتۂ خیال سے ہے۔ اس کا دماغ اس واسطے کافر ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے۔ مگر بعض اخلاقی نتائج میں اس کے افکار مذہب اسلام سے بہت قریب ہیں۔ قلب و مومن دماغش کافر است نبی کریمؐ نے اسی قسم کا جملہ امیہ ابن (عرب شاعر) کی نسبت کہا تھا۔ آمن لسانہٗ وکفر قلبہٗ ہیگل کے متعلق کہتا ہے۔

ہیگل کا صدف گہر سے خالی ہے اس کا طلسم سب خالی

افلاطون کو گو سفندانِ قدیم میں شمار کیا ہے۔ لیکن وہ استفادہ سب سے کرتا ہے اور جہاں جہاں اسے حقیقت کے موتی ملتے ہیں اسے چن لیتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ خوب

وزشت کے امتیاز میں اس کا کوئی اصول نہ ہو۔ وہ اپنا نظریہ حیات مکمل طور پر بنا چکا ہے اور وہی اس کا میزان ہے اور وہ کسی کا مقلد نہیں ہے چنانچہ وہ کہتا ہے۔

زمانے با ارسطو آشنا باش　　دمے با ساز بیکن ہم نواباش
ولیکن از مقام شاں گزر کن　　مشو گم اندریں منزل سفر کن

یعنی ارسطو اور بیکن سب سے فائدہ اٹھاؤ لیکن یہ مقامات حقیقی نہیں ہیں ان میں گم نہ ہو اور آگے چلو۔ اس طرح افرنگ یا مغرب جس کی تردید کے لئے اس نے کمر باندھی ہے۔ اس کا بھی اس سے زیادہ کوئی نہ ہوگا۔

یادایامے کہ بودم درخمستانِ فرنگ　　جام اور روشن تراز جام و جم واسکندراست
چشم مست مے فروشش بادہ را پروردگار　　بادہ خواراں را نگاہِ ساقی اش پیغمبراست
جلوۂ ادبے کلیم و شعلہء او بے خلیل　　عقل نا پروا متاعِ عشق را غارت گراست
در ہوایش گرمی یک آہ بیتابانہ نیست　　رندایں میخانہ را یک لغزشِ مستانہ داست

یعنی ایک زمانہ تھا جب میں خمستانِ فرنگ کا بادہ وار تھا مگر روشنی نمودار ہونے کے بعد نظر آیا کہ باوجود اس کے جامِ فرنگ جامِ جم و جام اسکندر سے روشن تر ہے مگر آہ بیتابانہ ولغزشِ مستانہ سے خالی ہے۔

اقبال ایک بڑا آرٹسٹ ہے اور وہ اپنے نظریات کو کبھی ابلیس کی زبان سے کہتا ہے کبھی ابوجہل کی زبان سے، کبھی خدایانِ کہن کے نغمے سے اسے اجاگر کرتا ہے اور کبھی دانشورانِ عالم سے لب کشائی کراتا ہے، چنانچہ وہ واقعہ تخلیق کرتا ہے کہ لینن جو شدت سے منکرِ خدا تھا جب مرتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس کے جذبات بے بنیاد تھے اور حقیقۃ الحقایق نمایاں ہے چنانچہ وہ بارگاہِ رب العزت میں عذر پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تجھ کو کیسے جانتا، کیسے پہچانتا۔ کیونکہ مشرق غلامِ مغرب اور مغرب زر پرست ہو گیا تھا۔ یہ نظم مشرق کی ''غلامی افرنگ'' اور مغرب کے عملی فلسفہ حیات کا ایسا نادر نقشہ ہے کہ ہر بات ذہن میں سمائی جاتی ہے۔

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات
آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات

اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل رہ نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدمِ خاکی کہ ہے زیرِ سمٰوات
مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ قلزات
یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیِ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کے عمارات
ظاہر میں تجارت حقیقت میں جوا ہے
سود ایک تو لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
یہ کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کے فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

اقبالؔ میں تعصب اور تنگ نظری نام کو نہیں ہے وہ خم خانۂ مشرق و مغرب کے ہر بادہ گلفام کو چکھتا اور مزے لیتا ہے اور انتخاب پر عمل کرتا ہے۔ اس سے حکمت اور دانائی کی بات جہاں ملے اسے قبول کرنے سے انکار نہیں۔ چنانچہ جس طرح وہ بائرن اور شیکسپیر وغیرہ شعرائے عظام اور فلاسفہ کا ذکر کرتا ہے اسی طرح مشرق کے دانشوروں کو بھی فراموش نہیں کرتا۔ جاوید نامہ جو بعض کے نزدیک اقبالؔ کا شاہکار تسلیم کیا گیا ہے (اور بعض پیام مشرق کو شاہکار مانتے ہیں) اس میں اقبالؔ نے آسمانوں کا سفر کیا ہے اور وہاں جن لوگوں سے ملے ہیں ان سے گفتگو کی ہے ان میں "جہاں دوست" اور "عارف ہندی" بھی ہیں۔ جہاں دوست

کے بارے میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مراد وشوامتر جی سے ہے اور کچھ کا خیال ہے کہ اس سے شیواجی مراد ہیں۔

بہر حال کوئی ہوں زمانہ اسلام کے قبل کے بزرگ ہیں جن کی دانائیاں کتابوں میں محفوظ ہیں اور جن کو مسخ کر کے اب الوہیت کا درجہ دیا گیا ہے۔ عارفِ ہند سے مراد مشہور فلسفی وشاعر بھرتری ہری ہیں جن کو ہندوستان میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ لیکن اگر اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ اقبال اپنے تصورات حیات میں ان باتوں سے کہیں بھی متزلزل ہوتا ہے تو شدید غلطی ہوگی۔ وہ کوئی دریوزہ گر نہیں ہے کہ اپنے کدو میں بھیک مانگ کر رنگ برنگ کی شراب جمع کرلے۔ اس کا جام از تاک بادہ گیرم دور ساغر افگنم سے پرے ہے۔ اور اس میں قطرے کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ وہ ہر ایک باریک نکتہ اور ہر دانائی کی بات کی داد ضرور دیتا ہے۔

اقبال کے آرٹ کا ایک کرشمہ ابو جہل کا نعرہ ہے۔ جو درحقیقت نعت ہے۔ اس طرح کی نعت کسی اور شاعر نے کبھی نہیں لکھی۔ ظاہر میں تو ابو جہل شکایت کناں ہے اور لات ومنات سے فریاد کر رہا ہے کہ وہ خانہ کعبہ سے نہ جائیں اور اگر وہاں سے جائیں تو ہمارے دل سے نہ جائیں۔ اسی طرح وہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کا شاکی ہے لیکن شکایت میں عظیم مدح پنہاں ہے۔ شکایت ایک یہ ہے کہ۔ ع

با غلام خویش بر یک خواں نشست

یعنی اپنے غلام کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے۔

تسخیر فطرت یا علم وعشق

آج کی متمدن دنیا کے نقش ونگار کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ ابتدائے تاریخ سے قبل کے انسان کا رہن سہن کیا رہا ہوگا۔ لیکن ایک دور وہ بھی تھا جب وہ غاروں اور درختوں کے سائے کے نیچے گزر بسر کرتا تھا۔ اور گھاس پھوس اور کچا گوشت کھاتا تھا۔ اس نے ابھی آگ دریافت نہیں کی تھی کہ کھانا پکاتا، کپڑا بننا نہیں جانتا تھا اسلئے یا تو ننگا رہتا تھا یا درختوں کی چھال پہن لیتا تھا۔ لیکن وہ ادراک احساس حواس خمسہ سے قدرتاً بہرہ ور تھا۔

اور اسی کا دوسرا نام عقل ہے جو اس میں ودیعت کی گئی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے کو اور دنیا کو سنوارنے میں بتدریجی منزلیں طے کرنی شروع کیں۔ آگ دریافت کی اور کچے گوشت کو بھون کر کھایا۔ غذا کے معاملے میں یہ اس کا پہلا قدم تھا اور اس کے بعد وہ روز بروز نئی دریافتیں کرتا رہا۔ انسان کے اندر آرزو اور جستجو اس طرح کوٹ کوٹ کر بھری تھیں کہ وہ اس کی طبیعتِ ثانیہ بنی ہوئی تھی۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بچہ ہر چیز کی دریافت و جستجو میں لگا رہتا ہے گویا یہ مادہ انسان کے خمیر میں ہے۔ اور اسے طبیعت ثانیہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ یہ اس کی اصلی طبیعت اور مزاق ہے۔ جس عالمِ آب و گل میں اسے رہنا تھا اور جس ماحول میں اسے زندگی گزارنی تھی وہ اس کے راستہ میں رکاوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ بڑی بڑی جھاڑیاں، گھنے جنگل، مہیب غار، دریا اور پہاڑ، کہاں جائے اور کیا کرے! نیچر یعنی فطرت اس کی دشمن تھی۔ اس نے اسے اس سے لڑنے اور اس کو قابو میں کرنے کی تمنا پیدا کی اور تمنا اس کی تخلیق میں مضمر تھی۔ اس تمنا کے لئے اسے کسی عالم کے وعظ، کسی فلسفی کی تقریر، کسی جوش اور ولولہ دلانے والے خطبہ کی ضرورت نہ تھی۔ وہ بہ تقاضائے فطرت اس میں منہمک ہو گیا اور اس کے یلغار کے سامنے یہ کائنات فطرت سرنگوں ہوتی چلی گئی۔ اس کی فتوحات کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس نے لوہے کی دریافت کی کلہاڑے بنائے، جنگلوں کو کاٹا کشتیاں بنائیں اور دریاؤں کو پار کیا۔ اس کی تسخیر فطرت کے میدان عمل کا بڑا کامیاب دن تھا جب اس نے دانہ زمین میں ڈالا اور غلہ اگایا زراعت موجودہ دورِ تمدن کی منزلِ اولین تھی اب وہ جہالت اور کم علمی کے ظلمات سے باہر نکل رہا تھا۔ اور علم و شعور کی ہلکی ہلکی شعاعیں اسے نظر آنے لگی تھیں۔ اس نے پھر غلہ کا استعمال سیکھا اور طرح طرح کے کھانے تیار کرنے شروع کئے۔ ان سب باتوں کو سکھانے کے لئے کوئی استاد نہ تھا نہ کوئی کتاب تھی نہ معلم تھا نہ مدرسے اور کالج تھے۔ خود ان کے اندر موجود عقل کی رہنمائی اور خود اپنے تجربات ان کے لئے مشعل راہ تھے۔ رفتہ رفتہ اس نے ترقی کی ارتقائی منزلیں طے کیں اور آج خوشنما باغ و بہار پارک اور ہوٹل طرح طرح کے لذیز کھانے، انواع و اقسام کے ظروف، رہنے کے لئے عمدہ سے عمدہ مکانات، استراحت کے لئے نرم ملائم گدے اور مسہریاں، چلنے کے لئے تیز رفتار سواریاں، مرض پر قابو پانے کے لئے دوائیں، پرسکون زندگی گزارنے کے لئے قوانین و دستور حیات کے لئے آئین موجود ہیں۔ الغرض اس نے کیا کیا نہیں کیا۔ کہاں وہ دریا سے ڈرتا تھا اور اس پار سے اس پار جانا محال تھا۔ اور کہاں اس نے دریا کے پانی کو نہ صرف کھیتوں میں پہنچایا بلکہ اس سے بجلی نکالی اور راستوں

اور گھروں کو روشن کر دیا۔ اس نے بجلی سے مزدور کا کام لیا۔ اس نے اپنے بدن گرم کیے، کھانا پکایا، لکڑی چیری، گیہوں پیسا اور طرح طرح کی خدمات لیں۔ کہاں وہ پہاڑ کو ناقابلِ عبور سمجھتا تھا اور کہاں اس نے ڈائنامائٹ سے پہاڑوں کو روئی کے گالوں کی طرح اڑا دیا۔ کبھی ہمالیہ "فصیل کشورِ ہندوستان" تھا۔ اب ہمالہ انسان کی حفاظت کا محتاج ہے۔ اس نے سمندروں کو مسخر کر کے دخانی جہازوں سے اس کی موجوں کو روند ڈالا۔ اس نے ہوا کو مسخر کیا اور ہزاروں میل فی گھنٹہ ہوائی جہازوں پر پرواز کرنے لگا۔ زراعت کے بعد صنعت کی نوبت آئی اور اس نے سارے عالم کو نگار خانہ بنا دیا۔ اور معاش و راحت کے نئے نئے راستے پیدا کیے۔ انسان کی طبع ناصبور آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک وسیع میدان ہے۔ ایک لمحہ اس کو چین نہیں۔ نت نئے فتوحات وہ کرتا رہتا ہے اور آسمانوں پر کمند ڈالتا ہے۔ آج اس کی پرواز کوہِ باد سے پرے خلا میں ہے اور چاند، مریخ، زہرہ تک پہنچنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ آج وہ ہزاروں میل دور لوگوں سے بات بھی کرتا ہے اور ان کی شکل بھی دیکھتا ہے۔ طلسمِ ہوش ربا کے افسانے آج حقیقت بن کر سامنے ہیں۔ یہ سب علم انسانی کے کرشمے ہیں اور عقل کے معجزے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جس کو پانچ چھ سو سال سے زیادہ نہیں ہوئے جب علم انسانی اتنا محدود تھا کہ حکیم یا ڈاکٹر کا درجہ اس کو ملتا تھا جو تمامی علوم پر حاوی ہو۔ چنانچہ بوعلی سینا حکیم نہیں کہا گیا بلکہ شیخ کہلایا اور روایت ہے کہ صرف اسی لئے کہ وہ موسیقی نہیں جانتا تھا۔ آج علم و فن نے اتنی ترقی کی ہے کہ ایک ایک شاخ میں متعدد شاخیں ہیں اور انسان اپنی قلیل مدت حیات میں ایک شاخ ہی میں کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ کل شاخ پر نظر ڈالے اور کل موجودہ علم کا احاطہ تو تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ علم کو آرٹ اور سائنس میں تقسیم کر کے ہر ایک کی بے شمار شاخیں اور شاخوں کی شاخیں ہیں۔ مثال کے لئے صرف علم الابدان کو لے لیجئے تو اس میں طب اور جراحت کے دو بڑے شعبے ملیں گے اور ہر ایک میں الگ الگ مضامین ہیں۔ اگر آج آپ کسی کو ڈاکٹر کہہ دیں تو سننے والا اگر ہوشیار ہے تو کچھ سمجھ نہ سکے گا کہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ ابھی صرف تیس سال قبل ڈاکٹر سے یہ مراد لی جاتی تھی کہ وہ ہر مرض بلکہ طب و جراحت کے ہر شعبے کا ماہر ہے۔ آج آنکھ کے ڈاکٹر، کان کے ڈاکٹر، حلق کے ڈاکٹر، پھیپھڑے کے ڈاکٹر، قلب کے ڈاکٹر، ہڈی کے ڈاکٹر، الغرض ہر ہر عضو کے الگ الگ ڈاکٹر ہیں۔ اگر بدقسمتی سے آپ بیمار ہو کر آپ کسی ماہر طبیب (ڈاکٹر) کے پاس لکھنؤ چلے جائیں تو وہ آپ کو مختلف ماہرینِ فن کے پاس بھیج کر رپورٹیں لے گا اور تب کوئی رائے قائم کر سکے

گا۔ اگر آپ قبض جیسے معمولی اور عالمگیر مرض میں مبتلا ہیں تو وہ دانت کے ڈاکٹر کی رپورٹ لے گا کہ دانتوں میں پائریا یا اس قسم کی کوئی بیماری تو نہیں ہے جس سے معدہ پر اثر پڑ رہا ہے۔ اگر بخار ہے تو خون کا معائنہ کرائے گا، تھوک کا معائنہ کرائے گا۔ الغرض علم کی وسعت اور پنہائیوں کی وجہ سے ہر ماہر فن ایک جزو بن کر رہ گیا ہے اور دوسرے ماہرِ فن کا محتاج ہے۔ اور یہ مشورہ دے کر کہ آپ فلاں سے اس معاملے میں مشورہ کر کے رپورٹ لائیے اپنے عجز اور اس شاخِ علم سے ناواقفیت کا اظہار کرتا ہے۔

مادہ پرستوں کا خیال ہے کہ انسان اصل نقطہ اس کائنات کا ہے اور وہ زیور علم سے آراستہ ہے۔ اس علم کی بدولت وہ فطرت کی تسخیر کر رہا ہے۔ فطرت اس کی دشمن ہے اور یہی تنہا اس کی دشمن ہے اور جب وہ کل فطرت کو مسخر کر لے گا تو وہ کامل ہو جائے گا۔ تکمیل انسانیت کے لئے علم اور عقل کے راستہ سے نیچر کو قابو کر لینا ہی کافی ہے اور ایک ماوراء المحسنات قادر مطلق ہستی کا تصور محض اس کے علم کی خامی اور اس کے لئے اپنی ضروریات زندگی میں مجبوری اور مجبوری کا دوسرا نام ہے۔ مثلاً جب تک انسان نے دریاؤں سے پانی کو نکال کر نہروں اور دیگر ذرائع سے کھیتوں کی آب پاشی کا طریقہ دریافت نہیں کیا تھا اور اس کی کھیتی کی نمود پرداخت کا انحصار صرف ابر باراں پر تھا تو پانی نہ برسنے کی شکل میں وہ عظیم الشان قادر مطلق ہستی کا تصور کر کے اس سے دعائیں مانگتا تھا کہ وہ پانی برسا دے لیکن جب اس نے نہر ٹیوب ویل اور دیگر ذرائع سے زمین اور دریا کو مسخر کر کے اور فنِ طبیعات اور انجنیرنگ سیکھ کر کھیتوں کو پانی سے بھر دیا تو اب وہ پانی برسنے کی دعا نہیں کرے گا۔ اس لیے علم کی کمی اور مجبوری کا نام خدا ہے۔ ورنہ خدا کا کوئی وجود نہیں۔

دوسری طرف مذاہب کا ایک گروہ جو وحدت الوجود جیسے عقیدے کا قائل ہے۔ وہ مادہ اور روح دونوں کے وجود سے انکار کرتا ہے۔ اور جب مادہ کا وجود ہی نہیں ہے تو تسخیر کس کی ہوگی۔ اور جب انسان کی انا یا خودی کا وجود ہی نہیں ہے تو تسخیر کون کرے گا اور کس لئے کرے گا۔ دوسرا گروہ مادہ کے وجود کا تو اقرار کرتا ہے لیکن اس سے گریز یا فرار کرتا ہے اور کنج عافیت میں بیٹھ کر سکون پرستی اور اللہ کی یاد میں گزار دینا چاہتا ہے۔ وہ فطرت سے آویزش کا قائل نہیں۔ اگرچہ تسخیر فطرت سے جو منافع حاصل ہوں اس سے مستفیض ہونے سے احتراز نہیں رکھتا۔ وہ اپنا گھر بجلی کے چراغوں سے روشن کرتا ہے لیکن بادلوں سے بجلی لانے کی مشقت سے منحرف ہے۔

اقبالؔ کا نظریہ جو عین اسلام کی تعلیم ہے اس کو ظاہر کرنے سے پہلے ایک اور امر کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے۔ انسان جب جنگلوں اور غاروں میں رہتا تھا تو اسے کسی

قانون یا دستور کی ضرورت نہ تھی یا یہ بات بھی اس کے شعور میں نہیں آئی تھی جس طرح وہ متمدن ہوتا گیا اور اس نے بڑے بڑے شہر بسائے اور مل جل کر رہنا سیکھا تو اس کو ضابطہء حیات کی حاجت ہوئی۔ انفرادی اور اجتماعی اور پھر دھیرے دھیرے نوبت یہاں تک آگئی کہ فوجداری مال دیوانی اور قولی سے آگے نکل کر بین الاقوامی قوانین بھی وضع کرنے پڑے۔ اس کو حل کرنے کے راستے کیا ہیں۔ حقوق اور فرائض کی ترکیب کیسے دی جاوے۔ جرائم کا انسداد اور ان کی سزائیں کیا ہوں۔ مختلف عقاید میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ صلح و امن کے کیا راستے ہیں۔ انہیں قوانین کے انضباط اور تدوین اور ان پر عمل درامد کے ضوابط کا نام تہذیب ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ مسائل کس طرح حل ہوں گے۔ دنیا کے ایک بڑے گروہ کا جس میں مادہ پرستوں کے علاوہ بہت سے مذاہب کے ماننے والے بھی شامل ہیں یہ خیال ہے کہ یہ مرحلے بھی عقل ہی طے کرے گی۔ انسانی عقل کل پر محیط ہے اور وہ انسان کی رہنمائی کے لئے کافی ہے۔

ایک تیسرا مرحلہ جدھر مادہ پرستوں کی توجہ اس لئے منعطف نہیں ہوئی کہ وہ مادہ کے سوا خدا اور روح کے قائل ہی نہیں ہیں اور وہ مرحلہ ہے خود انسان کے ذاتی اور شخصی اعمال کا جو قوانین کی زد میں نہیں آتے ہیں اور نہ ان کے بارے میں کوئی قانون مرتب کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ماں باپ کی اطاعت، اپنے چھوٹوں سے محبت، مبتلائے آلام و مصائب سے ہم دردی، احسان، عفو و درگزر کینہ حسد غیبت چغلی سے گریز وغیرہ وغیرہ اسی لئے مارکسزم میں کہیں انفرادی اعمال صالحہ کا اسی طرح کوئی وجود نہیں ہے جس طرح انفرادی آزادی کوئی چیز نہیں ہے سب کچھ مجموعی انسان کے فلاح و بہبودی میں مضمر ہے اور تسخیر کائنات کی غرض بھی یہی ہے کہ انسان آرام اور آسائش کی زندگی بسر کر سکے۔ انسان انسان میں فرق باقی نہ رہے۔ اور افلاس، بیماری، ایک انسان پر دوسرے انسان کی برتری دور ہو۔ الغرض اصل چیز انسان نہیں انسانوں کی سوسائٹی ہے۔

قرآن حکیم نے ان تمام خیالات و افکار کا جائزہ لیا ہے اور ایک سیدھی اور مستقیم راہ جو عام و خاص کی سمجھ میں آسکتی ہے وہ پیش کی ہے۔ اقبال نے اپنے فن کارانہ شعری مہارت سے اس کو بار بار زور کلام اور حسنِ بیان کی خوبیوں سے آراستہ کر کے پیش کیا ہے۔ علمائے اسلام نے سیدھے سادے الفاظ میں جو بات کہی تھی وہ یہ تھی کہ تمام عالمِ انسان کے لئے اور انسان، اللہ کی عبادت کے لئے بنایا گیا ہے۔ اسی کو وہ فلسفیانہ زبان میں عصر حاضر کے تقاضاؤں کو پورا کرتے ہوئے اشعار کے خوبصورت سانچے میں ڈھالتا ہے۔

جہاں تک تسخیرِ فطرت کا سوال ہے وہ پوری حد تک مادہ پرستوں کے ساتھ جاتا ہے۔ وہ انسان کے اندر علم و عقل کی بے پناہ طاقتوں کے پنہاں ہونے کا قائل ہے۔ اسی لئے وہ حرکت کا مدح خواں اور سکون کا مخالف ہے۔ جدوجہدِ زندگی میں وہ انسان کو ہر وقت آگے بڑھنے کے لئے کوڑے مارتا ہے۔ اور حیات کو بے ثبات تصور کر کے مغموم و دلگیر ہو کر کنجِ عافیت تلاش کرنے کو انتہائی معیوب تصور کرتا ہے۔ وہ انسان کو آرزوؤں کا مسکن مانتا ہے اور نت نئے انداز اور نئی شان سے اس کو جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہے۔ ع

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

چنانچہ اس نے شاعرانہ شوخی کے ساتھ محاورہ مابین خدا و انسان بھی تصنیف کیا ہے۔ اس سے مراد انسان کی قوتِ تسخیرِ فطرت کی پرزور نمائش ہے۔ خدا انسان کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ میں نے ایک آب و گل سے اس دنیا کو پیدا کیا۔ لیکن تو نے اسے ایران و تاتار و رنگ میں تقسیم کر دیا۔ میں نے مٹی سے لوہا بنایا تھا۔ تو نے اس سے شمشیر و تیر و تفنگ بنائے تو چمن کے درختوں کو کاٹنے کے لئے تبر بناتا ہے اور طائرِ نغمہ زن کے قفس تیار کرتا ہے۔

جہاں را زیک آب و گل آفریدم تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاکِ پولادِ ناب آفریدم تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہالِ چمن را
قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

انسان کی جب یہ شرارتیں بیان کی گئیں تو گو ان میں بھی اس کے علم و تسخیر کے کرشمے شامل تھے لیکن بمنزلہ شر کہے گئے تھے۔ اسلئے انسان نے جواب دیا کہ میری قوتِ تسخیر خیر کی جانب بھی مائل ہے اور میں نے وہ بڑے بڑے کارنامے انجام دئے جس نے تیری صنعت علم سازی کو جلا دی تھی۔ تو نے رات بنائی تھی اندھیری تھی میں نے چراغ بنا کر اسے روشن کیا، تو نے مٹی بنائی تھی میں نے جام بنایا، تو نے بیابان و کہسار اور نشیب و فراز زمین بنا دی تھی۔ میں نے اس کو خیاباں گلزار و باغ بنا کر آراستہ کیا۔ میں وہ ہوں جو پتھر سے آئینہ اور زہر سے نوشینہ تیار کرتا ہوں۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و زاغ آفریدی گلستان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

انسان کی یہ تعلّی جو دراصل حقیقت کی آئینہ دار ہے۔اس میں اقبالؔ نے صرف شوخی بھر دی ہے اور گستاخی کے ساتھ انسان کے کمالات فنِ تسخیر کو ظاہر کیا ہے۔

اس طرح کی شوخی و مستی وہ "پیامِ مشرق" میں اپنی نظر بہشت میں ظاہر کرتا ہے۔اقبالؔ کے نزدیک یہ دنیا حرکت اور جد جہد اور آرزوؤں کی تکمیل کی ہے۔آدم جب بہشت میں تھے تو ان کی زندگی میں کوئی طوفان نہ تھا۔وہ آرزو کی خلش سے آزاد تھے۔چنانچہ میلادِ آدم انکارِ ابلیس اغوائے آدم کے کئی عنوانات سے جو بشکل ڈرامہ اقبالؔ نے زیرِ عنوان تسخیر فطرت لکھا ہے۔اس کے آخر میں آدم کی زبان سے اسی حقیقت کا انکشاف کرایا ہے۔وہ اسی دنیا کو بہشت سے بھی زیادہ دلکش پاتے ہیں۔کیونکہ یہاں سوز و گداز ہے۔آسمانوں کا راستہ ڈھونڈنا اور ستاروں کو رازدار بنانا ہے۔یہ وہ زندگی ہے جس میں تغیر ہے اور آرزو کی خلش ہے۔

آدم از بہشت بیروں آمدہ می گوید

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن
دلِ کوہ و دشت و صحرا بدمے گداز کردن
ز قفس درے کشادن بہ فضائے گلستانے
بہ گداز ہائے پیدا بہ نیاز ہائے پیدا
نظرے ادا شناسے بجریم ناز کردن
گہے جز یکے ندیدن بہ ہجوم لالہ زارے
گہے خار نیش زن راز گل امتیاز کردن
ہمہ سوز نا تمام ہمہ درد آرزو یم
بگماں و ہم یقیں را کہ شہید جستجو یم

بہشت کے سکون کو یوں بیان کرتا ہے کہ اس کے یوسف نے زندان کا درد نہیں دیکھا اور اس کی زلیخا کے پاس دلِ نالاں نہیں ہے۔اس کا خلیل حریف آتش نہیں ہے اور اس کے کلیم کی جان میں ایک بھی شرر نہیں ہے۔شبہات اس کے یقین پر چھاپا نہیں مارتے ہیں۔اور وصال کو اندیشہ ہجراں نہیں ہے اور تب کہتا ہے کہ بہشت کو رذوقوں کی دنیا ہے اس میں رہ کر کیا کروگے۔

مزی اندر جہانِ کور ذوقے　　کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

یہ پھر کلام کی شوخی اور شاعرانہ گستاخی ہے جو اقبال کے یہاں قدم قدم پر ملے گی ۔تسخیر فطرت میں حرارتِ آرزو ہے۔آج بادلوں پر قابو پایا تو کل چاند پر تیر مارا۔ایک کو فتح کیا تو دوسرے کی تلاش ہے۔یہاں کشمکش ہے جدوجہد ہے۔بہشت میں سکون اور راحت ہے۔اس لئے وہ کشمکشِ حیات کو اس عنوان سے پیش کرتا ہے کہ جنت بھی اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔یہ شاعرانہ مبالغہ ہے۔غرض یہ ہے کہ جہادِ زندگانی کی جانب پوری قوت سے توجہ مبذول ہے۔

تسخیر فطرت میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ہر قدم پر خطرہ ہے اسی لئے وہ خطرے کو دعوت دیتا ہے وہ پکارتا ہے ع

اگر خواہی حیات اندر خطر زمی

یعنی اگر زندگی چاہتا ہے تو خطرے کے اندر رہنا سیکھ۔

عطر تاب و تواں را امتحاں است　　عیار ممکنات جسم و جاں است

خطر تمہارے تاب و تواں کا امتحان اور جسم و جان میں کیا ممکنات پوشیدہ ہیں۔ان کا میزان ہے۔اس شوخی کے ساتھ وہ یہاں تک کہہ دیتا ہے کہ زندہ دلوں کے لئے زندگی صرف جفا طلبی ہے۔اس لئے اگر کعبہ کے راستہ میں خطرہ نہ ہو تو وہاں کا سفر بھی میں نہ کروں گا۔

بہ کیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است　　سفر بکعبہ نکرم کہ راہ بے خطر است

اور کہتا ہے ع

چوں موج سازِ وجودم زسیل بے پرواست　　گماں مبر کہ دریں بحر ساحلے دارم

یعنی جس طرح موج دریا اور سمندر کے سیلاب میں چلتی ہے وہی حال میرا ہے۔یہ مت سمجھنا کہ میں سمندر میں ساحل یا کنارہ تلاش کرتا ہوں۔

تسخیر فطرت کا سبق اقبال معراج پیغمبر علیہ السلام سے بھی لیتا ہے، چنانچہ صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ ع

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے　　کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

پھر تسخیر فطرت براہِ عقل کو کس لطیف لیکن واضح انداز سے بیان کیا ہے ع

فطرت کو خرد کے رو برو کر　　تسخیر مقامِ رنگ و بو کر
تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے　　کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر
تاروں کی فضا ہے بیکرانہ　　تو بھی یہ مقام آرزو کر
عریاں ہیں ترے چمن کی حوریں　　چاک گل و لالہ کو رفو کر
بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

جب آدم دنیا میں آتے ہیں تو روحِ ارضی ان کا اس طرح استقبال کرتی ہے ع

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ　　مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ　　ایام جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں　　یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں　　تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے　　دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
نا پید ترے بحرِ تخیل کے کنارے　　پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیر خودی کر اثر آہ رسا دیکھ

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں　　آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں　　جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

تابندہ ترے عود کا ہے تار ازل سے　　تو جنس محبت کا خریدار ازل سے
تو پیر و صنم خانۂ اسرار ازل سے　　محنت کش و خوں ریز و کم آزار ازل سے
ہے راکب تقدیر جہاں تیری نظر دیکھ

الغرض وہ اس تمام عالمِ رنگ و بو زمین سے آسمان اور ستاروں تک کو مسخر کر کے انسان کے تصرف میں لانا چاہتا ہے۔ اور یہی اسلام کی تعلیم ہے۔

والارض کا اور کیا منشا ہے زمینوں اور آسمانوں سب کو مسخر کر لینا ہی ایک مومن کی شان ہے۔ چنانچہ ضرب الاحزاب مصنفہ ملا علی قاریؒ میں جو دعائیں درج ہیں ان میں ایک

جگہ یہ بھی درج ہے کہ کل عالم کو میرے لئے مسخر کردے۔ یہ دعائیں قرآن وحدیث سے ماخوذ ہیں۔ گویا یہ ایک مومن کا نصب العین حیات ہے کہ وہ سارے عالم کو مسخر کرے اور زمینوں اور آسمانوں پر تصرف کرے۔ دنیائے اسلام کے نامور مفکر وخطیب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنوء "ساعتے با اولیا" کے عنوان سے مولانا محمد یعقوب کے اقوال الفرقان میں تحریر فرماتے رہے ہیں۔

اس میں ایک جگہ حضرت نے اس دعا کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اگر سارا عالم ہمارے تصرف میں آجائے تو ہم اس کو کھلائیں گے کہاں سے۔ یہ ایک صوفیانہ نکتہ تھا۔ ایک مخصوص حلقہ کو تعلیم تھی۔ غالباً مقصود یہ تھا کہ دعا مانگو ایسی کہ دل سے نکلے اور جس کے لئے عمل پیرا ہو۔ لیکن حقیقت ظاہر ہے کہ یہ دعا مومن کو سکھائی گئی ہے۔

عالمِ اسلام اور سائنس سے بے خبری

علم ایک وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اس میں دیگر علوم کے ساتھ علم سائنس بھی شامل ہے۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ **اطلب العلم ولو کان بالسین** (یعنی علم طلب کرو خواہ وہ چین میں ملے) اس طرح آپ نے یہ بھی فرمایا کہ علم کو گہوارے سے موت تک طلب کرو۔ علم کے حصول پر اس قدر زور شانِ نبوت کو ظاہر کرتی ہے جس کے لئے مستقبل کی تمام تاریکیوں میں روشنی نمودار تھی لیکن علماء اسلام نے حدیث بالا میں ایک لفظ کا اضافہ کردیا اور فرمایا کہ علم سے مراد علم دین ہے۔ حالانکہ قانون کی شرح کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ اس میں کسی لفظ کا اضافہ جائز نہیں ہے۔ اسلئے مناسب یہ تھا کہ علم سے مراد مطلق علم لیا جاتا۔ اس تشریح نے بڑے دوررس نتائج پیدا کئے اور میرا جو ناچیز مطالعہ ہے اس کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں اسلام کے زوال کی وجہوں میں ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے اور یہ اقبال کی نظر سے پنہاں نہ تھی اس لئے وہ علم کی کہیں مذمت نہیں کرتا۔ بلکہ ہر جگہ وہ مقام دیتا ہے جس کی وہ مستحق ہے۔ البتہ اسے شوخی اور گستاخی سے روکتا ہے اور اپنی حد کے اندر رہنا سکھاتا ہے۔ زوال کی دوسرے بڑی وجہ سلطانی ہے اور تیسری ملاؤں کی تنگ نظری اور خرقہ پوش ارباب خانقاہ کی بے بصری۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری　　اے کشتہ ملائی وہ سلطانی و پیری

ترکی کی تاریخ بتلاتی ہے کہ وہ یورپ، ایشیا اور افریقہ پر اسلئے حکمراں رہے کہ ان

کے پاس آلاتِ حرب جدید دوسروں کی نسبت زیادہ بہتر تھے۔ لیکن جب یورپ میں علم و سائنس کی روشنی آئی تو اس سے ترکوں نے اجتناب کیا او راسی قدیم روش پر قائم رہ گئے۔ ترکوں نے سب سے پہلے رائیفل کا استعمال کیا اور جب سلطان سلیم نے مصر پر حملہ کیا اور اسے چشم زدن میں تاخت وتاراج کر کے حکمراں طبقہ مملوکوں کے امیر کو گرفتار کیا تو اس نے سلطان سلیم کے سامنے ایک بے باک تقریر کی۔ جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ ''آج جو ہم کو شکست ہوئی ہے اور تم کو فتح تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تم ہم سے زیادہ بہادر ہو، ہم یقیناً تم سے زیادہ بہادر ہیں۔ لیکن تمہارے پاس رائفل اور توپیں ہیں اور ہمارے پاس یہ سامان نہیں ہے۔ یہ رائفل اور توپیں ہمارے پاس بھی لائی گئی تھیں اور ہمارے سردار نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ ہم انہیں اپنا لیں۔ لیکن ہم لوگوں نے انکار کیا اور کہا کہ ان سے لڑنا مردانگی کے خلاف ہے تب ہمارے امیر نے کہا تھا کہ ایک دن اسی سے تم نیست و نابود کئے جاؤ گے۔ پھر اس نے ایک آہ سرد کھینچی اور کہا'' کہ افسوس آج وہی دن ہے۔''

علم کے خزانے یونان سے اٹلی اور اٹلی سے بغداد اور وہاں سے یورپ پہنچے۔ یورپ ان کی روشنی سے جگمگا اٹھا لیکن سلطانی کی وجہ حکومت ترکیہ میں جو اضمحلال آ گیا تھا اس نے اس کو جدت پسندی اختیار کرنے سے باز رکھا نوبت یہاں تک پہنچی کہ اگر جدید طرز پر فوج کو ترتیب دینے کا کوئی سلطان خیال بھی کرتا تھا۔ تو فوج بغاوت کر دیتی تھی اور علماء ان کی تائید کرتے تھے اور اسے بدعت قرار دیتے تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ ترکی کا سمندروں پر قبضہ تھا اور آخر کار وہ دن بھی آیا کہ جب طرابلس الغرب پر اطالیہ نے حملہ کیا تو ترکی بیچارگی سے دیکھتا رہ گیا۔ وہاں وہ فوج کس طرح بھیج سکتا تھا جب اس کے پاس جنگی جہاز ہی نہ تھے۔ مختصراً انجام یہ ہوا کہ وہ دن بھی تھا جب سلیمان شکوہ نے وائنا کا محاصرہ اس دعوے کے ساتھ کیا تھا کہ میں آج وائنا کے محل میں ناشتہ کروں گا اور میرے گھوڑے وائنا کے اصطبل میں دانہ کھائیں گے۔ اور یا وہ دن بھی آیا کہ بیرونی طاقتوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا۔ قوم پر ور ترکوں میں سے جو ملا اسے تہِ تیغ کر دیا۔ بقیہ دیگر ممالک میں جا کر روپوش ہو گئے۔ وہ تو ایک رند، بے باک جرآتِ قلندرانہ کے ساتھ اٹھا اور کچھ بچا لے گیا۔ ورنہ ترکوں کو غلامی کی زندگی بسر کرنی پڑتی۔ قبائے خلافت پرزے پرزے ہو گئی۔ اور عالمِ اسلامی منتشر ہو کر مرکز سے محروم ہو گیا۔ یہ سب کیوں ہوا اس لئے کہ علم سے پہلو تہی کی گئی اور نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ کے مسائل سیکھنے کے سوا اور ہر چیز کو علم کے وسیع و بسیط حد سے خارج کر دیا گیا۔

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ ایک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلم سے کوئی چارہ

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھوں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

اور آج بھی وہی عالم ہے تمام دنیائے اسلام کے مدارس میں مذہبیات کے علاوہ جن سے مراد قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم ہے صرف آرٹ کے بعض اجزاء کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مثلاً قدیم فلسفہ اور قدیم منطق وغیرہ۔ سائنس کی تعلیم شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے اور علوم جدیدہ سے اجتناب و اعراض عین اسلام تصور کیا جاتا ہے۔ ہمارے اس ملک میں درسِ نظامیہ سے باہر نکلنا کسی طرح ممکن نہیں ہوسکتا ہے۔ ندوۃ العلماء نے ضرور علم بغاوت بلند کیا تھا۔ لیکن وقت نے اسے بھی مرعوب کر دیا۔ سر سید علیہ الرحمۃ نے علی گڈھ میں کالج کی بنیاد ڈالی اور سائنس اور علوم جدیدہ کی تعلیم پر کمر بستہ ہوئے تو اس پر دھڑا دھڑ کفر کے فتوے صادر ہوئے خود سر سید فرماتے ہیں۔

خدا دارم دلِ بریاں ز عشقِ مصطفیٰ دارم ندارم ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

اسرائیلی فوجوں کے مقابلہ میں عربوں کی شرمناک شکست و ربیت المقدس کے نکل جانے کا حادثہ بالکل تازہ ہے۔ اس کے روحانی اسباب و علل جو بھی ہوں اور میں ان کا منکر نہیں جو بات اظہر من الشمس ہے وہ یہ ہے کہ عرب چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا ہے سلطانی کا زور ہے اور سائنس کا فقدان۔ پورے عرب میں ایک سوئی بھی نہیں بنتی ہے اور نہ اس جانب دھیان ہے۔ حالانکہ اگر کل عرب متحد ہو جائے تو وہ ایٹمی پاور بن سکتا ہے۔ وہ اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے یا تو امریکہ یا روس کی امداد کا محتاج ہے۔ وہ خود آلاتِ حرب تیار نہیں کر سکتا۔ غیر سے دریوزہ گری اور امداد غیر پر انحصار کے سلسلے میں مدح و شکایت کا ایک دفتر بے پایاں ہماری کل تگ و دو کا شاہکار ہے۔ اسرائیل عرب ملک کے اندر ایک ناسور بن گیا ہے اور صہیونی تحریک بڑے بڑے منصوبوں کے خواب دیکھ رہی ہے اور عرب میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کسی کوشش کا ابھی آغاز تک نہیں ہوا ہے۔

الغرض جس زمانے میں اقبالؔ نے اپنا پیام سنانا شروع کیا اس وقت سائنس اور علوم جدید کی تعلیم اگر کفر و شرک نہیں تو بدعت سیئہ ضرور قرار پا چکی تھی۔ اس لئے اقبالؔ کو اس معاملے میں اصل اسلام کو دلوں میں پیوست کرنے میں محنت کرنی پڑی۔ علم کی ستائش اور اس کی پنہائیوں اور قوتوں کا اظہار اقبالؔ نے طرح طرح سے کیا اور تسخیر کائنات کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ اس معاملے میں وہ مادہ پرستوں سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہے۔ وہ پوری

کائنات کو انسان کے تصرف میں لانا چاہتا ہے اور آسمان اور زمین سب کو مسخر کر لینا چاہتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ پوری کائنات پر انسان کو حکمرانی کرنے کی طاقت اور قدرت ہے۔

علم کے حدود اور تسخیر نفس

لیکن یہاں تک آنے کے بعد وہ مادہ پرستوں سے ٹکر لینے پر تل جاتا ہے اور ان کی کم بصری کو واضح کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کا دشمن صرف فطرت نہیں ہے بلکہ اس کا ایک اور سخت دشمن اس کا نفس ہے۔ اور اس لئے انسان کے کامل ہونے کے لئے صرف یہ شرط کافی نہیں ہے کہ وہ کائنات کو مسخر کرے۔ بلکہ اسے اپنے نفس پر بھی قابو حاصل کرنا ہوگا۔ اور اس کی تسخیر کا بھی عمل سیکھنا ہوگا۔ بلا اس کے وہ کامل نہیں ہو سکتا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے باہر جتنی بڑی دنیا آباد ہے۔ اس سے کم وسیع وہ عالم نہیں ہے جو خود اس کے اندر ہے۔ واقعات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو انسان سے باہر کی دنیا میں پیش آتے ہیں۔ دوسرے وہ جو خود اس کے اندر وقوع پزیر ہوتے ہیں۔ جو واقعات اس کے اندر وارد ہوتے ہیں وہ بڑا گہرا اثر رکھتے ہیں۔ انسان میں غصہ اور رحم، رنج و خوشی، احسان و ظلم، شرافت و تسفل، عفو و انتقام، کرم و بخشش، حسد و بغض و کینہ وغیرہ وغیرہ کے متضاد جذبات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور علم سے حاصل ہوئی طاقت کا استعمال وہ انہیں جذبات کے تحت کرتا ہے۔ اس لیے مانا کہ وہ علم کے ذریعہ عالم کو مسخر کرنے کا فن سیکھ لے۔ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ وہ ان کا استعمال بھی صحیح کرے۔ مثلاً آج امریکہ اور روس دونوں ایٹمی پاور بن چکے ہیں اور ہمہ وقت مشینوں سے چلنے والے جہاز تیار کھڑے ہیں۔ اور دونوں میں سے ایک کی خباثتِ نفس نتائج سے بے پروا ہو جائے تو صرف ایک بٹن دبانا ہے فوراً طیارے اڑ جائیں گے اور پورا عالم تین دن سے سات دن کے اندر فنا ہو جائے گا۔ اس کا علاج بیچارے علم کے پاس کچھ بھی نہیں۔ یہ معاملہ اس کی دسترس سے باہر ہے۔ اس نے تو ایک طاقت مہیا کر دی اور پھر یہ کہہ کر کنارہ کش ہو گیا ؎

خواہ آسماں و خواہ زمین مشو

اس لیے ضروری ہے کہ نفس کی بھی تسخیر کی جائے اور اسے بھی قابو میں لایا جائے!

اور بے راہ روی سے بچا جائے۔ بلا اس کے یہ دنیا رہنے کے قابل نہیں ہو سکتی۔ اور انسان کی تکمیل نامکمل رہ جائے گی۔ نفس کی تسخیر کے لیے آئین مرتب کرنے ہوں گے۔ وہ آئین کیا ہوں اور کیسے مرتب ہوں یہ سوالات ہیں جو تمام عالم میں زمانہ دراز سے ہیجان پیدا کئے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ بات منطقی حیثیت سے طے ہو جاتی ہے کہ انسان کو ضبطِ نفس اور اس کے لئے آئین کی ضرورت ہے۔

ہر کہ تسخیر مہ و پروین کند　　خویش را زنجیریٔ آئین کند

یعنی جو مہ و پروین کی تسخیر کرتا ہے وہ اپنے آپ کو آئین کا پابند کرتا ہے۔ اقبالؔ ان ماہرین علم والنفس کا ہم خیال ہے جو یہ کہتے ہیں کہ آزاد وہی شخص ہے جو سب سے مقید ہے۔ ایک آدمی لاابالی پن کا شکار ہے۔ جب جی چاہتا ہے سو کر اٹھتا ہے۔ کبھی آٹھ بجے اور کبھی تین بجے کھانا کھاتا ہے۔ سونے کا بھی کوئی وقت نہیں ہے۔ الغرض اس کی زندگی میں کوئی ضابطہ نہیں اور ایک دوسرا شخص ہے جس کا ہر کام وقت پر ہوتا ہے۔ وہ گھڑی کی سوئی کا پابند ہے۔ بظاہر وہ شخص آزاد ہے جو کسی اصول کا پابند نہیں ہے۔ لیکن درحقیقت آزاد وہ ہے جس نے اپنے آپ کو پابند کر رکھا ہے۔ چنانچہ اس کی وہ مثالیں دیتا ہے۔

باد را زندانِ گل خوشبو کند　　قید بو را نافۂ آہو کند

یعنی جب بو ہرن کی ناف میں بند ہو جاتی ہے تو مشک بنتی ہے۔

می زند اختر سوئے منزل قدم　　پیش آئینے سر تسلیم خم

چاند ایک آئین کے تحت اپنا قدم اٹھاتا ہے تو وہ منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

قطرہ ہا دریاست از آئین وصل　　ذرہ ہا صحراست از آئین وصل

باطن ہر شے ز آئینے قوی　　تو چرا غافل ازیں ساماں روی

قطرے وصل کے آئین پر عمل کر کے دریا اور ذرے اسی آئین پر عمل پیرا ہو کر صحرا بنتے ہیں۔ فطرت ایک آئین کے تحت کام کر رہی ہے اور ہر چیز کا باطن آئین ہی قوی ہوتا ہے۔ تو تو اس ساز و سامان سے کیسے غافل گزر سکتا ہے۔

اس لئے سب سے پہلی ضرورت ضبط نفس ہے۔

نفس تو مثلِ شتر خود پور است　　خود پرست و خود سوار و خود سر است

مرد شو آور زمامِ او بکف　　تا شوی گوہر اگر باشی خزف

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں　　می شود فرماں پذیر از دیگراں

یعنی تیرا نفس اونٹ کی طرح خود پرور خود پرست اور خود سر ہے اگر تو مرد ہے تو اس کی باگ اپنے ہاتھ میں لے تا کہ اگر تو ٹھیکری ہے تو گوہر بن جا جو شخص کہ اپنے اوپر حکمرانی نہیں کرتا وہ دوسروں کا فرمان پزیر یا غلام بن جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ضبط نفس یا تسخیر نفس کا نسخہ کیا ہے کس طرح اسے حاصل کیا جائے۔ اقبالؔ کا نظریہ یہ ہے کہ تسخیر نفس میں سب سے بڑی رکاوٹ ''خوف'' ہے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان ہر وقت موہوم آنے والی بلاؤں سے ڈرتا رہتا ہے۔ اگر موٹر پر سوار ہوتا ہے تو سوچتا ہے کہیں ٹکرا نہ جائے۔ کتنے آدمی ریل گاڑی پر انجن کے قریب نہیں بیٹھتے کہ شاید کہیں گاڑی پٹری سے اتر گئی یا لڑ گئی تو سب سے پہلے ہم کو ہی جان کا خطرہ ہوگا۔ ایک ذرا سا گلے میں خراش ہوئی اور دو چار دن رہ گئی تو کینسر کا ڈر آ لگا۔ گھر میں سوتا ہے تو چونک چونک اٹھتا ہے کہ کہیں چور نہ آ گئے ہوں۔ انسان کی زندگی میں ہر چہار جانب خوف ہی خوف۔ اولاد اور اعزہ کی صحت اور عافیت اور زندگی کی جانب سے ہر لمحہ خطرہ لگا رہتا ہے۔ یہ سب خوف کس لئے ہیں۔ اقبالؔ کے نظریے میں اس خوف کی وجہ ان چیزوں سے محبت ہے جن کے ضائع ہونے کا اس کو اندیشہ رہتا ہے۔ خوف اور محبت دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اور یہ دونوں تسخیر نفس اور انسان کامل ہونے میں حائل ہیں۔

طرح تعمیر تو از گلِ زحیتند　　یا محبت خوف را آمیختند

یعنی تری تعمیر ایسی مٹی سے ہوئی ہے جس میں محبت کے ساتھ خوف کو ملا دیا گیا ہے۔

خوفِ دنیا، خوفِ عقبہ خوفِ جاں　　خوف آلامِ زمین و آسمان
حب مال و دولت و حب وطن　　حب خویش و اقربا و حب زن

یعنی دنیا کا خوف عقبیٰ کا خوف آلام زمین و آسماں کا خوف یعنی وہ مبہم خوف کہ کہیں ایسا ایسا نہ ہو جائے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ اس تمام خوف کی بنیاد کیا ہے۔ مال کی دولت کی وطن کی محبت خویش و اقربا اور بیوی کی محبت۔ ان سب کی محبت میں گرفتار ہو کر انسان ہر لمحہ خوف میں مبتلا رہتا ہے۔ صوفیاں باصفا اور خدا جویاں معنی آشنا کا قول ہے کہ مذہب انسان کو ان تمام خوف کی حالتوں سے نجات دینے کے لئے آیا ہے۔

ان تمام خوف کی حالتوں سے نجات کا کیا ذریعہ ہے اس کا جواب دینے کے لئے حیات و کائنات کے بسیط مطالعہ اور اس کی حقیقت معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ اقبالؔ کا جواب یہ ہے کہ پہلی سچائی اس کائنات کی ایک قادر مطلق ذات یگانہ بے ہمتا و بے مثال ظرفِ

زماں ومکاں کے قیود سے بالاتر، ازلی وابدی، ناممکن الادراک واجب الوجود کی ہستی ہے جسے اسلام توحید کہتا ہے۔اور اقبالؔ نے بھی توحید کا نام دیا ہے۔وہ حقیقۃ الحقائق ہے۔وہی انسان کا خالق ہے اور اس نے نوامیس وآئین مرتب کئے ہیں جن پر عمل کر کے انسان نفس کی تسخیر کرسکتا ہے۔اب صرف یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ وہ نوامیس الہیہ انسان کو ملیں کیسے، اللہ تعالیٰ محدود اور انسان محدود کے لئے اپنے محدود بنانا اس کی شانِ اعلیٰ وارفع کے خلاف اور محدود کا لامحدود تک پہنچنا ناممکن ہے

واں لڑی آنکھ جہاں اپنا گزارہ ہی نہیں

اس لیے ضرورت ہوئی کہ کوئی درمیانی رشتہ قائم کیا جائے تا کہ وہاں کا پیغام ہم تک پہنچ سکے اور اس کے لئے رسالت لابدی قرار پائی اور انبیا رسول یا پیغمبر خدا کا پیغام انسانوں تک لائے اور نوامیس الہیہ سے باخبر کیا انسانی فہم اور ادراک اور علم کی وہاں تک رسائی نہیں ہوسکتی۔صرف وحی یا الہام زبانی سے یہ کام ہوسکتا ہے۔اور اس کا نام اقبالؔ کی زبان میں ''عشق'' ہے اور ''علم'' جو تسخیر کائنات کرتا ہے اسے تابع ''عشق'' ہونا چاہیے۔تب انسان کی تکمیل کی منزل طے ہوگی۔

عقلے کہ جہاں سوز دیک جلوہ بیباکی　　کز عشق بیاموز و آئین جہاں تابی

یعنی عقل جہاں سوز ہے لیکن وہ عشق صرف ایک جلوۂ بیباک اور عقل عشق سے آئین جہاں تابی سیکھتی ہے۔انسان نوامیس الہیہ کی اطاعت پر مجبور ہے اور جب وہ ضبط نفس اور اطاعت سے پوری طرح بہرہ ور ہوگا تو نیابت الٰہی کے مرتبہ پر قائم ہوگا اور یہی اس کی تکمیل کا خلاصہ ہے اور بلا اس کے وہ ناقص رہے گا۔رسالت کے لئے وہ پیغمبر عربی محمد الرسول اللہ ﷺ کو خاتم النبیین اور آپؐ کے پیغام کو آخری وحی اور آپؐ کی امت خاتم اقوام اور خیر الامم مانتا ہے۔جو کچھ اوپر بیان کیا گیا۔اب اقبالؔ کی زبان سے سنئے۔ع

تا عصائے لاالہ داری بدست　　ہر طلسم خوف را خواہی شکست
ہر کہ حق باشد چوں جاں اندر تنش　　خم نگر در پیش باطل گردنش
خوف را در سینہء او راہ نیست　　خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست
ہر کہ در اقلیم لا آباد شد　　فارغ از بندِ زن و اولاد شد
می کند از ما سوا قطعِ نظر　　می نہند ساطور بر حلق پسر

یعنی جب کسی شخص نے توحید کی عصا ہاتھ میں لے لی وہ خوف کے ہر طلسم کو توڑ ڈالے گا۔ جس کے جسم و جاں میں توحید سرایت کر گئی اس کی گردن کسی باطل کے آگے نہیں جھکتی ہے۔ اس کے سینے میں خوف کو راستہ مل ہی نہیں سکتا۔ اس کا دل کسی غیر اللہ کو پسند ہی نہ کرے گا اور نہ اس جانب مائل ہوگا۔ جو توحید کے احاطہ میں آگیا وہ زن اور فرزند کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے اور ہر ماسوا اللہ سے قطع نظر کر لیتا ہے۔ حتیٰ کہ بیٹے کے گلے پر بھی چھری چلا دیتا ہے (اشارہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف جنہوں نے حلق اسمٰعیل پر چھری رکھ دی تھی)

ایک شبہ یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اقبالؔ نے خوف عقبیٰ سے چھٹکارا حاصل کرنے کو کہا ہے۔ لیکن وہ قرآن کی آیۃ اَلَا اِنَّ اَولِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوفٌ عَلَیھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُونَ (خبر دار اولیاء اللہ کو نہ کسی قسم کا خوف ہے نہ حزن) کی تشریح کر رہا ہے اور ہر بندۂ مومن کو اسی مقام تک لے جانا چاہتا ہے۔ ع

عطا اسلاف کا جذب دروں کر   شریک زمرۂ لا یحزنون کر

اقبالؔ ان لوگوں میں سے نہیں ہے جو اولیاء اللہ سے عقیدت کو اصنام پرستی سے ملا دیتے ہیں۔ اس کے خم خانہ کی شراب عام ہے۔ جہاں تک رسالت کا تعلق ہے اقبالؔ اس کا ایک عظیم شیدائی ہے۔

طینت پاک مسلماں گوہر است   آب و تابش از یم پیغمبر است

یعنی مسلمان کی طینت پاک مثل ایک موتی کے ہے۔ جس کی آب و تاب پیغمبر علیہ السلام کے سمندر سے ہوئی ہے۔ ع

آبِ نیسانی بہ آغوش در آ   درمیانِ قلزمش گوہر بر آ

آب نیساں کا ایک قطرہ بن کر آپ کے آغوش میں جا اور آپ کے قلزم سے موتی بن کر نکل۔ لیکن توحید اور رسالت کا بیان تفصیل سے آگے آئے گا۔ یہاں صرف موضوع سخن کے لحاظ سے اشارہ کرنا مقصود ہے۔

اعمالِ صالحہ

عقیدہ توحید و رسالت کو لازم قرار دینے کے بعد اقبالؔ کہتا ہے کہ اگرچہ عقیدہ ضروری ہے لیکن بلا عمل صالحہ کے وہ تکمیل انسانیت نہ کر سکے گا ع

لذت ایماں فزاید از عمل　　مردہ آن ایماں کہ ناید در عمل

عمل سے ایمان کی لذت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ ایمان جو عمل میں نہ آسکے مردہ ہو جاتا ہے اور عمل کے لئے اس نے اسلام کے ارکانِ خمسہ کی تعلیم دی ہے چنانچہ کہتا ہے ع

لاالہ باشد صدف گوہر نماز　　قلب مسلم را حجِ اصغر نماز
در کفِ مسلم مثالِ خنجر است　　قاتل فحشاد بغیٔ و منکر است
روزہ بر جوع و عطش شبخون زند　　خیبر تن پروری را بشکند
مومناں را فطرت افروز است حج　　ہجرتِ آموز و وطن سوز است حج
طاعتے سرمایہ جمعیتے　　ربط اور اقِ کتاب ملتے
حب دولتِ رافنا سازد زکوٰۃ　　ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ
دل ز حبِّ تنفقو محکم کند　　از فزاید الفتِ زر کم کند
ایں ہمہ احکام استحکام تست　　نخبۂ محکم اگر اسلام تست

اہل قوت شوزدرد یا قوی
تا سوارِ زشتر خاکی شوی

یعنی کلمہ توحید سیپ اور نماز اس کے اندر موتی ہے اور مومن کے قلب کے لئے نماز حج اصغر کا درجہ رکھتی ہے۔ نماز مسلمان کے ہاتھ میں ایک خنجر ہے جس سے فواحش نافرمان اور منکرات تہ تیغ ہو جاتے ہیں۔ (یہ قرآن پاک کی اس آیۃ کا ترجمہ ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الفحشاءِ والمنکر روزہ بھوک اور پیاس پر شبخوں مارتا ہے اور تن پروری کے قلعہ کو توڑ ڈالتا ہے۔ حج مومن کے لئے فطرت افروز ہے۔ وہ ہجرت کے قوانین سکھاتا ہے اور وطن کے غلط نظریئے کو جس سے انسان صرف وطنی بن کے رہ جاتا ہے پھونک ڈالتا ہے۔ (کیونکہ حج سے انسان دنیا کا شہری بنتا ہے) زکوٰۃ جب دولت کو فنا کرتی ہے اور مساوات کا سبق دیتی ہے۔ قرآن پاک میں آیا ہے کہ (لَنْ تَنَالُو الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْن)

چنانچہ اقبال کہتا ہے کہ اس آیۃ کے معنی سے دل کو محکم کرنا زکوٰۃ کا کام ہے۔ اس سے دولت میں اضافہ ہوتا ہے اور پیسے کی محبت گھٹتی ہے۔ اگر تیرا اسلام محکم ہے تو ان سب باتوں پر عمل کرنے سے تجھے استحکام حاصل ہوگا۔ اس خاک پر حکمرانی کرنے کے لئے تم جب بھی اہل ہو سکتے ہو جب "یا قوی" کا ورد کر کے اہل قوت بنو یعنی تسخیر کائنات کے ساتھ تسخیر نفس بھی کرو۔ اور علم کے تابع عشق رکھو۔

عقیدہ اور عمل سے انسان کی تکمیل کا راستہ بتلانے کے بعد وہ اصرار کرتا ہے کہ وہ نوامیس الٰہیہ کی کامل اطاعت و اتباع ہونا چاہیئے۔ اقبالؔ نے جا بجا ''غلام نچتہ کار'' بننے کا مشورہ دیا ہے۔ اور کہیں کہیں جمہوریت کی مخالفت کی۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ اقبالؔ فاشزم کا یا ڈکٹیٹر شپ کا قائل ہے۔ اسے کبھی بھولنا نہ چاہیئے کہ اقبالؔ دستور حیات مرتب کر رہا ہے۔ اس کا مطمع نظر IDEALISM (مقصدی) ہے PRACTICAL POLITICS (عملی سیاست) سے اسے کوئی غرض نہیں۔ اور نہ وہ رخصت و اجازت کی گفتگوؤں اور بحثوں سے واسطہ رکھتا ہے۔ وہ اسلام پیش کر رہا ہے۔ اور ان عقاید اعمال کی تشریح کر رہا ہے جو فرد اور ملت کے لئے ہونے چاہئیں اور اصولاً ہونے چاہئیں۔ وہ کوئی نئی دنیا اور اس میں رہنے کے لئے نئے آدم کی تعمیر کے لئے نہیں اٹھا ہے۔ وہ حیات و کائنات کے بارے میں اپنا مطالعہ پیش کر رہا ہے اور انسان کی تکمیل کے لئے ضروریات بتلا رہا ہے۔ اس کی نگاہ وسیع ہے اور وہ ہر گوشہ پر نظر ڈالتا ہے۔ وہ ایک ایسے فرد کا تخیل پیش کرتا ہے جس کی انا میں بہت سی صفات ہوں جن کو وہ تشریح کے ساتھ بیان کرتا ہے پھر وہ ایک ''ملت'' کا نقشہ پیش کرتا ہے جو وطن کی قید سے آزاد اور عالمی ہو اور اس کے لئے نوامیس الٰہیہ کی پابندی لازمی قرار دیتا ہے۔ کہیں کہیں رخصت و اجازت کے طور پر کوئی درمیانی راستہ اختیار کرنا پڑے تو وہ اس کے موضوع سخن سے خارج ہے۔ کسی قوم کا دوسری قوم کا غلام ہونا یہ بالکل جداگانہ بات ہے۔ اور اس سے نفرت کا اظہار جس طرح اقبالؔ نے کیا ہے کہیں اور ملنا مشکل ہے۔ یہاں صرف ایک قطعہ پیش کیا جاتا ہے۔ ع

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد — گوہرے داشت و لے نذر قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است — من نہ دیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

یعنی ایک انسان کے لئے دوسرے انسان کی غلامی بے بصری ہے اور جو ایسا کرتا ہے وہ کتے سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ ایک کتا دوسرے کتے کے آگے سر خم نہیں کرتا۔ اب اس نے جمہوریت کے عنوان سے جو لکھا ہے اس کا جائزہ لیجئے ع

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی — ز موراں شوخیٔ طبعِ سلیماں نے نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلام نچتہ کارے شو — کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

کیا دوں فطرتوں سے متاعِ معنیٔ بیگانہ تلاش کرتے ہوئے کسی سلیمان کی شوخیٔ طبع موزوں میں نہیں آسکتی۔ طرزِ جمہوری سے بھاگو اور غلام نچتہ کار بنو کیونکہ اگر دو سو گدھوں

کے مغز اکٹھا کر دئے جائیں تو انسان کی فکر اس سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جمہوریت عوام الناس آئین و دستور و قوانین ترتیب دیتے ہیں۔ نوامیسِ الٰہیہ کی پابندی نہیں ہوتی اور نوامیس الٰہیہ پر عمل کئے بغیر انسان کبھی اپنی منزل کمال کو نہیں پہونچ سکتا۔ اس لئے اس طریقہ جمہوری کو ترک کرو اور نوامیس الٰہیہ کے غلام نچتہ کار بنو۔ جمہوریت کا اصول بھی یہی ہے کہ انسانون کے ایک گروہ کو جو کسی جغرافیائی حدود میں آباد ہوں اور ایک حکومت کے ماتحت رہنا چاہیں، اپنے لئے آئین وضوابطہ مرتب کرنے کا اختیار ہے اور اس کا اصول الاصول یہ ہے کہ عوام کو غلط قانون بنانے کا بھی حق ہے اور صحیح قانون بنانے کا بھی حق ہے۔ یعنی خود اس کے درمیان ان آئین اور ضابطوں کی صحت کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ جمہوریت کے بہت سے فوائد ہیں اور ملکی نظام پر بنا جمہوریت دنیا کے موجودہ نظاموں میں سب سے بہتر ہے اس کا اقبالؔ منکر نہیں لیکن انسانیت کے جو قوانین وہ مرتب کر رہا ہے اس سے یہ موضوع سخن خارج ہے۔ اقبالؔ کی نگاہ میں عقل انسانی کے حدود ہیں۔ اور وہ تسخیر نفس یا ضبط نفس یا تہذیب نفس کا مرحلہ حل کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے لئے کائنات نے جو سبق توحید و رسالت کا دیا ہے اور اس کی راہ سے جو نوامیس الٰہیہ ملے ہیں وہی کافی ہو سکتے ہیں اور اس کا نام وہ عشق رکھتا ہے اور اپنے مرشد رومی کے حسب ذیل شعر سے اکتساب کرتا ہے۔ ع

بہ خرد را عشق می پوئی　　بہ چراغ آفتاب می جوئی

اسی طرح وہ مولانا روم کا یہ شعر بھی پیش کرتا ہے۔ ع

داند آں کہ نیک بخت دوم است　　زیرکی ز ابلیس و عشق بہ آدم است

چنانچہ ایک فلسفہ سید زادہ کو لکھا ہے۔

آدم کو ثبات کی طلب ہے　　دستور حیات کی طلب ہے

اور اس کے لئے کیا ہونا چاہئے یہ لکھ کر کہ میں برہمن زادہ ہوں میرے آب و گل میں فلسفہ ہے اور میں اس کی رگ رگ سے باخبر ہوں۔ عقل انسانی کے مقام کی حدود کو یوں ظاہر کیا ہے۔

شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز　　سن مجھ سے یہ نکتہ دل افروز

انجام خرد ہے بے حضوری　　رہے فلسفۂ زندگی سے دوری

افکار کہ نغمہ ہائے بے صوت　　ہیں ذوق عمل کے واسطے سوت

دیں مسلک زندگی کی تقویم　　دیں سر محمدؐ و ابرہیمؑ

دل در سخن محمدیؐ بند　　ایثار علی زبو علی چند

چوں دیدۂ راہ بیں نداری
قائد قرشی بہ از بخاری

اس طرح کہتا ہے۔ ع

خرد سے راہرو روشن بصر ہے — خرد کیا ہے چراغِ رہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا — چراغِ رہگذر کو کیا خبر ہے

لیکن جیسا کہا گیا ہے وہ علم کے مدارج اور مقامات کا بھی بڑا معروف ہے۔ البتہ اس کو تابع عشق رکھانا چاہتا ہے۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور — چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

ایک نظم علم و عشق میں اسے اجاگر کیا ہے۔ ع

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن کرم کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب
شرح محبت میں ہے عشرت منزل حرام
شورشِ طوفان حلال لذت ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال عشق پر حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب عشق ہے ام الکتاب

اسی طرح کہتا ہے کہ علم تو زمان و مکان کی پیائش ہے یعنی اسی آب و گل یعنی مادہ سے اس کا تعلق ہے اور ذکر (یعنی عشق) انسان واجب الوجود تک لے جاتا ہے۔ ع

مقام ذکر کمالات رومی و عطار — مقام فکر مقالاتِ بو علی سینا
مقام فکر ہے پیائش زمان و مکاں — مقام ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

اسی طرح دوسرا قطعہ بہ عنوان وحی ملاحظہ ہو۔ ع

عقل بے مایہ امانت کی سزاوار نہیں — راہبر ہو ظن و تخمین تو زبوں کار حیات
فکر بے نور ترا جذبِ عمل بے بنیاد — سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شب تار حیات
خوب نہ خوب عمل کی ہو گرہ وا کیوں کر — گر حیات آپ ہی نہ ہو شارحِ اسرار حیات

اقبال کا مطلب ہے عقل انسانی سے اگر تہذیب نفس کے مراحل طے کئے جائیں تو عقل تو قیاس آرائیوں سے کام لے گی۔ جس طرح عقل نے مادہ کی تسخیر میں سبب اور نتیجہ

سے کام لیا تھا اور اس کا نام سائنس ہے۔ وہ چیز یہاں ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اس بات کا پتہ کیسے چلے گا کہ کیا چیز خوب اور کیا ناخوب ہے۔ جب کہ خود حیات شارح حیات نہ ہوگی یعنی خالقِ انسان جو اپنی فطرت سے واقف ہے خود اس کے لئے قوانین مرتب کر کے نہ دے وہ چیز البتہ یقینی ہے اور اس لئے وحی کی ضرورت ہے۔

اقبالؔ تقدیر کا قائل نہیں اس کا خیال ہے کہ احکام الٰہی کی کامل اتباع سے تقدیریں پلٹ جاتی ہیں۔ ع

پابندیِ تقدیر کہ پابندیِ احکام | یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مردِ خرد مند
ایک آن میں سو بار بدل جاتی ہیں تقدیریں | ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خورسند
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں | تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے
قدرت کے مقاصد عیار اس کے ارادے | دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اقبالؔ کہتا ہے کہ عصر حاضر کے انسان نے عقل کی اتباع اور عشق سے گریز کر کے بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔ وہ رازِ حیات سے ناآشنا ہو گیا اور اس کی دنیا تاریک ہو گئی۔

عشق ناپید و خرد گردش صورت ماز | عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا | اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا | آج تک فیصلہ نفع ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا | زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

تہذیب مغربی میں یہی خامی ہے کی اس کی روح مدنیت نوامیس الٰہیہ کی پابند نہ ہونے سے پاک نہیں رہ گئی ہے۔ اور روح کی پاکیزگی کے بغیر نہ ضمیر پاک رہ سکتا ہے اور نہ خیالات بلند اور نہ ذوقِ لطیف پیدا ہو سکتا ہے۔

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیالات بلند و ذوق لطیف

اسی لئے وہ سیاست جو دین سے الگ اور صرف عقلِ انسانی کی تابع ہوتی ہے وہ شیطان کی کنیز اور پست فطرت اور ضمیر مردہ بن جاتی ہے یعنی سیاست اور مدنیت کو نوامیس

الہیہ کا پابند ہونا چاہئے۔

مری نگاہ میں ہے یہ سیاست لادیں
کنیز اہرمن ودوں نہاد دو مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر
متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اس کی
تو ہیں ہراول لشکر کلیسا کے سفیر

دوسری جگہ کہا ہے کہ عیسائیت چونکہ رہبانیت کی تعلیم دیتی ہے اس لئے اس کو حاکمی سے کوئی تعلق نہیں اس لئے دین جانِ تن اور حاکمی تن بے جان بن گئی ہے۔

کلیسا سیۂ پطرس شمارد — کہ او با حاکمی کارِ ندارد
نہ کارے حاکمی مکر و فنے میں — تن بے جاں و جاں بے تنے میں

اقبال یقین کے ساتھ مغربی تہذیب کی موت اور اسلام کے جلوہ گر ہونے کی پیشن گوئی کرتا ہے۔ع

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا — وہ مشت خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے
خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے — فرنگ رہگذر سیل بے پناہ میں ہے
خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے — یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی — ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا — خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
جہانِ آب و گل کی عالمِ جاوید کی خاطر — نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

توحید

نہ باملا نہ صوفی نشینم — تو می دانی کہ من آنم نہ اینم
نویس اللہ ہو بر لوح دل من — کہ ہم خود را ادرا افاش بنیم

توحید اسلام کا بنیادی نکتہ ہے اور اسی پر کل عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ تمام انبیاء کرام

ابتداء آفرینش سے اسی کی تعلیم کے لئے آتے رہے اور محمد عربی ﷺ آخری نبی تھے جن کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہ ہوگا۔ توحید سے مراد ایک قادر مطلق ماوراء محسوسات ہستی کا ان صفات کے ساتھ تصور ہے جو قرآن نے بیان کی ہیں اللہ کی ذات وصفات کیا ہیں بہتر ہے کہ ان کو امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی زبان سے بیان کیا جائے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن جلد اوّل کے صفحہ ۱۷۰ پر فرماتے ہیں:

"قرآن کے تصور الٰہی کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے کسی طرح کی اعتقادی مفاہمت اس بارے میں جاری نہیں رکھی وہ اپنے توحیدی اور تنزیہی تصور میں سرتاسر بے میل و بے لچک رہا۔ اس کی نزاکتوں اور بندشوں کی متحمل ہو سکتی اس لئے مذاہب نے تمام تر زور توحید فی الذات پر دیا۔ توحید فی الصفات اپنی ابتدائی اور سادہ حالت میں چھوڑ دی گئی۔

چنانچہ یہی حال ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ باوجودیکہ تمام مذاہب قبل قرآن میں عقیدہ توحید کی تعلیم موجود تھی لیکن کسی نہ کسی صورت میں شخصیت پرستی، عظمت پرستی اور اصنام پرستی نمودار ہوتی رہی اور رہنمایانِ مذاہب اس کا دروازہ بند نہ کر سکے۔ ہندوستان میں غالباً اوّل روز ہی سے یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ عوام کی تشفی کے لئے دیوتاؤں اور انسانی عظمت کی پرستاری ناگزیر ہے۔ اس لئے توحید کا مقام صرف خواص کے لئے ہونا چاہئے فلاسفہ یونان کا بھی یہی خیال تھا۔ یقیناً وہ اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ کوہ ایلمپس کے دیوتاؤں کی کوئی اصلیت نہیں تاہم سقراط کے علاوہ کسی نے بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ عوام کے اصنامی عقائد میں خلل انداز نہ ہوں۔ وہ کہتے تھے کہ اگر دیوتاؤں کی پرستش کا نظام قائم نہ رہا تو عوام کی مذہبی زندگی درہم برہم ہو جائے گی۔ فیثا غورس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ جب اس نے اپنا مشہور حسابی قاعدہ معلوم کر لیا تھا تو اس کے شکرانے میں سو بچھڑوں کی قربانی دیوتاؤں کی نذر کی تھی۔

اس بارے میں سب سے نازک معاملہ معلم درہنما کی شخصیت کا تھا یہ ظاہر ہے کوئی تعلیم عظمت و رفعت حاصل نہیں کر سکتی جب تک معلم کی شخصیت میں بھی عظمت کی شان پیدا نہ ہو۔ لیکن شخصیت کی عظمت کے حدود کیا ہیں؟ یہیں آکر سب کے قدموں نے ٹھوکر کھائی وہ اس کی ٹھیک ٹھاک حد بندی نہ کر سکے نتیجہ یہ نکلا کہ شخصیت کو خدا کا اوتار بنا دیا کبھی ابن اللہ سمجھ لیا کبھی شریک وہیم ٹھہرا دیا اور اگر یہ نہیں کیا تو کم از کم اس کی تعظیم میں بندگی اور نیاز کی سی شان پیدا کر دی۔ یہودیوں نے ابتدائی عہد کی گمراہیوں کے بعد کبھی ایسا نہیں کیا کہ پتھر کے بت تراش کر

ان کی پوجا کی ہو لیکن اس بات سے وہ بچ نہ سکے کہ اپنے نبیوں کی قبروں پر ہیکل تعمیر کر کے انھیں عبادت گاہوں کی سی شان و تقدیس دے دیتے تھے۔ گوتم بدھ کی نسبت معلوم ہے کہ اس کی تعلیم میں اصنام پرستی کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی لیکن نہ صرف بدھ کی خاک اور یادگاروں پر معبد تعمیر کئے گئے بلکہ مذہب کی اشاعت کا ذریعہ ہی یہ سمجھا گیا کہ ان کے مجسموں سے زمین کا کوئی گوشہ خالی نہ رہے۔ مسیحیت کی حقیقی تعلیم سرتاسر توحید کی تعلیم تھی لیکن ابھی اس کے ظہور کو پورے سو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ الوہیت مسیح کا عقیدہ نشو و نما پا چکا تھا۔

لیکن قرآن نے توحید فی الصفات کا ایسا کامل نقشہ کھینچ دیا کہ اس طرح کی تمام لغزشوں کے دروازے بند ہو گئے۔ اس نے صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا بلکہ شرک کی راہیں بھی بند کر دیں اور یہی اس باب میں اس کی خصوصیت ہے۔

وہ کہتا ہے کہ ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق صرف خدا کی ذات ہے۔ پس اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکا دیا تو توحید الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔ وہ کہتا ہے یہ اسی کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی اور ان کی دعائیں قبول کرتی ہے۔ اگر تم نے اپنی دعاؤں یا طلب گاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو گویا تم نے اسے خدا کی خدائی میں شریک کر لیا۔ وہ کہتا ہے دعا استعانت، رکوع سجود و عجز و نیاز، اعتماد و توکل اور اسی طرح کے تمام عبادت گزارانہ اور نیاز مندانہ اعمال وہ اعمال ہیں جو خدا اور اس کے بندوں کا رشتہ قائم کرتے ہیں۔ پس اگر تم نے ان اعمال میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو خدا کے رشتہ عبودیت کی یگانگی باقی نہ رہی۔ اس طرح عظیموں، کبریائیوں، کارسازیوں اور بے نیازیوں کا جو اعتقاد تمہارے خدا کی ہستی کا تصور پیدا کرتا ہے وہ صرف خدا ہی لئے مخصوص ہونا چاہئے۔ اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لئے پیدا کر لیا تو تم نے خدا کا شریک ٹھہرا لیا اور توحید کا عقیدہ درہم برہم ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ فاتحہ میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِین کی تلقین کی گئی ہے۔ اس میں اول تو عبادت کے ساتھ استعانت کا بھی ذکر کیا گیا ہے، پھر دونوں جگہ مفعول کو مقدم کیا جو مفید یعنی "تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں" اس کے علاوہ تمام قرآن میں اس کثرت کے ساتھ توحید فی الصفات اور ردِ اشتراک پر زور دیا ہے کہ شاید ہی کوئی سورت بلکہ کوئی صفحہ اس سے خالی ہو۔

مقامِ نبوت

سب سے زیادہ اہم مسئلہ نبوت کی حد بندی کا تھا یعنی اگر معلم کی شخصیت کو اس کی اصلی جگہ میں محدود کر دیتا تا کہ شخصیت پرستی کا ہمیشہ کے لئے سد باب ہو جائے۔ اس بارے میں قرآن نے جس طرح صاف اور قطعی لفظوں میں پیغمبر اسلام کی بشریت اور بندگی پر زور دیا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ہم یہاں صرف ایک بات کی طرف توجہ دلائیں گے۔ اسلام نے اپنی تعلیم کی بنیاد کلمہ جو قرار دیا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

(یعنی میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ محمدؐ خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں) اس اقرار میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح پیغمبرِ اسلام ﷺ کی بندگی اور درجہ رسالت کا بھی اعتراف ہے۔ غور کرنا چاہئے کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ صرف اسلئے کہ پیغمبرِ اسلام کی بندگی اور درجہ رسالت کا اعتقاد اسلام کی اصل و اساس بن جائے اور اس کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہے کہ عبدیت کی جگہ معبودیت کا اور رسالت کی جگہ اوتار کا تخیل پیدا ہو۔ ظاہری بات ہے اس سے زیادہ اس معاملے کا تحفظ کیا کیا جا سکتا تھا؟ کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل ہی نہیں ہو سکتا جب تک وہ خدا کی توحید کے ساتھ پیغمبرِ اسلام ﷺ کی بندگی کا بھی اقرار نہ کرے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضورؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں میں بہت سے اختلاف پیدا ہوئے۔ لیکن ان کی شخصیت کے بارے میں کوئی سوال پیدا نہیں ہوا۔ ابھی آپ کی وفات پر چند گھنٹے بھی نہ گزرے تھے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سر ممبر اعلان کر دیا تھا۔

''جو کوئی تم میں محمد ﷺ کی پرستش کرتا تھا سو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ محمد ﷺ نے وفات پائی اور جو کوئی تم میں اللہ کی پرستش کرتا تھا تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کی ذات ہمیشہ زندہ ہے اور اسے موت نہیں''۔

قرآن سے پہلے علوم و فنون کی طرح مذہبی عقائد میں بھی خاص و عام کا امتیاز ملحوظ رکھا جاتا تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ خدا کا ایک تصور تو حقیقی ہے ایک تصور مجازی ہے چنانچہ ہندوستان میں خدا شناسی کے تین درجے قرار دئے گئے۔ عوام کے لئے دیوتاؤں کی پرستش،

خواص کے لئے براہ راست خدا کی پرستش، خاص الخواص کے لئے وحدۃ الوجود کا مشاہدہ یہی حال فلاسفہ یونان کا تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ ایک غیر مرئی اور غیر مجسم خدا کا تصور صرف اہل علم و حکمت ہی کر سکتے ہیں۔ عوام کے لئے اسی میں امن ہے کہ دیوتاؤں کی پرستاری میں مشغول رہیں۔

لیکن قرآن نے حقیقت و مجاز یا خاص و عام کا کوئی امتیاز باقی نہ رکھا۔ اس نے سب کو خدا پرستی کی ایک ہی راہ دکھائی۔ اور سب کے لئے صفات الٰہی کا ایک ہی تصور پیش کیا وہ حکماء اور عرفاء سے لے کر جہال و عوام سب کو حقیقت کا ایک ہی جلوہ دکھاتا ہے اور سب پر اعتقاد و ایماں کا ایک ہی دروازہ کھولتا ہے۔ اس کا تصور جس طرح ایک حکیم و عارف کے لئے سرمایۂ تفکر ہے، اسی طرح ایک چرواہے اور دہقان کے لئے سرمایۂ تسکین۔

☆

اقبالؔ کا نظریہ

اس بات کو بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں کہ اقبالؔ کا نظریہ وہی ہے جو اسلام کا ہے اور جس کی وضاحت ابوالکلام آزادؔ نے کی ہے۔ لیکن اقبالؔ کا طرزِ بیان و اندازِ گفتگو عصر حاضر کے لب و لہجہ میں ہے۔ بقول غالب

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اسلامی توحید کے بارے میں حسب ذیل باتیں خیال میں رکھنے کی ہیں:

(۱) ایک واجب الوجود ماوراء المحسوسات قادرِ مطلق اسماء حسنیٰ سے مزین خالقِ کائنات بے مثال و بے ہمتا ہستی کا تصور۔

(۲) اس کا کوئی شریک و ہیم نہیں، وہ اپنی ذات و صفات میں یگانہ ہے۔

(۳) وہی عبادت و نیاز کا مستحق ہے اور ہر قسم کی امداد اسی سے طلب کرنی چاہئے۔

(۴) اس کا رحم و کرم، اس کا عفو و احسان بے پایاں ہے اور اس لئے وہی محبت و عشق کا مستحق ہے۔ اقبالؔ انھی نظریات کو محاسن کلام سے آراستہ کر کے پیش کرتا ہے۔

نشانِ راہ ز ہزار حیلہ پرس
بیا کہ عشق کمالے زیک فنی دارد

یعنی عقل وقیاس وظن وتخمین سے خدا کے وجود کا پتہ نہیں چل سکتا عشق کے راستہ ہی سے اس کا نشان ملے گا۔ اس کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے یوں کہا ہے۔ ع

اے برتر از خیال و قیاس وگمان ووہم

مشام تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشاں اس کا
زن وتخمین سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

نگہ الجھی ہوئی ہے رنگ وبو میں | خرد کھوئی ہوئی ہے چار سو میں
نہ چھوڑ اے دل فغانِ صبح گاہی | اماں شاید ملے اللہ ہو میں

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فغاں لا الٰہ الا اللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ
خرد ہوئی ہے زمان ومکاں کی زناری
نہ ہے زماں ومکاں لا الٰہ الا اللہ

نقطۂ ادوارِ عالم لا الٰہ | منتہائے کارِ عالم لا الٰہ
تا ز رمزِ لا الٰہ آید بدست | بند غیر اللہ را نتواں شکست

یعنی عالم کا آخری مبدا ومنشا لا الٰہ ہے اور جب تک رمزِ توحید پوری طرح گرفت میں نہ آئے غیر اللہ سے چھٹکارا مل نہیں سکتا۔ حدیث شریف ہے کہ **تفکر و انی الخلقِ ولا تفکر وانی الخلقِ ولا تفکرو انی الخالق** (مخلوق کے متعلق غور کرو اور خالق کی بابتہ غور وفکر مت کرو) خلق پر خود تسخیر حیات کی ضمانت ہے لیکن خالق کا علم سرحد ادراک سے پرے ہے اور اس کا وجدانی تجربہ کے ذریعہ ہی احساس ممکن ہے۔ اسی کو اپنے اشعار میں اقبالؔ نے چمکتے موتیوں کی طرح پرو دیا ہے۔ اور جن کی مثالیں اوپر دی گئیں۔ اور یہ پرانا مقولہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے خدا کو پہچانا۔

اسرارِ ازل جوئی بر خود نظرے وا کن | یکتائی وبسیاری، پنہائی وپیدائی
نہ با ملا نہ با صوفی نشینم | تو می دانی کہ من آنم نہ اینم

لولیس اللہ ہوں برلوح، دل من کہ ہم خود را ہم ادا خاموش نیم

(میں نہ تو ملا ہوں اور نہ صوفی ہوں اور یہ ہر شخص کو معلوم ہے لیکن اپنے کو اور خدا کو صاف دیکھتا ہوں اس لئے میرے لوحِ دل پر اللہ ہو کندہ کر دو)۔ معرفتِ نفسی سے معرفتِ الٰہی کے حصول کو کن خوبصورت الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح سرگزشت آدم میں انسان کی تسخیر کے عالم آرا کرشمے بیان کرنے کے بغیر کہتا ہے کہ عقل کو وسیع فتح یابیوں نے رازِ کائنات وا نہیں کیا۔ لیکن جب اس سے اجتناب کر کے وجدان و عشق کے میدان میں آئے تو ذات باری تعالیٰ کو دل میں موجود پایا۔

کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر لگا کے آئینہ عقلِ دوبیں میں نے
کیا اسیر شعاعوں کو برق مضطر کی بنا دی غیرتِ جنت یہ سرزمین میں نے
مگر خبر نہ ملی آہ راز ہستی کی کیا خرد سے جہاں کو تہِ نگیں میں نے
ہوئی جو چشم مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانہ دل میں اسے مکیں میں نے

معرفتِ نفس یا احساس خودی کے بغیر وہ تمام عبادتوں اور ریاضتوں کو بیکار تصور کرتا ہے۔ کیونکہ صبح معنوں میں توحید بلا احساس خودی ممکن ہی نہیں ہے اور عقل کے حدود حواس تک معین و محدود ہیں۔

یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرود تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ عقل جو مہ و پروین کا کھیلتی ہے شکار شریک شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
ز رازِ معنی قرآں چہ پرسی خمیر بہ آب آتش دلیل است
خرد آتش فروزد دل بسوزد ہمیں تفسیر نمرود و خلیل است

اقبالؔ توحید الٰہی کو کائنات کی سب سے بڑی سچائی گردانتا ہے۔ اور اس کا خیال ہے کہ توحید کے مکمل ہونے کے بعد ہی انسان کا کاسۂ جام جم بن جاتا ہے۔ اس سے پہلے وہ ایک کاسۂ گدائی تھا۔

چوں مقام عبدہٗ محکم شود کاسۂ دریوزہ جام جم شود

یہ ارکان اساسی ملّیہ اسلام میں رکن اوّل ہے۔ اور جب انسان کائنات کے اس راز کو پالیتا ہے تو خوف اور شک دونوں فنا ہو جاتے ہیں اور اس کی آنکھ ضمیر کائنات کو دیکھنے لگتی ہے جو عقل کی رہنمائی میں ناممکن ہے۔

بیم وشک میرد عمل گیرد حیات　　چشم می بیند ضمیر کائنات

ملتِ بیضا تن ہے اور لا اِلٰہ اس کی جان ہے۔ ہمارے ساز کے پردوں کو ہٹا کر آواز پیدا کرنا لا اِلٰہ ہی کا کام ہے۔

ملتِ بیضا تن وجاں لا اِلٰہ　　ساز ما را پردہ گرداں لا اِلٰہ

توحید سے مساوات انسانی عالم آشکار ہوتی ہے اور کالے اور گورے کا فرق مٹ جاتا ہے اور اس کی قوت سے ایک حبشی حضرت عمر فاروقؓ جیسے مدبر و جہانباں اور حضرت ابوذر غفاریؓ جیسے درویش کا عزیز و رشتہ دار بن جاتا ہے۔

اسود از توحید احمر می شود　　خویش فاروق و ابوذر می شود

توحید یاس وحزن وخوف کو جو اُم الخبائث ہیں ان کا ازالہ کرتا ہے۔

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر　　از نبی تعلیم لاتحزن بگیر

موحد کو کسی قسم کا غم نہ ہونا چاہئے کیوں کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اس کے ساتھ ہے۔ نبی کریم ﷺ جب ہجرت کے نکلے تو دامنِ کوہ کے ایک ادرّہ میں پناہ لی۔ دشمنانِ دین آپ کو تلاش کرنے نکلے اور قریب آ گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق ساتھ تھے۔ وہ گھبراتے تھے تو آپ فرماتے کہ ڈرو مت اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ اسی کو اقبال بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر تم غم میں گرفتار ہو تو نبی علیہ السلام سے لاتحزن کا سبق لو اور یاد رکھو کہ تم موحد ہو اور اللہ تعالیٰ ہمہ وقت تمہارے ساتھ ہے۔ اگر خدا پر عقیدہ محکم ہے تو غم سے آزاد ہو جاؤ اور بیش وکم کے خیال سے آزادی حاصل کرو۔

گر خدا داری زغم آزاد شو　　از خیالِ بیش وکم آزاد شو

خوف سے خوشامد، مکاری، کینہ، جھوٹ جیسے امراض فروغ پاتے ہیں۔ اور جس نے پیغام مصطفویؐ (یعنی اسلام) کو سمجھا ہے وہ خوف کو شرکِ خفی قرار دیتا ہے۔

لا بہ مکاری وکیس و در دروغ　　ایں ہمہ از خوف می گیرد فروغ

ہر کہ رمز مصطفےٰ فہمیدہ است　　شرک را در خوف مضمر دیدہ است

الغرض اقبالؔ کا نظریہ توحید کوئی نیا یا انوکھا نہیں وہی ہے جو جناب رسالت مآب ﷺ لائے اور جس کی آپؐ نے تعلیم دی۔ جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے مانا اور برتا اور جس پر عمل کیا۔ جس پر درویشوں، بزرگوں اور محدثین کا یقین کامل ہے۔ اور جو صاف اور واضح ہے جب سے انسان کا وجود ہے وہ ایک قادرِ مطلق خالق اور ماوراء المحسوسا تلا مکاں ولازماں ہستی کی تلاش میں رہا ہے تا کہ اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر سکے۔ اور اس کی ذات

وصفات سے عشق و محبت کا اظہار کرے۔ عقلی دلائل اور فلسفے مذاہبی عقائد اور تیقنات بکھرے پڑے ہیں۔ عرب کی وادیِ غیر ذی زرع سے ایک تجلی ایک روشنی نمودار ہوئی جو عالم پر چھا گئی۔ مولانا ظفر علی خاں نے کہا ہے ع

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

توحید کا جو نکتہ ریگ زار عرب کے ایک امی نے بتلایا اس نے حقیقت کو اس طرح آشکارہ کر دیا جس طرح بادلوں سے چاند نمودار ہو جائے۔ اقبالؔ اسی تعلیم کو پیش کرتا ہے۔ نہ وہ فلسفیانہ دلائل دیتا ہے نہ منطقی بحثیں کرتا ہے بلکہ عقل سے کنارہ کش ہو کر وجدان سے مدد لینے کا محرک ہے اور نہ اس کے اظہار و بیان میں کسی قسم کی پیچیدگی ہے صرف حسنِ کلام کی خوبیاں ہی وہ کہتا ہے کہ انسان کی آخری منزل اللہ تعالیٰ ہے۔

در صیدِ کمند من جبریل زبوں صیدے
یزداں کمند آورائے ہمت مردانہ

یعنی اگر جبریل تک پہنچے تو کیا ہوا۔ اللہ تعالیٰ تک پہنچنا ہے اور اسے دل میں بسانا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہر ہر قدم پر اقبالؔ کے کلام میں حسن و خوبی طرزِ ادا کی ندرت اور شاعرانہ محاکات ملتے ہیں جو دل پر چوٹ مارتے ہیں۔ بس یہی اس کا انداز بیان ہے جو اسے ممتاز کرتا ہے ورنہ بات وہ وہی کہتا ہے جو ایک ٹھیٹھ ملا کہتا ہے اور جیسا کہ اس نے اسرار خودی کے شروع میں کہا ہے۔ وہ مولانا رومؒ کا مقلد ہے اور عصر حاضر کی زبان میں اسلام کو اس طرح پیش کرتا ہے جس طرح اپنے زمانے میں مولانا روم نے پیش کیا تھا۔ ع

شعلہ در گیہ ز دہر خس و خاشاک من
مرشد رومی کہ گفت منزل ما کبریاست

یعنی مرشد رومی نے جب یہ کہہ دیا کہ ہماری منزل اللہ تعالیٰ ہے تو اس سے میرے خس و خاشاک میں گویا ایک شعلہ آ گیا۔

چوں رومی در حرم دادم اذاں من — از وآموختم اسرار جاں من
بہ دورِ فتنۂ عصر کہن او — بہ دور فتنۂ عصر رواں من

یعنی رومی کی طرح میں نے بھی حرم میں اذان دی اور رومی ہی سے میں نے اسرار جاں کا سبق سیکھا اپنے زمانے کے دورِ فتنہ کے دفعیہ کے لئے وہ تھے عصر رواں کے دور فتنہ کے لئے میں ہوں۔

رسالت

اسلام ایک ضابطہ حیات ہے اور زندگی کو ایک وحدت قرار دیتا ہے۔ اسلام عقائد اعمال کا مجموعہ ہے اور حیات انسانی کا کوئی شعبہ خواہ وہ معاشرت سے تعلق رکھتا ہو یا سیاست سے اس کے دائرہ عمل سے باہر نہیں ہے۔ اسلام نے زندگی کے لئے قوانین اور ضوابط مرتب کئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کرنے والا واقعی فطرتِ انسانی کے رموز کا آشنا ہے۔ کیونکہ اسے فطرتِ انسانی کے خالق نے ہی یہ سب باتیں بتلائی اور سکھائی ہیں۔ اسی کا نام رسالت یا پیغمبری ہے۔ رسالت کا تعلق صرف عبادات سے نہیں بلکہ ہر معاملات سے خواہ وہ کسی قسم کے ہوں اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے سامنے سرخم کرنے سے ہے۔ عبادات و معاملات دونوں کا منشا خالقِ موجودات سے اپنا تعلق جوڑنا اور رشتۂ عبد و معبود کو مستحکم کرنا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ رسالت کے ڈانڈے الوہیت سے بالکل نہیں ملتے بلکہ رسول یا نبی ایک بشر ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس پر وحی آتی ہے اور وہ خدا سے کلام کرتا ہے اور اس سے احکام حاصل کر کے نوعِ انسانی کو یا جس پر وہ مامور ہوا ان کے پاس پہنچاتا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اس سلسلے کے قدیم عقائد کیا ہیں جو شروع سے چلے آرہے ہیں اور جن میں کسی قسم کا ابہام یا اختلاف کبھی پیدا نہیں ہوا۔ متفقہ طور پر یہ تسلیم کیا ہے کہ کسب سے یا عبادت و ریاضت پاکیزگی و طہارت سے خواہ کسی قدر ایک انسان کے اندر جمع ہوں کوئی شخص نبی نہیں ہوسکتا۔ نبی معبوث من اللہ ہوتا ہے۔ نبی بطن مادر میں بھی نبی ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہتا ہے اس لئے وہ معصوم ہوتا ہے۔ اس سے کسی قسم کا گناہ سرزد ہو ہی نہیں سکتا۔ انبیائے کرام کے مدارج ہیں۔ ان کو ایک خاص وقت اور ایک خاص قطعہ ارضی کے لئے نبی بنایا جاتا ہے اور یہ بات اس طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ نبی تو ابتدائے آفرینش سے انسانوں کو نیک بنانے اور ان کو رمزِ حیات سمجھانے اور ضابطہ اخلاق عطا کرنے کے لئے آتے رہے۔ ایک وقت تھا کہ انسان دریا پار کرنا نہیں جانتا تھا تو اگر ایک شخص ایسے مقام کا نبی بنا دیا جاتا جو دریا کے دونوں طرف واقع ہوتا تو آخر وہ کیسے اپنا پیغام انسانوں تک پہنچاتا۔ اس لئے دریا کے اس پار ایک نبی اور دریا کے دوسری طرف دوسرا نبی ہوتا تھا۔ اس طرح جو پیغام وہ لاتے تھے یا جو ضابطہ حیات وہ پیش کرتے تھے وہ ایک وقت یا زمانے کے ساتھ محدود ہوتا تھا اور اس کے بعد دوسرا نبی آتا تھا اور پیغام بدل جاتا تھا۔ احکام میں تبدیلی ہو جاتی تھی۔ ذہن انسانی کی جہاں تک رسائی تھی اور تمدن

جس حد تک ترقی کی تھی ان کے لحاظ ہی سے احکام دئے جاتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں یہود کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ کچھ انبیائے کرام کے تذکرے کلام پاک میں درج ہیں اور بہت سے لوگوں کا تذکرہ نہیں آیا۔ جن کا تذکرہ نہیں آیا اور وہ خاتم النبیین سے پہلے تھے ان کا علم ہم کو نہیں ہے۔ اگرچہ یہ طے شدہ ہے کہ خشک وتر کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں پیغمبر نہ آئے ہوں کرہ ارضی کے ہر قطعہ پر اور ہر زمانے کے ہر دور میں انبیاء علیہ السلام آتے رہے ہیں اور پیغام ربانی اپنے امتیوں کو سناتے رہے ہیں۔ بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ کلام پاک میں عرب کے علاوہ دیگر ممالک کے نبیوں کا حال کیوں درج نہیں ہے۔ اس کے پیچھے ایک گہرا فلسفہ ہے لیکن سادہ سی بات یہ ہے کہ قرآن شریف کوئی تاریخ یا جغرافیہ کی کتاب نہیں ہے بلکہ تہذیب نفس اور اصلاح اخلاق کا قانون ہے اور چونکہ اولین مخاطب اس کے اہلِ عرب تھے اس لئے وہیں کے انبیاء کا تذکرہ کیا گیا۔ یہ تذکرے تاریخی روایات کے طور پر نہیں ہیں بلکہ روحانیت اخلاق اعلیٰ اور تزکیہ نفس کے لئے مثالیں ہیں اور مثالیں کہیں سے لی جا سکتی ہیں مگر وہ ایسی ہونی چاہئیں جو ذہنوں کو متاثر کر سکیں اور دماغوں پر چھا جائیں تا کہ ان سے پورا نفع حاصل ہو سکے سب سے آخر میں افضل البشر خاتم النبیین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ معبوث کئے گئے۔ آپ آخری نبی تھے اور آپ کا پیغام آخری پیغام تھا اور آپ کل بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے۔ آپ بشر تھے اور آپ کا سب سے بڑا درجہ یہ تھا کہ آپ عبد تھے چنانچہ معراج مبارک جو آپ کی منزلت شان کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن نے آپ کی رفعت وعلو مرتبت کا اظہار پیغمبر یا نبی کے لفظ سے نہیں بلکہ عبد کے لفظ سے کیا ہے۔ سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلاً مِنَ المسجد الْحَرَام اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی (پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو رات میں مسجد حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک) اسی طرح جو کلمہ خلاصہ کائنات ہے اس میں آپ کو عبدہٗ کہا گیا اور اس کے بعد رسول کہا گیا یعنی عبدہٗ کا لفظ پہلے آیا اور رسول کا لفظ بعد کو۔ آپ تمام دنیا کے انسانوں میں سب سے اعلیٰ واقع تھے۔ آپ کی ذات ستودہ صفات نیک کرداروں کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ آپ کا اخلاق قرآن کے مقصدی احکام کی تشریح ہے۔ آپ سے بہتر انسان پر یہ آفتاب کبھی طلوع نہیں ہوا۔ آپ سے محبت اللہ سے قرب کے حصول کا ذریعہ ہے۔ باپ، ماں، بھائی، اولاد سب سے زیادہ آپ سے محبت کرنا اور ان سب کو آپ پر قربان کرنے کے تیار رہنا ہر مومن کا

لئے تیار رہنا ہر مومن کا خاصہ ہے اور اگر اس میں کمی ہو تو ایمان میں کمی ہے۔ ''عشق رسول'' سب سے اعلیٰ درجہ عبدیت کا ہے۔ یہ ہیں مختصراً وہ عقائد جو بلا اختلاف اسلام کے ہر فرقہ کے اندر موجود ہیں اور جو خالص اسلامی تعلیم ہے۔ اقبال کا نظریہ بھی وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا۔ البتہ جیسا کہ بار بار کہا گیا وہ عصر حاضر کے تقاضوں کے تحت اور اپنی شاعرانہ عظمت کی شان سے ان باتوں کو اندازِ نو میں بیان کرتا ہے۔ لیکن جب میں مثالیں دوں گا تو ظاہر ہو جائے گا کہ اس کے کلام میں کسی قسم کا ابہام نہیں ہے۔

☆

بشر

بعض لوگ کم فہمی کی وجہ سے بشر یا انسان کے لفظ کو نبی پاک ﷺ کے لئے مناسب تصور نہیں کرتے۔ حالانکہ خود قرآن میں آیا ہے کہ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰیٓ اِلَیَّ ا(کہہ دو کہ میں بھی تمہاری طرح ایک بشر ہوں البتہ مجھ پر وحی آتی ہے) اس لئے ضرورت لاحق ہوئی کہ رسالت کے موضوع پر کچھ اور کہنے سے پہلے انسان کا جو درجہ اسلام کے اندر ہے اسے واضح کر دیا جائے۔ اس کی ضرورت اس وجہ سے بھی ہے کہ بعض شعراء نے نعت گوئی میں بشر سے گریز کرنے میں مبالغہ کر دیا ہے۔ جو قطعی حکم الٰہی اور تادیب نبوی کے خلاف ہے۔ مثلاً ایک صاحب فرماتے ہیں۔ ع

محمدؐ سرِ وحدت ہے کوئی رمز اس کا کیا جانے
شریعت میں تو بندہ ہے حقیقت میں خدا جانے

یا اتر گیا ہے مدینہ میں مصطفےٰ بن کر

یا میرے بچپن میں ریکارڈ پر ایک گیت گایا جاتا تھا اور لوگ شوق سے سنتے تھے وہ بھی اس قسم کا ہے۔

مدینہ میں مور پیا بالا ہے رہے
عمامہ کھڑے باندھے تھے شاہ دل نواز
جبریل سے فرمایا او ہمدم و دمساز
پردہ کو اٹھا دیکھ تو پوشیدہ ہے کیا راز

جبریل نے کی عرض کی قدرت مجھے کیا ہے
محبوب نے فرمایا کہ جا میری رضا ہے
پردہ جو اٹھا تو نہ واں آیا نظر کچھ
جو کچھ یہاں تھا وہ وہاں ہے جو وہاں تھا وہ یہاں ہے
پردہ میں خدا ہے نہیں محبوب خدا ہے
عمامہ اسی طرح کھڑا باندھ رہا ہے
مدینہ میں مور پیا بالا ہے رے

والہانہ عشق ومحبت حدود متعینہ سے گریز کر کے خلاف اصول باتیں کہہ دینا صرف بعض اشعار نعتیہ اور گیتوں میں ملے گا جن کی کوئی اصولی حیثیت نہیں ہے۔ اسلام کا کوئی فرقہ ایسا نہیں ہے جو نبوت کے ساتھ الوہیت شامل کرے۔ ایشور کے اوتار کا عقیدہ اسلام کے کسی فرقے میں نہیں پایا جاتا ہے۔ اسلام اس سے قطعی نا آشنا ہے۔ اسلام نے نبی یا پیغمبر کو صرف بشر قرار دیا ہے جو لوگ حد سے متجاوز ہو گئے وہ بھی سمجھتے ہیں کہ یہ حد سے تجاوز ہے۔ اسلام ایک مدون ومرتب قانون کی شکل رکھتا ہے اور ہر مسئلہ کے لئے فتویٰ صادر ہوتا ہے جو مستند علماء کرام دیتے ہیں وہی اصل عقیدہ ہے اگر کسی فرقہ کے کسی عالم مستند سے فتویٰ دریافت کیا جائے تو وہ قرآن کی نص صریح جس میں لفظ بشر آیا ہے اور کلمہ شہادت جس میں ہر مسلمان آپ کو عبد کہتا ہے اس کے خلاف کیا کہہ سکتا ہے۔ لہذا ان غیر ذمہ دارانہ سطحی باتوں سے کوئی اثر قبول کرنا غلط اور خلاف انصاف ہوگا۔ یہ بات ایسی نہیں تھی جس کا نوٹس لیا جاتا یا جسے قابلِ بحث قرار دیا جاتا لیکن میری زندگی میں ایک واقعہ پیش آیا جس سے میں نے اس کی ضرورت محسوس کی۔ عرصہ ہوا بستی میں ایک جج ضمیر الاسلام تھے۔ اسی زمانے میں ایک منصف کرشن چندر نام کے تھے جو صوفی تھے اور جن کا دعویٰ تھا کہ ان کو مسلمان بزرگوں سے بھی فیض حاصل ہوتا ہے۔ وہ اپنے وارداتِ قلب کے واقعات اکثر بیان کیا کرتے تھے۔ ضمیر الاسلام صاحب بی. ایس. سی منکرِ خدا تھے۔ مگر کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن سے ان میں انقلاب آ گیا۔ اور وہ برابر بزرگانِ دین کے مزار پر جایا کرتے تھے۔ چنانچہ بستی کے وکلاء کو لے کر وہ اجمیر شریف بھی گئے۔ ضمیر الاسلام نے مجھ سے کہا کہ میں ایک جلسہ جو ہندو مسلمانوں کا مخلوط ہو طلب کروں اور اس میں کسی عالم سے اسلامی تصوف پر تقریر کراؤں۔ چنانچہ میں نے شیخ کرم حسین صاحب مختار کی کوٹھی کے صحن

میں ایک جلسہ طلب کیا جس میں حکام او روکلاء اور پبلک کے ممتاز حضرات شریک ہوئے۔اس جلسے کی صدارت پنڈت کیشور پرشاد نے کی جو بستی کے ایک ممتاز اور چوٹی کے وکیل تھے۔تقریر کے لئے میں نے آزاد سبحانی کو تکلیف دی اور اس خیال سے کہ وہ ایک فلسفی بھی تھے اور صوفی بھی اور عالم بھی اور مقرر تو لاثانی تھے۔مولانا آزاد سبحانی نے اپنی تقریر کے دوران میں سرکارِ دوعالم ﷺ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ علماء کہتے ہیں کہ آپ کا نور نور الٰہی سے بنا تھا اور صوفیا کہتے ہیں کہ خود خدا محمد کی شکل میں نمودار ہوا تھا اور میں دونوں میں تطبیق کرتا ہوں۔بس ایک سناٹا چھا گیا اور مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہوا۔مجھ سے ضمیر الاسلام صاحب نے کہا کہ یہ مولانا نے کیا تقریر کر دی اور اس کی کیا اصل ہے۔ایسی غلط بات کیوں کہی گئی۔اتفاقاً اس زمانے میں مولانا آزاد سبحانی کے پیر مولانا ضیاء الدین صاحب بھوپالی "بستی آئے ہوئے تھے اور ظہیر صاحب وکیل کے وہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور واقعہ بیان کیا، اور پوچھا کہ اس کی اصلیت کیا ہے اللہ اکبر۔

مولانا کے چہرے پر غضب کا جلال نمودار ہوا آنکھیں سرخ ہو گئیں، چہرہ تمتما اٹھا اور ڈپٹ کر مجھ سے کہا کہ پڑھو کلمہ شہادت۔اشھدُ اَنْ لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللہ و اشھدُ اَنَّ مُحمداً عبدہ "بس یہیں تک پہنچا تھا کہ وہ گرجے "رک جاؤ" میں خاموش ہو گیا تو فرمایا کہ عبدہٗ پر عقیدہ ہے کہ یا نہیں۔میں نے کہا ہے تو کہا تو پھر کیوں مجھ سے سوال کیا۔اسلام کے بنیادی مسائل وعقائد پر سوال کے کیا معنی اور پھر فرمایا کہ ایک صوفی بہلول گزرے ہیں انہوں نے کہا ہے کہ من از پیش خدا بودم دہ سال یعنی میں اللہ تعالیٰ سے دس سال قبل سے ہوں تو پاگلوں کے پیچھے ہم کہاں تک گھومتے پھریں گے۔میں چپ تھا۔آخر فرمایا کہ جاؤ اب کبھی اس طرح کے معاملات میں سوال نہ کرنا اور نہ کسی قسم کا شک لانا۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کی بشریت کس درجہ مسلم ہے۔مولانا ضیاء الدین بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف ایک عالم دین بلکہ ایک صاحب نسبت بزرگ اور صوفی بھی تھے۔لیکن اسلام کا عقیدہ اس معاملے میں اس درجہ واضح اور روشن ہے کہ کسی قسم کے شک یا ابہام کی اس میں گنجائش نہیں ہے۔اور کیوں نہ ہو جب نص صریح اس پر شاہد ہے اور کلمہ شہادت کے اندر اس کا تذکرہ ہے۔اس کے خلاف کسی کو لب کشائی کی گنجائش کہاں ہے۔اس سے قبل میں توحید کی بحث میں مولانا ابوالکلام آزاد کا قول نقل کر چکا ہوں۔جس سے واضح ہے کہ یہ مُسئلہ مسلمات دین میں سے ہے مولانا کا وہ قول یہاں پھر دوہرا دینا مناسب معلوم ہوتا

ہے، فرماتے ہیں: ''یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبرِ اسلامؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں میں بہت سے اختلافات پیدا ہوئے لیکن ان کی شخصیت کے بارے میں کوئی سوال پیدا نہیں ہوا، ابھی آپ کی وفات پر چند گھنٹے بھی نہ گزرے تھے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سرِ ممبر اعلان کر دیا تھا:

''جو کوئی تم میں محمدؐ کی پرستش کرتا تھا سو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ محمدؐ نے وفات پائی اور جو کوئی تم میں اللہ کی پرستش کرتا تھا تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کی ذات ہمیشہ زندہ ہے اسے موت نہیں۔''

حضور ﷺ کو انسان کہنے میں بعض پروانۂ شمعِ نبوت نے اپنے والہانہ عشق میں جو لچک محسوس کی اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے انسان کے درجہ کو نہیں پہچانا۔ انسان کی نافرمانیاں، اس کے جرائم شدیدہ، اس کے اخلاق کی گراوٹ جو عام ہوتی جاتی ہے ان سے انسان کو کمتر سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور یہ لقب اسے سبھی لوگ دیتے ہیں لیکن اس کے دوررس تقاضوں کو کبھی کبھی بھول جاتے ہیں۔ مولانا حالی نے کہا ہے کہ۔ ع

فرشتہ سے بڑھ کر ہے انسان ہونا　　مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

انسان کا درجہ اسلام میں بہت بلند ہے۔ وہ براہِ راست خدا سے کلام کر سکتا ہے، اسے کسی وسیلہ یا ذریعہ کی ضرورت نہیں ہر انسان جو اپنی خودی کو بلند کرے وہ اللہ تعالیٰ سے کلام کر سکتا ہے، آج بھی کر سکتا ہے۔ البتہ احکام حاصل کرنا صرف انبیاء کرام کا کام ہے۔ ہر انسان کا یہ حق نہیں ہے کہ وہ ہدایت و رشد کے احکام اللہ تعالیٰ سے حاصل کرے یہ منصب صرف پیغمبروں کا ہے اور یہی فرق ہے انسان اور پیغمبر میں۔ چنانچہ اقبالؔ نے سب سے پہلے ''انسان'' کے درجہ کی وضاحت کی ہے جو عام طور پر لوگ بھول گئے تھے، کہتا ہے ع

بجبریل امیں ہم داستانم　　رقیب و قاصد و درباں ندانم

یعنی جس طرح ناموس اکبر حضرت جبریل علیہ السلام براہ راست اللہ تعالیٰ سے پیغام لاتے تھے میں بھی ایک انسان کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ سے کلام کرتا ہوں۔ رقیب و قاصد و درباں سے ناآشنا ہوں۔ اصل غرض تو اقبالؔ کی یہ ہے کہ ان کا پیغام خاص الخاص اسلام کا نچوڑ ہے۔ اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں۔ لیکن اس سے انسان کے مدارج کا بھید پتہ چلتا ہے۔ یہ تو دکھلایا جا چکا ہے کہ انسان کائنات کو مسخر کر سکتا ہے اور اپنے قبضہ میں لا سکتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی اور مخلوق حتیٰ کہ فرشتوں کو بھی یہ درجہ نہیں دیا۔ تو ظاہر ہے کہ اس کے مدارج روحانیہ بھی اسی حد تک بلند ہوں گے۔ کیونکہ عطاء خاص مقربانِ خاص ہی کے

لئے ہے۔ بانگ درا میں ''انسان'' کے عنوان سے کہا ہے کہ ع

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں　　انسان کی ہر قوت سرگرم تقاضہ ہے
اس ذرّہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم　　یہ ذرہ نہیں شاید سمٹا ہوا صحرا ہے
چاہے تو بدل دے ہیئت چمنستاں کی　　یہ ہستی دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے

تسخیر فطرت کے عنوان سے جو ڈرامہ کی شکل میں کلام ہے ''میلاد آدم'' کے تحتی عنوان میں انسان کی اصل حیثیت کو ظاہر کیا ہے۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگر ے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظر ے پیدا شد

فرشتے آدم سے پہلے موجود تھے لیکن وہ حسنِ الٰہی کے لئے نظر نہیں رکھتے تھے۔ وہ صفت عشق سے متصف نہ تھے۔ جب آدم علیہ السلام عالم وجود میں آئے تو عشق نے نعرہ مارا کہ ایک خونین جگر پیدا ہوا یعنی وہ پیدا ہوا جو عشق الٰہی کا سزاوار ہے اور جس نے سمجھا کہ صاحبِ نظر آ گیا وہ اب اسے جانے پہچانے گا۔ کتنا بلند مرتبہ ہے انسان کا۔

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبد دیرینہ درے پیدا شد

یعنی زندگی نے کہا کہ تمام عمر میں تڑپتی رہی اب آدم کی پیدائش سے اس گنبدِ دیرینہ میں در پیدا ہوا۔

خبرے صفت نہ گردوں بہ شبستانِ ازل
خدا اے پردہ کناں پردہ درے پیدا شد

گردوں سے شبستانِ ازل میں یہ خبر بھیج دی گئی کہ اے پردہ کناں ڈرو اب پردہ در پیدا ہو گیا یعنی انسان رموزِ معرفتِ الٰہی و رازِ کائنات کا علمداں ہے۔

یہ ہے وہ انسان جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے نوامیس بطور امانت سپرد کئے کہ وہ بنی نوعِ انسان کو صحیح راہِ عمل کی تعلیم دے یہ بات کہ ناموس اکبر خود پیغام انسانوں تک نہیں لاتے تھے اور ان کے لئے منتخب نہیں کئے گئے بلکہ وہ صرف اس لئے چنے گئے کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام یک منتخب بشر کو پہنچا دیں اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کا درجہ فرشتوں سے افضل ہے اور خلاصہ کائنات وہ بشر ہے جو تمام بنی نوعِ انسان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے روزِ قیامت تک کے واسطے چنا گیا۔

نیابت الٰہی

نبوت نیابت الٰہی ہے اور یہ مخلوق کا سب سے بڑا درجہ ہے۔ نبی صرف افراد کی ہدایت کے لئے نہیں آتا بلکہ ملّت کی بھی تعمیر کرتا ہے اور افراد اور ملت میں ربط پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح اسلام ایک طرف خانقاہی سے ممیّز ہوتا ہے جو صرف فرد کی تہذیب نفس تک محدود ہے اور دوسری طرف کمیونزم جس کی نگاہ صرف قوم یا جماعت تک ہے انفرادی ،اخلاقی واعمال صالحہ اس کی حد سے باہر ہیں۔ اقبالؔ کا طرزِ فکر یہ ہے کہ وہ اوّلاً ربط فرد و ملت پر زور دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ:

فرد را ربط جماعت رحمت است　　جوہر اور اکمال از ملت است

یعنی فرد کے لئے جماعت کا ربط رحمت ہے اور اس کا جوہر کمال ملت سے حاصل ہوتا ہے۔

حرز جاں کن گفتہ خیر البشر　　ہست شیطاں از جماعت دور تر

نبی پاک ﷺ کے اس قول کو حرز جاں بناؤ کہ شیطان جماعت سے دور رہتا ہے۔

فرد می گیرد ز ملت احترام　　ملت از افراد می باید نظام

فرد کو ملت سے احترام ملتا ہے اور ملت فرد سے منظم ہوتی ہے۔

نخچہ تر از گرمی صحبت شود
تا بمعنی فرد دہم ملت شود

گرمی صحبت سے فرد نخچہ تر ہو جاتا ہے حتی کہ حقیقتاً خود فرد خود ملت بن جاتا ہے۔

فرد تنہا از مقاصد غافل است
قوتش آشفتگی را مائل است

فرد تنہا ہے جو مقاصد زندگی سے غافل ہو جاتا ہے۔ اور اس کی قوت پریشانی کی جانب مائل ہو جاتی ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں دینے کے بعد اقبالؔ کہتا ہے کہ ملت اختلاط فرد سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی تکمیل و تربیت نبوت ہی سے ممکن ہے یعنی اگر ملت کی تربیت نوامیس الٰہیہ کے ذریعہ جو انبیا کرام کو تفویض ہوتے ہیں نہیں ہوگی تو عالم میں خیر قائم نہ ہوگا۔

ملت کا کام افراد کو ایک رشتہ میں پرونا ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج دریا میں ہے اور بیرون دریا کچھ نہیں
مرد ماں خوگر بیک دیگر شوند
سفتہ در یک رشتہ چوں گوہر شوند

افراد ایک دوسرے کے خوگر ہو جاتے ہیں اور موتی کی طرح ایک رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں مثال کے طور پر کہتا ہے۔

محفل انجم ز جذب باہم است ہستی کوکب ز کوکب محکم است

ستاروں کی محفل ستاروں کے باہمی ارتباط سے سجتی ہے اور ایک ستارہ دوسرے ستارے کو محکم کرتا ہے۔ انسان جماعت پسند ہے لیکن نوامیس الٰہیہ نہ ہونے سے ایک بھیڑ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ نہ آرزو نہ مقاصد اس خاک کا سبزہ نو رسیدہ اور اس کی رگوں میں خود سرد ہوتا ہے۔ دیو اور پری اس کے تخیلات پر چھائے رہتے ہیں اور صرف گمان و وہم پر اس کے تصورات کا انحصار ہوتا ہے۔ جان کا خوف اسے گھیرے رہتا ہے اور وہ تیز ہوا سے بھی ڈرتا ہے۔ سخت کوشی سے بھاگتا ہے اور دامن خطرات پر پنجہ کم مارتا ہے۔

نو دمیدہ سبزہ خاش ہنوز سرد خوں او رگ تاکش ہنوز
منزل دیو و پری اندیشہ ای از گمانِ خود رمیدن پیشہ ای
تنگ میداں ہستی خاموش ہنوز فکر او زیر لب باش ہنوز
بیم جاں سرمایۂ آب و گلش ہم ز بادِ تند می لرزد دلش
جان او سخت کوشی ام زند پنجۂ در دامانِ فطرت کم زند

یہ حال انسان کی بھیڑ کا ہوتا ہے۔ اقبالؔ اس دور کا تصور پیش کرتا ہے جب کوئی نائب خدا نوامیسِ الٰہیہ لے کر نہیں آیا۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ خدا ایک صاحب دل پیدا کرتا ہے اور پھر وہ ایک انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ اقبالؔ یہ تصور پیش کرتا ہے کہ صرف نبوت سے انسان کی جمعیت کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ جب نبی آتا ہے تو حالت یہ ہوتی ہے کہ اس کے ساز کے دو مقامات (یعنی دین اور دنیا) کی آواز سے خاک کو حیات تازہ مل جاتی ہے۔ ذرہ بے مایہ چمک اٹھتا ہے اور ہر متاعِ حیات کو جدید سرفرازی حاصل ہوتی ہے۔

ذرہ بے مایا ضو گیر دازو　　ہر متاعِ روحِ نو گیر دازو

اور اس طرح بہت سی مثالیں دینے کے بعد کہتا ہے۔

عقل عریاں را دہد پیرایۂ　　بخشد ایں بے مایہ را سرمایۂ

عقل جو بالکل برہنہ تھی اس کو لباس عطا کرتا ہے اور اس بے مایہ کو سرمایہ بخشتا ہے۔

بندہ ہا از پا کشاید بندہ را　　از خداوندان رباید بندہ را

بندوں کے پیر سے غلامی کی زنجیر کاٹ ڈالتا ہے اور جو خداوند بندوں نے بنا رکھے تھے ان سے نجات دلاتا ہے۔

نکتۂ توحید باز آموزدش　　رسم و آئین نیاز آموزدش

از سرِ نو نکتۂ توحید سکھاتا ہے اور بارگاہِ رب العزت رسم آئین نیاز کی تعلیم دیتا ہے۔

یہ نیابتِ الٰہی کا درجہ ہے اور اسی سے بنی نوع انسان کی راہِ ہدایت متعین ہوتی ہے۔ وہ راہِ ہدایت اعمال انفرادی کے لئے اس طرح متعین کی جاتی ہے جس طرح کہ جماعت یا قوم یا ملت کے لئے اور اسی کو عرف عام میں یا شرع کی زبان میں "حزب اللہ" کہا گیا ہے۔ یعنی عوام کی ایک ایسی منظم و تربیت یافتہ جماعت جو نیکوں سے بنی ہو اور جن کے انفرادی اعمال نیکی، سخاوت، قیاضی عفو کرم پر مبنی ہو اور جو جماعت دنیا میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرائض انجام دیتے ہوئے امن و سلامتی خوش حالی اور خوش بختی قائم کرے اور جہاں جہاں ظلم یا ناانصافی ہو اس کو مٹانے کے لئے جان و مال کی قربانی پیش کرے بلا لحاظ مذہب و ملت اور ملک و قوم دنیا کے جس حصہ میں زیادتی یا حق و عدالت کے خلاف کوئی اٹھے اس سے حزب اللہ کا جہاد کرنا اور سرگرمِ عمل ہو جانا فرض ہے اور اسی طرح کی ایک عالمی جمعیۃ جسے خلافت کبریٰ کہہ سکتے اور جس کی اساس نوامیس الٰہیہ پر ہوگی۔ اسلام کی تعلیم اور اقبال کا نظریہ یہ ہے ع

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اس لئے جہاد محض رضائے حق کے لئے ہے اور اگر اس کا محرک جوع الارض ہو تو مذہب اسلام میں حرام ہے۔

ہر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید　　تیغ او در سینۂ او آرمید

یعنی جس نے رضاء حق کے علاوہ کسی اور غرض سے تلوار کھینچی تو اس کی تیغ اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔

ملا جمال الدین افغانی اور اقبال

ملا جمال الدین افغانی کے ساتھ تحریک اتحاد اسلام وابستہ مانی جاتی ہے۔ اور اس کو بھی حیلہ جویانِ فرنگ نے جدید رنگ وروغن دے کر اس کے خط وخال کو بدل دیا اور یہ کہہ دیا کہ ملا جمال الدین افغانی تمام دنیا کی مسلم سلطنتوں کو متحد کر کے عالم پر حکمرانی کا خواب دیکھتا تھا۔ حالانکہ ملا ممدوح کا ہرگز یہ منشانہ تھا۔ وہ تو صرف اس سے متاثر تھے کہ مسلم ممالک اندرونی طور پر کمزور ہو رہے تھے اور سب کے فنا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اسلئے وہ یہ علم لے کر اٹھے کہ ہر مسلم ملک اپنے کو مضبوط کرے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ قانون اسلام کے مطابق کتاب وسنت رائج کیا جائے یہی واحد طریقہ اصلاح اور ترقی کا ہے۔ اقبالؔ کا نظریہ اس سے اس معنی میں مختلف ہے کہ وہ مقصدی باتیں کہتا ہے عملی نہیں وہ اصول سے بحث کرتا ہے۔ اقبالؔ کا خیال ہے کہ عالم میں ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہئے جو قیدِ وطن سے آزاد ہو جس کی اساس وطنیت پر نہیں بلکہ اصول اور قوانین شرع پر ہو جسے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے نبی آخر الزماں ﷺ کے ذریعہ آشکارا کیا ہے۔ اور اس کے لئے وہ پکارتا ہے کہ الفرادی اعمال اور اخلاق کے مطابق احکام الہیہ میں انقلاب لانے کی ضرورت ہے اور پھر اس بنیاد پر جماعت کی تعمیر کرنی چاہئے۔ حالات موجودہ میں وہ جماعت تعمیر ہو سکے گی یا نہیں اس سے اس کو سروکار نہیں ہے وہ تو مبلغ اسلام ہے اور اسلام کے ضمیر کو اجاگر کر رہا ہے ع

تا خلافت کی بنا دنیا میں پھر ہو استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اور وہ مایوس نہیں ہے وہ سمجھتا ہے کہ جتنے ارمان اور فلسفے خواہ وہ نفس حیات سے تعلق رکھتے ہوں یا سیاست داں سے یا معاشرت سے سب میں اسلام ہی کی تعلیمات ایسی ہیں جن کی بنا پر ایسی عالمی جمعیۃ کی تعمیر ہو سکتی ہے کہ زمانہ خود اسے سامنے لائے گا۔ چنانچہ ابلیس کی زبان سے لکھوایا ہے ع

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں

اور پیامِ امید دیتا ہے کہ ع

علم اسماء اعتبار آدم است　　حکمتِ اشیا حصار آدم است

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء کا علم دیا تھا اور یہی علم یا خرد ہے۔ اور اس سے فرشتے عاجز نکلے اس لئے ان کو سجدہ کرنا پڑا۔ اس لئے انسان کے گرد حکمت اشیاء کا حصار ہونا چاہئے۔

دسواں عنوان "در معنی اینکہ کمال حیات ملیہ این است کہ ملّت مثل فرد احساس خودی پیدا کند و تولید و تکمیل ایں احساس از ضبطِ روایات ملیہ ممکن است۔"

یعنی حیات ملیہ کا کمال ہے کہ ملت فرد کی طرح اپنے اندر احساس خودی پیدا کرے اور آشکارا ہو اور یہ احساس اسی وقت ممکن ہے جب روایات ملیہ منضبط کئے جائیں

گیارہواں اور آخری عنوان "در معنی اینکہ بقاء نوع از امومت است و حفظ و احترام امومت اصل اسلام است۔"

یعنی بقاء نسل کا انحصار عورتوں پر ہے اس لئے ان کی حفاظت اور ان کا احترام اصل اسلام ہے۔

حافظ رمز اخوت مادراں
قوت قرآن و ملّت مادراں

مائیں رمز اخوت کی محافظ اور مائیں قرآن و ملّت کے لئے قوت ہیں۔

خاتم اقوام کے خصائص کا نچوڑ

جو خاتم اقوام کی حیثیت سے ملّتِ اسلامیہ عالم میں حکمرانی کے فرائض انجام دینے اور امن و آشتی و انصاف اور رفع شر کے لئے بنی اس کے خصائص حسب ذیل ہیں:

(۱) وہ دنیا میں ہر طرح کی غلامی کا سدباب کر کے حریت قائم کرے گی اور مساوات انسانی اور بنی نوع آدم میں بھائی چارہ کے لئے اصول پر عمل پیرا ہوگی۔ یہی اس کا مقصد ہوگا نہ کہ جوع الارض و قومی عصبیت جن کو وہ گناہ قرار دے گی۔

(۲) چونکہ اس کی بنیاد نوامیس الٰہیہ پر ہوگی اور اصول پر کام کرے گی۔ اس لئے وہ جغرافیائی حدود سے بالاتر ہوگی۔ قومیت اور وطنیت سے متاثر نہ ہوگی۔ توحید و رسالت اس کے دو بڑے رکن ہوں گے۔

(۳) وطن اس قوم یا ملت کی بنیاد نہیں بنے گی۔ وطنیت کی بنیاد پر آج اکثر حکومتیں قائم

ہیں۔صرف کمیونسٹ حکومتیں اس سے مبرا ہیں۔ان کی بنیاد اصول پر ہے لیکن وہ اصول انکار خدا ہے۔ملّت اسلامیہ کی اساس توحید و رسالت ہوگی کیونکہ نوامیس الٰہیہ کے بغیر انسان اپنے مقصد کو پہنچ ہی نہیں سکتا۔

(۴) یہ ملّت کسی خاص وقت کے لئے نہیں بلکہ قیامت تک کے لئے ہے کیونکہ یہ خاتم اقوام ہے اور آخری پیغام ربانی پر مبنی ہے۔آخری نبی آچکا اور آخری امت بن چکی۔

(۵) اس ملّت کا آئین قرآن ہوگا۔جو اللہ کا کلام اور انسان کی ہر طرح کی ہدایت کا صحیفہ ہے۔کوئی آئین کوئی انسان اس کے لئے تیار نہیں کرے گا۔

(۶) اس ملّت کی سیرت میں پختگی آئین الٰہیہ کی اتباع ہی سے پیدا ہوگی۔

(۷) اس ملّت کی سیرت میں حسن اتباع سنت رسول ﷺ سے ہی پیدا ہوگا۔

(۸) اس ملّت کا مرکز بیت الحرام ہوگا۔

(۹) یہ ملّت خانقاہی نہ ہوگی۔ بلکہ قوائے نظامِ عالم کی تسخیر کریگی اور چاند تاروں کو اپنے تصرف میں لائے گی۔

(۱۰) ملّت میں فرد کی طرح احساس خودی نمودار ہوگا اور خودی پاک اور مکمل اس لئے ہوگی کہ وہ روایات ملیہ کو اپنے اندر ضم کرے گی اور اسی دائرہ میں کام کرے گی۔

(۱۱) چونکہ بقاءِ نسل کا انحصار ماؤں پر ہے۔ملّت اسلامیہ عورتوں کی حفاظت اور ان کے احترام کو لازمی قرار دیگی۔

عشق رسولؐ

محمد عربی کہ آبروئے ہر دو سراست بہ کسے کہ خاک درش نیست خاک برسرِ او شاید

ہی کوئی ممتاز شاعر ایسا ہو جس نے جامع صفات و کمالات انسانِ کامل محمد رسول اللہ ﷺ کی شان اقدس میں نعت گوئی کا حق نہ ادا کیا ہو۔وہ سعدی علیہ رحمۃ، امیر خسرو اور فرید الدین عطاءؒ و قدسیؒ و عرشیؒ جیسے بزرگ ہوں یا عرفی و فیضی جیسے رند۔عربی کہتا ہے ع

عرش مشاب ایں رہِ نعت است نہ صحراست

آہستہ کہ حرم برسرِ تیغ است قدم را

ہشیار کہ نہ تواں بیک آہنگ سرودن

نعت شہ کونین و مدیح کے و جم را
تقدیر بیک ناقہ نشانید دو محمل
سلمائے حدوثِ تو د لیلائے قدم را

فارسی شعرا میں ملا جامیؒ اس فن کے استاد اور اس میدان کے سب سے کامیاب شہسوار مانے گئے ہیں۔ اردو شعرا میں محسن کاکوری اور زائر حرم حریم حمید صدیقی نے بڑا نام پیدا کیا۔ ہندو شعرا نے بھی اس عنوان پر گرم جوشی سے طبع آزمائی کی ہے۔ عرش ملسیانی وغیرہ کی نعتیں اگر بلا نام پڑھی جائیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایک والہانہ عشق و محبت میں ڈوبے ہوئے کلمہ گو کا کلام نہیں ہے۔ یہ تو ہے اس شرف انسانیت کی قدر افزائی جس نے عالم کو مسخر کر لیا اور مشک کی وہ خوشبو جو دنیا کے ہر گوشے میں پھیل گئی۔ جوش جیسا بد عقیدہ جو خدا کے وجود کے خلاف ماہر القادری سے بحثیں کرتا رہا۔ آپ کی ذات گرامی کے بارے میں لکھتا ہے کہ

''وہ انسان جس سے بہتر انسان پر یہ آفتاب کبھی طلوع نہیں ہوا۔''

نعت گوئی ایک فن بھی ہے اور ایک عقیدہ بھی۔ نعت گوئی فن کیوں بنی اور اس کے کیا اسباب تھے اگر غور کیا جائے تو اس کی تہ میں ایک بڑا راز نظر آئے گا اور حقیقت نمایاں ہو جائے گی۔ کسی چیز کی قدر و منزلت بلا وجہ نہیں ہوتی۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ کی زندگی کی ایک ایک چیز اور آپکا ایک ایک عمل محفوظ ہے جو آپ نے فرمایا اس کا ایک ایک لفظ موجود ہے اور ہر عمل ہر بیان کے پرکھنے کے لئے کتاب ہے جس کا نام اسماء الرجال ہے جس میں ان تمام لوگوں کی زندگیوں کے حالات درج ہیں، جنہوں نے حدیثیں بیان کیں اور ان سے صحیح اور غلط معیار قائم کیا جاتا ہے۔ تاریخ کا یہ وہ کارنامہ ہے جس کی نظیر موجود نہیں ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کا اسوۂ حسنہ تمام عالم کے لئے بنایا تھا۔ اور اس لئے اس نے خود آپ کی زندگی کے ایک ایک واقعہ کو من وعن محفوظ کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اور قرآن پاک کی اس آیت کا بھی مادی ثبوت ہے کہ ''رفعنالك ذكرك'' یعنی آپ کا ذکر بلند کر دیا گیا۔ آپ کے ذکر کو بلند کرنے کا صرف یہ کرشمہ نہیں ہے کہ آج ریگستانِ عرب کی وہ آواز اذان جو حبشی غلام بلالؓ کے حلق سے نکلی تھی۔ چار دانگ عالم اور بحر و بر میں آپ کی رسالت کے اعلان کے ساتھ گونج رہی ہے بلکہ آپ کے محاسن وصفات کو بیان کرنے سے کل حق پسند اور معنی آشنا اپنے کو عاجز پاتے ہیں۔ روضۂ اقدس کے بارے میں عرشی کہتے ہیں ع

ادب گاہے است زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس کم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

ایک بزرگ فرماتے ہیں :

نسبت خود بسگت کردم و بس منفعلم
زانکہ نسبت بہ سگِ کوئے تو شد بے ادبی

زائرِ حرم نے ایک عجیب محویت کے عالم میں سلام لکھا ہے۔ سرکار کو سلام تو تقریباً سب لوگوں نے لکھا ہے لیکن زائرِ حرم کا انداز انوکھا ہے۔ ان کے عشق و مستی کا عالم ہی دوسرا ہے۔ دیکھئے کس کس کو حالاتِ وجد میں سلام کرتے ہیں۔ حتیٰ کی آپ کی گلی کے کتوں کو بھی قابلِ احترام تصور کیا ہے:

جو پھرا کرتے ہیں مستوں کی طرح گلیوں میں — ان سگانِ بلد شاہ رسولاں کو سلام
جن کو حاصل ہے شرف آپ کی پابوسی کا — اس گلی کوچے کے ذرات درخشاں کو سلام
نگہ سرورِ کونین پڑی ہے جن پر — جادہ و منزل و کہسار و بیاباں کو سلام
جن کے صدقے میں خلش ہوتی ہے اب تک دل میں — سنگریزوں کو اور ان خار مغیلاں کو سلام
پا پیادہ جو ملے راہ میں دیوانہ شوق — اس غریب الوطن و بے سروساماں کو سلام
نعت پڑھتا ہوا مل جائے جو کوئی یمنی — غائبانہ مرا اس مست غزل خواں کو سلام

اور شروع میں جس انداز بیان کی ندرت سے حضور سرورِ کائنات کو سلام لکھا ہے۔ اس کی مثال مجھے تو کہیں نہیں ملی:

زائرو پیش کرو جب شہ ذیشاں کو سلام — ہم غریبوں کا بھی سلطانِ غریباں کو سلام
عرض کرنا بکمالِ ادب و شوق و نیاز — قبلۂ اہلِ وفا کعبۂ ایماں کو سلام
یاد رکھنا حرم پاک کے جانے والو — مجھ گنہگار کا اس رحمتِ یزداں کو سلام
بھول جانا نہ کہیں وقتِ تلاوت للہ — مہبطِ روحِ امیں حاملِ قرآں کو سلام
گوشہ گوشہ پر شبستانِ رسالت کے درود — روضہ و منبر و محرابِ درخشاں کو سلام

اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ انسان کو اپنی کمتری اپنے سے برتر کے مقابلہ سے معلوم ہوتی ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلعم کے مراتب کی بلندی کا تصور کرنے سے انسان اپنے کو ایسا ہیچ اور کم مایہ پاتا ہے کہ ذرۂ بے مقدار کا لفظ بھی موزوں نہیں آتا ہے۔ اس لئے کسرِ نفسی اور خاکساری سے نہیں بلکہ قطعی حقیقت شناسی کے طور پر اپنی حقارت پر افسوس اور

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش　　اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیمانِ سجود　　پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں　　محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

خاتم النبیین

پیغمبر آخر الزماں خاتم النبیین خیر البشر امام الانبیا حبیب رب العالمین احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ ﷺ کی ذات پاک سے اقبال کو ایسا کمال درجہ کا عشق ہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے ع

کشتہ انداز ملا جامیم　　نظم و نثر او علاج خامیم

ملا جامی ایک مشہور عاشق رسولؐ تھے اور انہوں نے نعت میں جو اشعار لکھے ہیں وہ اندازِ سخن وحدت قلب کے کمالات سے تصور کیے جاتے ہیں۔ اقبال کہتا ہے کہ ملا جامی کے انداز پر فدا ہوں اور جامی نے جو نظم و نثر لکھ دی وہ میری خامیوں کا علاج ہے۔

تب وتاب بتکدۂ عجم نر سد بسوز گداز من
کہ بیک نگاہِ محمد عربی گرفت حجاز من

یعنی عرب یا اسلام سے باہر کل دنیا یعنی عجم ایک بتکدہ ہے اور اس میں بڑی تب و تاب ہے لیکن وہ میرے سوز و گداز کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ وہاں تک اس کی رسائی نہیں۔ کیونکہ محمد عربی صلعم نے ایک نگاہ میں مجھے عجم سے حجاز میں پہنچا دیا۔

لیکن اس پر سیر حاصل بحث بعد کو ہوگی سرِ دست خاتم النبیینؐ کے نکات کو بیان کیا جاتا ہے۔ خاتم النبیین کی مثال اس طرح ہے کہ جیسے ایک مسافر تاریک رات میں ایک ناہموار اور پہاڑی راستہ طے کرتا ہے۔ گھپ اندھیرا ہے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اچانک بجلی چمکتی ہے اور مسافر دو چار قدم آگے بڑھتا ہے حتیٰ کی چاند پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہو جاتا ہے اور مسافر آسانی سے اپنی منزل کی جانب رواں ہو جاتا ہے۔ آج علم اور سائنس کا زمانہ ہے۔ سمندروں کو عبور کرنا، دور دراز مقامات سے باتیں کرنا حتیٰ کہ خلاء میں پرواز کرنا اور

چاند اور مریخ تک پہنچنے کی کوشش خرد انسانی کے کمالات سے نہیں اس کے ادنیٰ کرشمے ہیں۔ آج پیغام ربانی کو پہنچانے اور بنی نوع انسان کو نوامیس الٰہیہ سے روشناس کرنے میں کسی قسم کی دقت نہیں۔ لیکن آج پیغمبر آخر الزماں صلعم اپنی جسدی و مادی شکل میں ہمارے اندر موجود نہیں ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کا نائب اور جانشین کون ہے۔ اقبالؔ خاتم النبیینؐ کے ساتھ خاتم اقوام کا بھی تخیل پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ملت اسلامیہ نبی پاک صلعم کی نائب اور جانشین ہے۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جب تبلیغی جماعت کی بنیاد ڈالی جواب عالم آشکارا ہو چکی ہے۔ تو اس کے دو بڑے اصول قرار دئے (۱) ایک یہ کہ ہر شخص سے جو مانگا وہ وقت پر مانگا اور (۲) یہ قرار دیا کہ ہر مسلمان اگر ایک کلمہ جانتا ہے تو وہ دوسروں تک پہنچائے کیونکہ امت نبی کی جانشین ہے۔ اس سے قبل یہی کہا جاتا تھا اور یہی سمجھا جاتا تھا کہ علماء پیغمبرِ اسلام کے وارث ہیں اور اس میں یہاں تک غلو ہو گیا تھا کہ قرآن پاک اور حدیث شریف کے ترجمے بلا امداد نگرانیِ علما ناجائز تصور کیا جاتا تھا۔ مولانا محمد الیاسؒ نے اس غلطی پر سے پردہ اٹھایا۔ جس شخص نے سب سے پہلے آواز بلند کی وہ علامہ اقبالؔ تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مولانا الیاسؒ نے اسے عملاً کر کے دکھایا اور اقبال چونکہ صرف مقصدی باتیں کہتا ہے۔ وہ اصول بتا کر رہ گیا۔ چنانچہ طوالت کو نظر انداز کرنے کے لحاظ سے رموزِ بیخودی کے ابواب کے صرف عنوانات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں جن سے اقبالؔ کا نظریہ واضح ہو جائے گا۔

''در معنی ایں کہ مقصود رسالت محمدیہ تشکیل و تاسیس حریت و مساوات و اخوت بنی نوع آدم است''

یعنی کہ رسالت پیغمبر آخر الزماںؐ کا مقصود حریت، مساوات اور بنی آدم میں اخوت قائم کرنا ہے۔

امت محمدیہ کی شان وہ بتلاتا ہے کہ وہ ہر غلامی سے آزاد ہو کر صرف چراغِ مصطفےٰ ﷺ کی پروانہ ہے۔ مرسل اور انبیاء اس کے بزرگ یا پوروج ہیں۔ اور اس کا اصول۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ہے یعنی اکرم وہی ہے جو متقی ہے، ذات پات علم و دولت سے کسی کو برتری حاصل نہیں، صرف پاکیزگی اور اخلاق انسان کو بلند کرتا ہے۔ اس میں سب مومن بھائی بھائی ہیں اور حریت اور آزادی اس کی رگ رگ میں بھر جاتی ہے۔ امتیازات سے وہ بالاتر ہوتی ہے اور مساواتِ انسانی پر اس کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

امتے از ماسوا بیگانہ بر چراغ مصطفےٰ پروانہ

مرسلان و انبیاء آبائے او　　اکرم سرمایۂ آب و گلش
نا شکیب امتیازات آمدہ　　در نہادِ او مساوات آمدہ

اس کے بعد بطور مثال اخوت اسلامیہ کا ایک واقعہ درج کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب ایران سے جنگ ہو رہی تھی تو شہنشاہ ایران یزدگرد کا ایک امیر جاباں نامی گرفتار ہو گیا۔ اس نے امان مانگی اور ایک مسلمان سپاہی نے اسے معمولی آدمی سمجھ کر امان دیدی۔ فتح کے بعد جب معلوم ہوا کہ یہ جاباں سپہ سربازانِ ایران ہے تو لوگوں نے اس کے قتل کا مطالبہ کیا لیکن حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلامی لشکر کے سپہ سالار نے کہا کہ ہم مسلمان ہیں اور ہم ایک آہنگ ہیں۔ ہمارے یہاں نعرہ، حیدر ندائے بوذر اگرچہ غلام قنبر یا بلال کے حلق سے نکلے چونکہ فرد سے ملت بنتی ہے اس لئے فرد کا پیمان ملت کا عہد ہے اور فرمایا کہ ع

گرچہ جابانِ دشمن ما بودہ است　　مسلماں اورا امان بخشیدہ است
خون او امت خیر الانام　　بردمِ تیغِ مسلماں حرام است

یعنی اگرچہ جاباں ہمارا دشمن تھا لیکن ایک مسلمان نے اس کو اماں بخش دی۔ اسلئے اے خیر الانام کے امتیوں اس کا خون مسلمان کی تلوار پر حرام ہے۔ حریت اسلام کا تذکرہ کرتے ہوئے بڑے والہانہ انداز سے واقعہ کربلا اور شہادتِ حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذکر کیا ہے۔ کہتا ہے کہ عشق مومن کا حصہ ہے اور مومن عشق ہی سے بنا ہے۔ عقل سفاک اور چالاک ہے لیکن عشق اس سے زیادہ سفاک اور چالاک ہے اور اس کے ساتھ پاک تر ہے۔ عقل اسباب عمل کے بکھیڑوں میں رہتی ہے اور عشق میدان عمل کا کھلاڑی ہے۔ عقل کے ساتھ خوف اور شک لگے رہتے ہیں اور عشق کے لئے عزم و یقین لازم ہیں اور بہت سی باتیں کہنے کے بعد کہتا ہے کہ تم نے سنا ہے کہ لڑائی کے وقت عشق نے عقلِ ہوس پرور کے ساتھ کیا کیا۔ اس کے بعد حضرت حسین کی مدح بڑے پرشوکت الفاظ میں کرنے کے بعد کہتا ہے، کربلا میں حضرت حسینؓ نے قیامت تک کے لئے قطع استبداد کر دیا اور اپنے موجِ خوں سے چمن ایجاد کیا۔

تا قیامت قطعِ استبداد کرد　　موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد

دوسرا عنوان ہے در معنی اینکہ چوں ملت محمدیہ بر توحید و رسالت است پس نہایت مکانی ندارد۔

یعنی ملت محمدیہ کی تشکیل اصول پر ہوتی ہے اور اس کی بنیادیں توحید اور رسالت

ہیں اس لئے یہ جغرافیائی حدود میں محدود نہیں ہے۔

اس کے بعد تیسرا عنوان ہے "در معنی ایں کہ وطن اساسِ ملت نیست" یعنی وطن ملت کی بنیاد نہیں ہے۔

یہ دونوں عنوانات ایک دوسرے کے اجزا ہیں۔ میں اس سے قبل بحث کر چکا ہوں کہ اقبالؔ اصول کا مبلغ ہے۔ اور مقصدی باتیں کہتا ہے۔ عملی سیاست سے اسے سروکار نہیں ہے۔

چوتھا عنوان ہے "در معنی اینکہ ملت محمدیہ نہایت زمانی ندارد اور دوام ایں ملت شریفہ موعود است۔"

ملت محمدیہ کسی زمانے کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ قیامت تک کے لئے اس کا وعدہ منجانب اللہ تعالیٰ ہو چکا ہے۔

پانچواں عنوان "در معنی اینکہ نظام ملت محمدیہ غیر از آئین صورت نہ بندد او را آئین ملت محمدیہ قرآن است۔"

یعنی ملت محمدیہ کا نظام بلا آئین نہیں بن سکتا ہے اور ملت محمدیہ کا آئین قرآن ہے۔

چھٹواں عنوان "در معنی اینکہ پختگی سیرت ملیہ از اتباع آئین اللہ است"

یعنی ملت کی سیرت میں پختگی آئین الٰہیہ کی اتباع اسی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

تا شعار مصطفیٰ از دست رفت قوم را رمز بقا از دست رفت

یعنی جب شعار رسول صلعم کو ہاتھ سے چھوڑ دیا تب قوم سے رمزِ بقا جاتا رہا۔ مطلب یہ کہ وہ باقی ہی نہیں رہ سکتی اگر نبی کریمؐ کے شعار پر عمل نہ کریگی۔

ساتواں عنوان "در معنی اینکہ حسنِ سیرت ملیہ از تادب بآداب محمدیہ است"

یعنی سیرت ملیہ کا حسن آداب محمدیہ کے سامنے سر جھکانے ہی میں ہے۔

آٹھواں عنوان "حیات ملیہ مرکزِ محسوس می خواہد و مرکز ملت اسلامیہ بیت الحرام است" حیات ملیہ کے لئے ایک خاص مرکز کی ضرورت ہے اور ملت اسلامیہ کا مرکز بیت الحرام ہے۔

نواں عنوان "در معنی اینکہ توسیع حیات ملیہ از تسخیر توانائی نظامِ عالم است" یعنی حیات ملیہ کی توسیع توانائی نظام عالم کی تسخیر سے حاصل ہوتی ہے۔

آپ کی محبت اور شیفتگی میں مست ہو جاتے ہیں۔ شیخ الحدیث مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اس دور کے نہ صرف ایک عالم ربانی گزرے ہیں بلکہ ایک نئے اسلوبِ تحریر کے مالک اور انتہائی ذہین انسان تھے۔ زہد و تقویٰ عبادت و ریاضت میں ممتاز تھے۔ ذرا غور کیجئے وہ آستانۂ نبوت صلعم پر حاضر ہو کر کیا کہتے ہیں ع

ہر ایک سے ٹکرا کر ہر شغل سے گھبرا کر ہر فعل سے شرما کر ہر کام سے پچھتا کر

آمدت بدرت بنگر

اے خاتمِ پیغمبر یا قاسم الکوثر اے سرورِ ہر سرور اے رہبرِ ہر رہبر
اے آنکہ توئی افسر ہر کہتر و ہر مہتر فی المبدء والحشر اے ہستی تو محور
الاکبر و الاصغر اے طلعت تو مظہر الاول و الآخر اے رحم جہاں پرور
آقائے کرم گستر آمد بدرت بنگر

امروز چہ مہمانے نے علم نہ عرفانے نے دین نہ ایمانے نے فضل نہ احسانے
از خانۂ ویرانے وز کلبہ احزانے والحبس وزندانے ناشکرے وکفرانے
آمد بدرت بنگر لرزیدہ پادل مضطر

شاہا تو بمن منگر بر رحمتِ خود بنگر انصاف تو کن آخر غیر از تو مرا دیگر
تو ناظر والناصر والشافع مستغفر

اقبالؔ کے لئے عشق رسول ایک عقیدہ ہے محکم اور پختہ عقیدہ اور دو لفظوں میں یہی ان کا پیام ہے۔ وہ سرمستی اور سرجوشی کے عالم میں سرورِ کائنات ﷺ کا ذکر کرتا ہے۔ اس ذکر میں منطقی دلائل بھی ہیں فلسفہ بھی ہے اور عشق و محبت کی بیتابیاں بھی ہیں۔ اس کی سرمستی کی وجہ یہ ہے کہ وہ آپ کی ذات ہمہ کمالات و صفات کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے کل بنی نوع انسان کے لئے ہدایت و رشد کا پیغام لانے والا اور انسانیت کو وہ منشور دینے والا مانتا ہے جو دو عالم میں اس کی نجات کا وسیلہ اور حیات کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ اس میں کہیں بھی اس نے فنِ شعر کی رعایت سے غلو نہیں کیا۔ اور اس لئے کہیں کہیں اس کی نعتیں، منظوم بحثیں پھیکی نظر آتی ہیں۔ مگر اس کی تلافی وہ دوسری جگہوں پر اپنی اور تمثیلات اور تخلیقِ افکار سے کرتا ہے۔ مثلاً نعرہ "ابوجہل درحرم کعبہ" یہ بھی دراصل ایک نعت ہے۔ حالانکہ اس کو اس طرح ظاہر کیا ہے کہ ابوجہل کعبہ میں اپنے بتوں سے فریاد کر رہا ہے اور ایک طرح سے شکایات کر رہا ہے۔ حالانکہ دراصل انہیں شکایات میں مدح پنہاں ہے۔ مثلاً ابوجہل آپؐ کے بارے میں یہ شکایت کرتا ہے کہ

"باغلامِ خویش بریک خواں نشست"

یعنی اپنے غلام کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے۔ نبیؐ نے اپنی بعثت کے بعد پرانے رسم ورواج اور افکار وقوانین کو ملیامیٹ کر کے ایک جدید سوسائٹی نئے آئین کے ساتھ تعمیر کیا یہ ایک شعلہ تھا جس نے خس وخاشاکِ باطل کو پھونک کر رکھ دیا۔ اس کے بیان کرنے کا ایک انداز براہ راست ہے اور دوسرا تمثیلی مثلاً ابوجہل کی زبان سے براہ راست۔ انداز کبھی پھیکا بھی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اس میں اس کے فلسفہ کا دخل ہوتا ہے اور فلسفہ کی زبان خشک ہوتی ہے۔ لیکن براہ راست بیان کے انداز کا بانکپن بھی حسب ذیل اشعار میں ملاحظہ کیجئے۔ حضرت فاطمہؓ کی مدح کے سلسلے میں کہا ہے کہ ع

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز　　از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز

یعنی حضرت مریم کے اعزاز واکرام کے لئے تو ایک ہی نسبت ہے یعنی یہ کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں تھیں۔ لیکن حضرت فاطمہؓ کو اعزاز واکرام کی تین نسبتیں حاصل ہیں۔

نورِ چشم رحمۃ اللعالمیں　　آں امامِ اولین و آخریں
آنکہ جاں در پیکرِ گیتی دمید　　روزگار تازہ آئین آفرید

یعنی ذات رحمۃ للعالمیں ﷺ کی آنکھوں کا نور (یعنی دختر) اور وہ کون تھے رحمۃ للعالمین وہ امام اولین وآخرین تھے، اور وہ، وہ تھے جنہوں نے جو مردہ ہو چکا تھا جان ڈالی اور نئے آئین تازہ کے ساتھ ایک زمانے کو پیدا کیا۔

دو اور نسبتیں یہ بیان کی ہیں کہ مرتضیٰ مشکل کشا شیرِ خدا کی بی بی اور کاروانِ سالارِ عشق حضرت امام حسینؓ کی ماں، جہاں لہجہ خشک پھیکا اور منطقی ونظریاتی ہے اس کی مثال ذیل میں ملاحظہ ہو:

در دلِ مسلم مقام مصطفیٰ است　　آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است
بوریا ممنونِ خواب راحتش　　تاج کسریٰ زیرپائے امتش
در شبستانِ حرا خلوت گزید　　قوم او آئین وحکومت آفرید
ماند شبہا چشم او محروم نوم　　تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم
از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد　　ہمچو او بطن اُم گیتی نزاد

یعنی مسلمان کے دل میں حضرت محمد ﷺ کا مقام ہے اور ہماری آبرو آپ ہی کے نام سے ہے۔ آپ ٹاٹ پر سوتے تھے اور امت کے پیر کے نیچے کسریٰ کا تاج تھا۔ حراء کے غار میں خلوت اختیار کی اور قوم نے آئین وحکومت پیدا کی، کتنی راتیں آپ نے بلا سوئے گزار دیں

اور نتیجہ میں قوم تختِ خسروی پر جا کر سوئی۔ دنیا میں آئینِ نو کا آغاز کیا اور پرانی قوموں کی مسندیں الٹ دیں۔ دین کی کنجی سے دنیا کا دروازہ کھولا۔

اب والہانہ اندازِ بیان کا ایک قطعہ سنئے۔

عجب کیا گر مہ و پرویں میرے نخچیر ہو جائیں
کہ ہر فتراک صاحب ودلتے بستم سر خود را
وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں ، وہی فرقاں، وہی یٰسیں ،وہی طٰہٰ

حضرت بلال اور سکندر رومی کا مقابلہ کر کے کیسا جذب انگیز عشق رسول کا پیام دیا ہے۔

جو لانگہِ سکندر و رومی تھا ایشیا — گردوں سے بھی بلند تر اس کا مقام تھا
تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومی کے سامنے — دعویٰ کیا جو پورس و دارا نے خام تھا
آج ایشیا میں ان کو کوئی جانتا نہیں — تاریخ دان بھی اسے پہچانتا نہیں
لیکن بلالؓ وہ حبشی زادۂ حقیر — فطرت تھی جس کی نورِ نبوت سے مستنیر
جس کا امین ازل سے ہوا سینۂ بلال — معمور اس صدا سے ہیں شاہنشہ و فقیر

اقبالؔ کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے
رومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے

اقبالؔ عشق رسول کا مدعی بھی ہے شاعر کا ادعا اس کے کلام کی بہترین تاویل ہوتی ہے۔ کہتا ہے ع

کشتۂ انداز ملا جامیم — نظم ونثر او علاج خامیم

اور میں ملا جامی کے انداز کا کشتہ ہوں۔ اور ملا جامی کی نظم ونثر میری خامیوں کا علاج ہے۔ اس میدان میں اپنی کمتری اور دوسروں کی برتری کا اعتراف اقبال ہی تک محدود نہیں ہے۔ یہ بحر ناپیدا کنار سب کے عبور کے باہر ہے۔

ملّا جامی فرماتے ہیں۔ ع

حریفاں بادہا خوردند و رفتند　　تہی خمخانہ ہا کردند و رفتند

مجھ سے پہلے جو گزرے انہوں نے شراب پی اور ایسی پی کہ خم خانہ کو خالی کر دیا اور چل دئے میرے لیے دھرا ہی کیا ہے۔

حضرت بلالؓ کے عشق کا چرچا بڑے ہی جذب و کیف کے ساتھ کرنے کے بعد آخر میں اپنے اصل موضوع کو یوں آشکارہ کیا ہے۔

ادائے دیدہ سراپا نیاز تھی تیری　　کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری

اذاں ازل سے تیرے عشق کا ترانہ بنی　　نماز اس کے نظارہ کا اک بہانہ بنی

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا

خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

عشق رسول ﷺ خود سپردگی اور جرأتِ رندانہ کی وہ راہ ہے جہاں جان کا خوف کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ ایک حاجی مدینہ منورہ جا رہا ہے۔ دیار حبیب کا راستہ خطرات سے لبریز ہے۔ آج کی طرح راہیں محفوظ نہیں ہیں۔ قافلے کو ڈاکو لوٹ لیتے ہیں۔ چنانچہ قافلہ کا ایک حاجی سوچ رہا ہے کہ اب وہ کیا کرے۔ ع

قافلہ لوٹا گیا صحرا میں اور منزل ہے دور　　اس بیاباں یعنی بحر خشک کا ساحل ہے دور

ہمسفر میرے شکارِ دشنہ رہزن ہوئے　　بچ گئے جو ہو کے پیدل سوئے بیت اللہ پھرے

اس بخاری نوجوان نے کس خوشی سے جان دی　　موت کی زہراب میں پائی تھی اس نے زندگی

خنجر رہزن اسے گویا ہلالِ عید تھا　　"ہائے یثرب" دل میں لب پر نعرۂ توحید تھا

حالت یہ ہے کہ لوگ قتل کر دئے گئے ہیں۔ انہیں میں ایک بخاری نوجوان تھا۔ اس نے راہِ دیار محبوب میں موت کو زندگی سمجھ کر ایسی خوشی سے جان دی گویا عید کا چاند دیکھا ہے۔ اس کے دل میں آیا "ہائے یثرب"، یعنی یہ حسرت تھی کہ یثرب نہیں پہنچا، اور لب پر کلمہ توحید تھا۔ یہ مثال اس حاجی کے سامنے ہے اور موت کے گھناؤنے منظر ہیں، خطرہ ہے، جان کا ڈر ہے۔ جو ساتھی بچ گئے تھے وہ بددل ہو کر مکہ شریف واپس ہو گئے ہیں۔ اور حاضریِ دربارِ رسالت کا خیال مجبوراً ترک کر دیا ہے۔ اب اس حاجی کے دل میں کشمکش پیدا ہوتی ہے۔

خوف کہتا ہے کہ یثرب کی طرف تنہا نہ چل شوق کہتا ہے کہ تو مسلم پے بے باکانہ چل

اس خوف وشوق کی کشمکش کا آنا تھا کہ عشق کی ایک بجلی کوندتی ہے اور وہ فوراً اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے۔

بے زیارت سوئے بیت اللہ پھر جاؤں گا کیا
عاشقوں کو روز محشر منہ نہ دکھلاؤں گا کیا

خوف جاں رکھتا نہیں کچھ دشتِ پیمائے حجاز
ہجرت مدفون یثرت میں بھی منفی ہے یہ راز

گو سلامت محمل شاہی کی ہمراہی میں ہے
عشق کی لذّت مگر خطروں کی جاں کاہی میں ہے

اقبالؔ اس درجہ عشق رسول میں ڈوبا ہوا ہے کہ اپنی موت بھی حجاز ہی میں چاہتا ہے۔ اور اگر وہاں بیمار پڑے تو دوا علاج کا قائل نہیں بلکہ وہاں کی موت کو زندگی پر ترجیح دے گا۔ چنانچہ عرصہ گزرا کہ عرب میں شفاخانے نہ تھے۔ آج تو قدم قدم پر اسپتال ہیں۔ خود حکومتِ سعودی عرب کا انتظام اس معاملے میں نہائت معقول اور فیاضانہ ہے اور دوران ایام حج دیگر ممالک کے بھی اسپتال تقریباً ہر محلّہ میں قائم ہو جاتے ہیں۔ جہاں بڑی لگن سے مریضوں کا مفت علاج ہوتا ہے، مفت دوا ملتی ہے۔ اور اگر کوئی شخص حرکت کے قابل نہ ہو تو اس کے جائے قیام پر ڈاکٹر بلا فیس آکر دیکھتے ہیں۔ عورتوں کے لئے لیڈی ڈاکٹر اور نرسیں بھی ہیں۔ لیکن یہ بات اس زمانے کی ہے جب وہاں کوئی شفاخانہ نہ تھا۔ یہ تو ایک تحریک چلی کی جدہ میں ایک شفاخانہ کھولا جائے اور اس سلسلے میں چندہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں اقبالؔ کے تاثرات کیا تھے۔

اک پیشوائے قوم نے اقبالؔ سے کہا کھلنے کو جدہ میں ہے شفاخانۂ حجاز
ہوتا ہے تیری خاک کا ہر ذرہ مضطرب سنتا ہے تو کسی سے جو افسانۂ حجاز
دستِ جنوں کو اپنی بڑھا جیب کی طرف مشہور تو جہاں میں ہے دیوانۂ حجاز

دارالشفا حوالیِ بطحا میں چاہیے
نبض مریض پنجۂ عیسیٰ میں چاہیے

میں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہے حیات ‏ پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں

تلخابہ اجل میں جو عاشق کو مل گیا ‏ پایا نہ خضر نے مئے عمرِ دراز میں

اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی ‏ میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

اسی خیال کو زیادہ سرگرمی اور خون تمنا سے ''رموزِ بیخودی'' کے آخر میں ''عرض حالِ منصف بحضور رحمۃ اللعالمین'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ پہلے بڑے والہانہ انداز میں نعت بیان کی ہے۔

اے ظہور تو شباب زندگی ‏ جلوہ ات تعبیر خوابِ زندگی

اے زمیں از بارگاہِ ار جمند ‏ آسماں از بوسہ امت بلند

شش جہت روشن زتابِ روئے تو ‏ ترک تاجیک عرب ہندوئے تو

از توبالاپایۂ این کائنات ‏ فقر تو سرمایۂ ایں کائنات

درجہاں شمع حیات افروختی ‏ بندگاں را خواجگی آموختی

اس مدح اور ثنا کے بعد کہتے ہیں کہ جب سے آپ پر میری نظر پڑی ہے تو آپ مجھے اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ محبوب ہو گئے ہیں۔ عشق نے میرے اندر ایک آگ لگادی ہے اور میری جان کو سوخت کر دیا ہے۔

تا مرا افتاد بروریت نظر ‏ از آبُ وامُ گشتۂ محبوب تر

عشق در من آتشے افروختاست ‏ فرغلش بادا کہ جانم سوخت ست

اس کے بعد مسلمانوں کا حال زار بیان کرتے ہوئے کہ وہ آپ کی تعلیم سے الگ ہو گئے ہیں اور ہر ایک کی بغل میں کوئی نہ کوئی بت ہے۔

از منات ولات وعزائے وہبل ‏ ہر یکے دارد بتے اندر بغل

یہ مردہ لاش ہو گئے تھے اور طبیب عاجز تھے۔ میں اس لاش کو اٹھا کر حضور مصطفیٰ ﷺ کی خدمت میں لایا ہوں۔ میں نے اپنے کلام سے جو سر قرآن سے لبریز ہے اور آب حیواں ہے زندہ کر رہا ہوں۔

نعشش از پیش طبیباں بردہ ام ‏ در حضور مصطفیٰ آوردہ ام

مردہ بود از آب حیواں گفتمش ‏ سرے از اسرارِ قرآں گفتمش

پھر کہتا ہے کہ اے فیاض و سخی جس نے بصیری شاعر کو ایک قصیدہ کے صلہ میں اپنی چادر عطا فرمادی تھی۔ میری بھی ایک تمنا سر کار سے ہے۔ میں ایک خطا اندیش ہوں۔ مجھے

ذوق حق عطا کر کیونکہ میں اپنی پونجی نہیں پہچانتا ہوں۔

اے بصیری را ردا بخشندۂ　　بربط سلما مرا بخشندۂ
ذوق حق وہ ایں خطا اندیش را　　اینکہ تشنا شد متاعِ خویش را

پھر نعت کے چند اشعار بڑے ہی بلند پایہ لکھنے کے بعد کہتے ہیں کہ اگر میں نے تیرے احکام نہیں پہنچائے ہیں تو میری یہ سزا کر، وہ سزا کیا ہے۔ وہ سزا یہ ہے کہ روز محشر میں مجھے خوار و رسوا کر اور اپنے پیر کے بوسے سے محروم کر دے۔ یہ ہے وہ عشق و محبت کی آخری منزل جہاں اقبالؔ تھا۔

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا　　بے نصیب از بوسہِ پا کن مرا

اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ اگر میں نے رموزِ قرآن بیان کئے ہیں تو میری ایک آرزو ہے جو پوری کی جائے۔ وہ وہی تمنا ہے جس کے لئے یہ طویل نظم لکھی گئی ہے اور وہ تمنا اقبالؔ کے نزدیک ایسی ہے جس کے وہ حقدار نہیں۔ اس لئے پہلے اپنی خامیوں اور گناہوں کا تذکرہ کیا ہے جس میں یہ بھی لکھا ہے کہ عرصہ تک وہ شک و شبہ کے صحرا میں بھٹکتے رہے۔

سالہا بودم گرفتارِ شکے　　از و باغِ خشک من لا نیفکے
حرفے از علم الیقیں ناخواندۂ　　درگماں آباد حکمت ماندۂ

اور پھر کہتے ہیں کہ ان تمام باتوں کی وجہ سے اس تمنا کے اظہار میں مجھ کو شرم آتی ہے۔

شرم از اظہار او آید مرا　　شفقت تو جرأت افزاید مرا

لیکن آپ کی رحمت عام ہے اسلئے میری ہمت ہوتی ہے کہ اس تمنا کا اظہار کروں۔ اتنی تمہید کے بعد جس تمنا کا اظہار کیا جا رہا ہے وہ کس طرح صمیم قلب سے نکلی ہوگی اور اس سے اس عشق و محبت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو اقبالؔ کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی۔

وہ شہر کتنا اچھا ہے جس میں آپ آرام فرما رہے ہیں۔ وہ خاک کتنی ٹھنڈی ہے جہاں آپ آسودۂ خواب ہیں وہ میرے محبوب کا شہر اور مسکن ہے اور عاشق کے لئے یہی حب الوطن ہے۔ میرے ستارے کو دیدۂ بیدار بخش کر اپنے دیوار کے سائے میں ایک مرقد مجھے عطا ہو۔

فرخا شہرے کہ تو بودی دراں　　اے خنک خاکے کہ آسودی دراں
مسکنِ یار است و شہر شاہ من　　پیش عاشق ایں بود حب الوطن
کوکبم را دیدۂ بیدار بخش　　مرقدے در سایۂ دیوار بخش

تا کہ میرے دلِ بیتاب کو سکون حاصل ہو اور میری بے چینی دور ہو اور فخر کے ساتھ میں آسماں سے یہ کہوں کہ دیکھ میرے آرام کو۔ میرا آغاز دیکھا تھا۔ وہ کیسا خراب تھا اور اب انجام دیکھ وہ کیسا حسین ہے۔

اس طرح اقبالؔ عشق رسول کا پیغام دیتا ہے اور ہر دل میں اسے جاگزیں کرنا چاہتا ہے۔ دنیائے اسلام کے مشہور مفکر و خطیب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب ''کاروانِ مدینہ'' میں تحریر فرماتے ہیں۔ ''اقبالؔ کے نعتیہ اشعار اور ان کے عشق رسولؐ نے نہ صرف ایران اور افغانستان اور براعظم ہندوستان بلکہ پورے عالمِ اسلام کو حرارتِ عشق و کیف و مستی سے بھر دیا ہے اور جنہوں نے نعت میں بھی اپنی نئی نئی روشنی نکالی ہے انہوں نے اس کے اندر بھی احیاء اور انقلاب کا سامان پیدا کر دیا''۔

اقبالؔ کا تصور سفر مدینہ

اقبالؔ اگرچہ کبھی یثرب اور بطحا کا سفر نہ کر سکے لیکن اس سفر مبارک کا ایک نہایت دلکش تصور جا بجا ان کے کلام میں ملتا ہے جو ان کے ''عشق رسولؐ'' کے جذبۂ خالص کا ایک بہت ہی بڑا اور مضبوط ثبوت ہے۔ ''پیامِ مشرق'' میں ایک حدی انہوں نے لکھی ہے خیال کی دنیا میں وہ مدینہ منورہ کی جانب جا رہے ہیں اور اونٹ کی سواری ہے۔ شتربان اونٹنی کے لئے گانا گا رہا ہے۔ وہ اس کی تعریف میں اسے کبھی ''درہم و دینار من'' اور کبھی ''آہوئے تاتار من'' کہتا ہے اور کبھی ''ناقۂ سیار من'' اور اسی طرح کے بہت سے تعریفی الفاظ کے بعد بار بار دہراتا ہے کہ ع

تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست

یعنی ذرا اور تیز قدم بڑھا ہماری منزل دور نہیں ہے۔ یہ اس آتشِ شوق کا تقاضہ ہے جو سینے کے اندر سلگ رہی ہے کہ کب جلد سے جلد دیارِ حبیب میں پہنچ جائیں۔ یہ شاہکار نظم تمام ہندوستان میں بالعموم اور عربی مدارس میں بالخصوص بڑے وجد کے ساتھ پڑھی گئی ہے اور بار بار پڑھ کر دلدادگانِ منزل شوق نے اس سے لطف اٹھایا ہے۔ بے خودی اور بے تابی کے حسنِ کلام کو دیکھنے کے لئے ایک بند ملاحظہ ہو۔ بیتاب عاشق کہتا ہے کہ چاند چھپکیا، مشرق سے صبح نمودار ہو گئی۔ رات نے اپنا جامہ چاک کر دیا۔ بیاباں کی ہوا چلنے لگی۔ ذرا تیز قدم اٹھا منزل دور نہیں ہے۔

مہ زسفر پا کشید درپس تل آرمید صبح زمشرق دمید جامۂ شب درید باد بیاباں وزید
تیز ترگام زن منزلِ ما دور نیست

اس طرح شتر بان عاشق جانباز رہ نوردِ منزلِ حجاز کہتا ہے کہ اے ساربان کتنی سست رفتاری سے تم چل رہے ہو۔ میرے ساتھی تو سب یثرب پہنچ گئے۔ اور ہم ابھی نجد ہی میں ہیں۔ ذرا ایسا گانا، حدی، گاؤ کہ اونٹنی وجد میں آجائے، پانی برس گیا ہے اور زمین پر سبزہ اگ آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اسی لئے اونٹنی کے پیر سست ہو رہے ہیں۔ سبزے کی تلاش میں رہتی ہے۔ اس لئے ایسے راستے سے چلو جہاں سبزہ کم ہوتا کہ تیز رفتاری سے ہم آگے بڑھ سکیں۔ میری جان دردِ جدائی سے بچین ہو رہی ہے۔ اس لئے جلدی کرو ایک عجیب وغریب کیف ومستی میں ڈوبی ہوئی نظم ہے۔

ابر بارید از زمیں ہا سبزہ است — می شود شاید کہ پائے ناقہ سُست
جانم از دردِ جدائی در غفیر — آں رہے گو سبزہ کم دارد بگیر

ساربان یاراں بہ یثرب ما بہ نجد
آں حدی گو ناقہ را آرد بہ وجد

الغرض اقبالؔ کا پورا کلام ''عشق رسولؐ'' کے جذبے سے معمور ہے اور اگر چہ یہ بات کہی جا چکی ہے مگر پھر کہہ دینا اس کتاب کے مقصد کے لحاظ سے ضروری ہے کہ اس کا ''عشق'' محض روایتی نہیں ہے بلکہ حیات وکائنات اور فلسفہ مشرق ومغرب کے مطالعہ کے بعد اس نے ایک مستحکم عقیدہ بنایا ہے اور وہ یہ کہ انسان کی صلاح وفلاح اور دنیا میں امن و اماں کے قیام اور فرد وقوم کی نجات دینی ودنیوی کے یہ لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو نوامیس الٰہیہ کا منبع ومنقاد بنادے۔ کیونکہ عقل انسانی اس معاملہ میں اس کی رہنمائی سے قاصر ہے۔ اس سے جہاں وجود واجب الوجود اور توحید الٰہی کا لازم آیا رسالت کا بھی عقیدہ ضروری قرار پایا۔ اللہ تعالیٰ اپنا پیغام ایک پیغمبر ہادی اور رسول برحق ہی کے ذریعہ انسانوں تک پہنچا سکتا ہے اور پیغمبر عربی ﷺ اس دنیا کے آخری نبی تھے اور آپ کا پیغام آخری پیغام تھا۔ اور آپ نے جس ملت کی تعمیر کی وہ صرف خیر الامم ہی نہیں خاتم اقوام تھی۔ جس طرح آپ خاتم النبیین تھے۔ جیسے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ آپ کے بعد کوئی پیغام بھی نہ آئے گا اور نہ کوئی نئی امت اٹھے گی۔ خیر کا دربار سجانے اور انسان کو نجات کا راستہ دکھانے کے لئے یہی ایک طریقہ ہے اور چونکہ یہ ضروری تھا کہ جو آخری پیغمبر قیامت تک کے لئے ہو وہ خود ان

نوامیس الٰہیہ پر اخلاق کی ان اعلیٰ قدروں کے ساتھ عمل کرے کہ اس کی زندگی ہمیشہ کے لئے ایک نیک نمونہ بن جائے۔ اس لئے پیغمبرِ اسلام ﷺ جامع کمالات وصفات تھے۔ انسان بڑے کامل تھے اور انسانیت کے لئے وہ کل شرف جو ایک انسان کو مل سکتے ہیں۔ آپ کی ذات میں جمع کر دئے گئے۔ ایک ایسی ذات بلاشبہ مستحق ہے۔ کہ اس سے والہانہ محبت کی جائے۔ اور اس کی سنت کو مقدم قرار دیا جائے اور اسی عشق محمدی صلعم کل نیکیاں کل نوامیس الٰہیہ کی تعمیل کل خیر سے وابستگی اور کل شر سے اجتناب آ گیا۔ زندگی کا کوئی شعبہ اور حیات کا کوئی گوشہ باقی نہیں رہا۔ یہ عشق کسی غرض کے لئے نہیں ہے بلکہ صرف تحسین کے جذبہ سے پیدا ہوتا ہے۔ صرف پختہ عقاید کی پیداوار ہے اور حیات و کائنات کے راز کا نچوڑ ہے۔ اور اسی لئے "عشق رسول" پیامِ اقبال کا نچوڑ ہے۔ اور پیامِ اقبال کیا ہے۔ خلاصہ اسلام ہے ع

بہ جبریل امیں ہم داستانم
رقیب وقاصد و دربان ندانم

☆

اقبالؔ کا مردِ کامل

قبل مسیح کے مشہور تارک الدنیا فلسفی اور مجذوب قلندر ڈائی جینیز کی زندگی کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک دن روزِ روشن میں وہ چراغ لے کر چلا جا رہا تھا۔ کسی نے اس خبطی سے ازراہِ تمسخر سوال کیا کہ کیا ڈھونڈ رہے ہو۔ تو جواب دیا کہ ایک انسان کی تلاش ہے۔ مرشد رومی نے معلوم نہیں کس حالتِ کیف و جذب میں ایک غزل کہی تھی جسے اقبالؔ نے اپنے کلام میں بڑی اہمیت دی ہے۔ اس کے تین حسب ذیل اشعار اسرارِ خودی کا سرنامہ قرار دئے گئے ہیں۔ ع

دی شیخ با چراغ ہمیں گشت گردِ شہر — کز دام و درد ملولم و انسانم آرزو است
ایں ہمرباں ست عناصر ولم گرفت — شیر زیاں و رستم دستانم آرزو است

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آں کہ یافت نہ شود آنم

یعنی کل شب میں شیخ چراغ لے کر شہر میں گھوم رہا تھا کہ میں ان شیطانوں سے عاجز ہوں، اور ایک انسان کی آرزو ہے۔ میرے ان سب عناصر ساتھیوں نے میرا خون کر دیا۔ مجھے شیر ژیاں اور ستم دستاں کی تلاش ہے۔ میں نے کہا کہ ہم لوگوں نے بہت تلاش کیا مگر دستیاب نہیں ہوتا۔ جواب دیا کہ جو ڈھونڈنے سے نہیں ملتا اسی کی آرزو ہے۔

جاوید نامہ میں اقبالؔ نے آرزو اور جستجو سے بے تاب ہو کر رومی کی یہ پوری غزل لبِ دریائے ناپیدا کنار ہنگامِ غروب آفتاب مستانہ انداز میں پڑھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روحِ رومی تمام پردوں کو چاک کر کے نمودار ہوئی اسرارِ مواج کی شرح کی اور شکست افلاک پر قدرت دلائی۔

اقبالؔ خدا سے دعا کرتا ہے کہ :

یا دگر آدم کہ از ابلیس باشد کمترک
یا دگر ابلیس بہر امتحانِ عقل و دیں

یا چناں کن یا چنیں

گویا عہد حاضر کا انسان شیطان سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس لئے خدایا تو دوسرا انسان بنا جو ابلیس سے کم ہو یا دوسرا ابلیس امتحانِ عقل و دیں کے لئے پیدا کر۔ یا اس طرح کر یا اس طرح۔

اے خدا وند صواب و ناصواب — من شدم از صحبت آدم خراب
ہیچ گہ از حکم من برسر نتافت — چشم از خود بست و خود را در نیافت
صید خود صیاد را گوید بگیر — الاماں از بندۂ طاعت پزیر

اے نیکی و بدی کے خدا میں انسان کی صحبت سے خراب ہو گیا۔ کبھی بھی وہ میرے حکم سے گردن نہیں موڑتا۔ اپنی معرفت سے آنکھ بند کر کے اپنے آپ کو گم کر چکا ہے۔ شکار خود شکاری سے کہتا ہے کہ مجھے پکڑ۔ اس بندۂ طاعت پزیر سے میں پناہ مانگتا ہوں۔ چنانچہ اس کی التجا یہ ہے ع

اے خدا اک زندہ مردِ حق پرست — لذتے شاید کہ یا بم در شکست

اے خدا ایک زندہ مرد حق پرست بھیج دے تا کہ شاید میں اس سے شکست کی لذت پا سکوں۔

اقبالؔ کے ان تمام شاعرانہ معاملات کا منشا یہ ہے کہ موجودہ وقت کا انسان شرف انسانیت سے بہرہ ور نہیں ہے اس لئے وہ ایک ایسی انسانی مخلوق کی تلاش میں ہے جو انسانیت کی تمام خوبیوں سے بھرپور ہو اور یہی اقبالؔ کا مرد کامل ہے۔

انسانیت کی عظمت

بظاہر آسمان بلند اور پُر انوار تصور کیا جاتا ہے۔ اور خاکِ اسفلِ زمین حقیر سمجھی جاتی ہے۔ مگر اقبالؔ کے نزدیک زمین آسمان سے بہتر ہے۔ کیونکہ اسے ''انسانیت'' کی امانت سپرد ہوئی۔ روزِ آفرینش آسمان نے زمین کو طعنہ دیا کہ تیری طرح کسی کو میں نے بد بخت نہیں پایا۔ تمام کائنات میں تیری طرح اندھا کون ہے۔ اور اگر میری قندیل تجھے روشن نہ کرے تو تیرے اندر کوئی نور نہیں۔ خاک اگر الوند ہو جائے پھر بھی خاک ہے اور آسمان کی طرح روشن و پائندہ نہیں ہو سکتی۔ ع

طعنہ زد او چرخ نیلی بر زمیں — روز گارِ کس ندیدم ایں چنیں
چوں تو در پہنائے من کوئے کجا — جز بہ قندیلم ترا نورے کجا
خاک اگر الوند شد جز خاک نیست — روشنی پائندہ چوں افلاک نیست

زمین اس طعنہ سے نہایت شرمندہ ہوئی اور ناامید اور خستہ حال اور مضمحل ہو کر اس نے اپنی بے نوری کے متعلق پیش حق فریاد کی تب وہاں سے یہ ندا آئی کہ تو اس سے بے خبر ہے کہ تجھے انسان کی امانت دی گئی ہے۔ جس کی عقل نے دنیا کو مسخر کیا اور جس کے عشق نے لامکاں کی تسخیر کی ع

اے امینے از امانت بے خبر — غم نخور اندر خمیر خود نگر
شستۂ از لوحِ جاں نقشِ امید — نورجاں از خاک تو آید پدید
عقل آدم بر جہاں شب خوں زند — عشق او بر لامکاں شب خوں زند

(جاوید نامہ)

میلادِ آدم کے وقت عشق نے فریاد کی کہ خونیں جگر پیدا ہوا اور حسن پر لرزہ طاری ہو گیا کہ صاحبِ نظر آ گیا۔

نعرہ زد کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزیدہ کہ صاحب نظرے پیدا شد

جب انسان اپنی تمام خصائص انسانیت سے آراستہ ہو کر آشکارہ ہوتا ہے تو نور سے بنے ہوئے فرشتے اس خاکی کے حسن کو دیکھ کر مست ہو جاتے ہیں۔ ع

کہ نوریاں بہ تماشائے خاکیاں مستند

انسان ناموس اکبر جبریل امین سے بھی افضل ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ انسانیت کا وہ تصور جو وہ پیش کرتا ہے اس پر جبریل کی نگاہ پڑ جائے تو وہ اپنا نور پھینک کر بارگاہِ الٰہی میں سوز و سازِ آدم کی التجا پیش کرے۔ ا

گر ایں نامہ را جبریل خواند　　چوں گرد آں نورِ ناب از خود فشاند

بنالد از مقام و منزل خویش　　بیزداں گوید از خونِ دل خویش

تجلی را چناں عریاں نہ خواہم　　نخواہم جز غمِ پنہاں نخواہم

مرا راز و نیاز آدمے دہ

مرا سوز و گداز آدمے دہ

لیکن بہت سے انسان ہیں جو ابلیس کا کام کرتے ہیں اور جس طرح لالہ کے اندر دھواں ہوتا ہے۔ ان کے اندر بھی بیرنگی پائی جاتی ہے۔ ان کی تمام ظاہری پاکبازیاں دجل و فریب کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔

اے بسا آدم کہ ابلیسی کند　　اے بسا شیطاں کہ ادریسی کند

رنگ او بے رنگ او بود نمود　　اندرون او چوں داغ لالہ دود

پاکباز و کعبتینِ او دغل　　ایمن از غدر و نفاق اندر بغل

(پیامِ مشرق)

گویا کہ انسان کی فطرت میں "احسن تقویم" اور "اسفل السافلین" دونوں کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ کس طرح اپنی داخلی اور خارجی قوتوں کو مجتمع کر کے صحیح معنوں میں وہ بشر بن سکتا ہے جو اشرف المخلوقات قرار دیا گیا ہے۔ اقبال کی فکر کا منتہا ہے یہ ایک غلط فہمی ہوگی اگر ہم یہ تصور کر لیں کہ اقبال صرف پیغمبرِ اسلام ﷺ کو انسان کامل تصور کرتا ہے۔ دراصل وہ اپنے خم خانۂ شراب کے عام کرنے کا خواستگار ہے اور ہر انسان کو "مردِ کامل" یا بشر بنانا چاہتا ہے۔ البتہ وہ رسول عربی کو "خیر البشر" قرار دے کر بطور نمونہ یا اسوۂ حسنہ پیش کرتا ہے۔

آنچہ در آدم نگنجد عالم است　　آنچہ در عالم نگنجد آدم است
آشکارا مہر و مہ از جلوہ اش　　نیست رہ جبریل را در خلوتش

برتر از گردوں مقام آدم است
اصل تہذیب احترام آدم است

یعنی جو چیز انسان کے اندر نہیں سما سکتی وہ دنیا ہے اور جو عالم کے اندر سما سکے وہ انسان ہے۔ انسان کے جلوہ سے مہر و ماہ آشکارا ہوتے ہیں اور اس کے خلوت کدہ میں جبریل کو بھی جگہ نہیں مل سکتی۔ انسان کا مرتبہ آسمان سے بھی بلند ہے اور انسان کا احترام اصل تہذیب ہے۔

☆

اقبال اور نیٹشے

بعض اصحاب نے اقبالؔ کے مردِ کامل کو جرمنی کے مشہور فلاسفر نیٹشے کے ''فوق البشر'' کے نظریہ سے مطابقت کی کوشش کی ہے اور یہ خیال قائم کیا ہے کہ اقبالؔ نے یہ نظریہ نیٹشے سے مستعار لیا تھا اور زبان اور شاعری کے سحر سے اس کو اجاگر کر کے پیش کیا ہے۔ نیٹشے کے ''فوق الانسان'' اور اقبالؔ کے مردِ کامل میں، اصولی اور بنیادی فرق ہونے کے علاوہ تاریخی حیثیت سے بھی اقبال کی خوشہ چینی کا تصور غلط ہے۔ اقبال نے ڈاکٹر نکلس کو جو خط لکھا اس میں اس کی صراحت خود کی ہے۔

''وہ انسانِ کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بحث کر کے میرے انسان کامل اور جرمنی کے مفکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے۔ میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل انسان کامل کے متصوفانہ عقیدہ پر قلم اٹھایا تھا اور یہ وہ زمانہ ہے کہ نہ تو نیٹشے کے عقاید کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا نہ اس کی کتابیں میری نظر سے گزری تھیں۔ یہ مضمون انڈین انٹی کیوری میں شایع ہوا جب ۱۹۰۸ء میں میں نے الہیات پر کتاب لکھی تو اسی کتاب میں اس کو شامل کرایا گیا۔''

مردِ کامل کے خصائص

اقبالؔ کا مردِ کامل تکمیلِ انسانیت کی ابتدا اثباتِ خودی سے کرتا ہے۔ جو نفیِ خودی کی ضد ہے۔ اس کے نزدیک زندگی نفس درازی نہیں بلکہ وہ تین شاہدوں سے اپنے وجود پر شہادت طلب کرتا ہے۔

شاہد اول شعورِ خویشتن　　خویش را دیدن بہ نورِ خویشتن

اول شاہد خود اس کے اندر کا شعور ہے جس سے وہ اپنی ذات کو خود اپنے نور سے دیکھتا ہے۔

شاہد ثانی شعور دیگرے　　خویش را بینی بہ نورِ دیگرے

دوسرا شاہد کسی دوسرے نور اور اس کے نور سے اپنے کو دیکھنا۔

شاہد ثالث شعورِ ذاتِ حق　　خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق

تیسرا شاہد ذاتِ حق کا شعور اور اپنے آپ کو ذاتِ حق کے نور میں ملاحظہ کرتا ہے اور اگر اس نور کے سامنے وہ استوار رہ جائے تو خدا کی ذات کی طرح وہ بھی حی و قیوم ہو جاتا ہے۔

پیش ایں نور از یمانی استوار　　حی و قیوم چوں خدا خود را شمار

کمالِ انسانیت کے لئے اپنے وجود کا پرزور اقرار ضروری ہے نہ کہ اس کا انکار، اس کی بقا لازم نہ کہ اس کو فنا کر دینا۔ خواہ یہ فنا ذات باری تعالیٰ کے آغوش ہی میں ہو۔ انسان کا متن ''انا'' ''ایگو'' ایک زندہ حقیقت ہے اور اس کا احساس و ادراک اور اسے تمام عالم کے مقابلے میں قائم کرنا اور خود تجلی ذات حق کے حضور میں باقی رکھنا پہلی شرط تکمیل شرفِ انسانی کی ہے۔ جو لوگ اس ''ایگو'' کے وجود پر شک کرتے ہیں۔ ان سے اقبالؔ سوال کرتا ہے کہ

باگویا من کہ دارائے گماں کیست

وہ کون ہے جو شک کرتا ہے۔ اس لامکاں کا تو پتہ لگنا چاہئے اور پھر فریاد کرتا ہے کہ

جہاں پیدا و محتاج دلیلے　　نمی آید بہ فکر جبرئیلے

دنیا ظاہر ہے اور پھر بھی کیا اس کو ثابت کرنے کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔ یہ

تو جبریل کی فکر میں بھی آنے والی بات نہیں ہے۔ بس جب ''ایگو'' جب اپنی مکمل مشاطگی کے لئے منزل کی طرف روانہ ہوتا ہے تو اس کے راستہ میں دو رکاوٹیں پڑتی ہیں۔ اور ان دونوں رکاوٹوں کا رفع کرنا ''ایگو'' کے لئے ضروری ہے۔ اول فطرت اور دویم نفس انسانی۔ ایگو اور فطرت دونوں کے وجود سے انکار کر کے صرف خدا کے وجود کو تسلیم کر لینا اقبال کے نزدیک خود فریبی ہے۔ ایگو جب تک اپنے وجود کا اقرار کر کے تسخیر فطرت اور تسخیر نفس نہ کرے وہ اپنے راستہ سے رکاوٹیں رفع کر کے کمال دوام کے سفر کا سامان نہیں کر سکتا۔ فطرت کی تسخیر علم سے اور نفس کی تسخیر عشق سے حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح علم و عشق دونوں ''مرد کامل'' کو اپنے مقصد اعلیٰ کو حاصل کرنے میں امداد و اعانت دیتے ہیں۔ لیکن علم بلا عشق گمراہ اور مردود ہے۔ آج یورپ نے علم اور سائنس کے ذریعہ فطرت کی بہت کچھ تسخیر کر لی ہے۔ اور اس میدان میں ان کی فتوحات روز افزوں ترقی پر ہیں۔ مگر ''عشق'' کے نہ ہونے سے وہ تکمیل انسانیت میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا ہے۔

جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل
عقل نا پروا متاع عشق را غارت گراست
در ہوا لیش گرمی یک آہ بیتابانہ نیست
رندایں میخانۂ یک جرأت رندانہ نیست

یعنی اس کا جلوہ بلا کلیم اور اس کا شعلہ بلا خلیل ہے۔ اس کی عقل تا پروا متاع عشق کو غارت کر دیتی ہے۔ اس میں ایک بھی آہ بے تابانہ کی گرمی نہیں ہے اور اس میخانہ کے رند میں ایک بھی لغزشِ مستانہ نہیں ہے۔

مردِ کامل اول ہستی وجود ایغو یا روح کا اقرار کرتا ہے اور اسے زندہ و پائندہ و دائم رکھنے کا خواستگار ہوتا ہے۔ اس آرزو کی خلش اسے مقاصد بنانے پر آمادہ کرتی ہے۔ وہ مقاصد کے حصول کی لگن میں مست ہو جاتا ہے اور ایک اندرونی کیف و ادراک و جذب و شوق پیدا کرتا ہے جس کا نام خونِ جگر یا عشق ہے۔ چونکہ خودی سوال سے ضعیف ہوتی ہے۔ وہ سوال نہیں کرتا۔ وہ ایسا شیشہ ہے جو ٹوٹ جاتا ہے مگر مومیائی نہیں مانگتا۔ ع

مومیائی خواستن نتواں شکستن نتواں

مناصب کی تلاش اور بھیک اس سے پرے ہے۔ وہ حباب کی طرح سمندر کے اندر بھی نگوں پیمانہ رہتا ہے۔

چوں حباب از غیرتِ مردانہ باش
ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

وہ اس مادی دنیا اور کائنات کے وجود سے انکار کر کے راہِ فرار اختیار نہیں کرتا بلکہ اس کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور اپنی خودی سے اس کی تسخیر پر آمادہ ہو جاتا ہے اور آخر کار اسے زیر نگیں لاتا ہے۔ وہ خدائے واحد کے وجود پر یقین لازمی تصور کرتا ہے مگر اس لئے نہیں کہ اپنے وجود کے قطرہ کو اس دریا میں گم کر دے بلکہ اس واسطے کہ اسے اپنے سامنے بطور نمونہ کمال رکھ کر تخلقو باخلاق اللہ (اپنے اندر اللہ کے اخلاق پیدا کرو) پر عمل پیرا ہو۔ وہ اپنی خودی کے راستے سے خدا تک پہنچتا ہے اور اس کی برق تجلی کے سامنے بھی اپنی ہستی کو قائم رکھتا ہے۔ ع

زمن گو صوفیانِ باصفا را — خدا جو یاں معنی آشکارا
غلامِ ہمتِ آں خود پرستم — کہ بانور خودی بیند خدارا

اور اگر خدا سے وہ کچھ مانگتا ہے تو یہ نہیں کہ اس جزو کل کے وجود میں مل کر غائب ہو جائے بلکہ یہ کہ اس کی خودی قائم و برقرار رہے اور اسے وجود کی ابدیت اور دوام کی لذت حاصل ہو۔ ع

ہم از خدا خودی طلب، ہم از خودی خدا طلب

وہ قوت و شوکت بھی طلب کرتا ہے مگر نیٹشے کے "فوق الانسان" کی طرح وہ اس کے لئے ناجائز وسائل استعمال نہیں کرتا اور نہ صرف قوت و شوکت کے حصول کو مقصد تصور کرتا ہے اس کی حاصل کردہ قوت و شوکت، اخلاق اور آئین الٰہیہ کے تابع ہوتی ہے اور اس کے محل سرائے خاص میں نامحرم شر کا گزر نہیں ہے۔ اس کے مقاصد اور ذرائع دونوں خیر ہی خیر ہوتے ہیں۔ مگر وہ اس طرح قوت و شوکت حاصل ضرور کرتا ہے اور شر کی تمام قوتوں اور شوکتوں و خس و خاشاکِ باطل کو شعلہ بن کر پھونک ڈالتا ہے۔ چنانچہ قوت کے متعلق اس کا اعتقاد یہ ہے کہ۔ ع

لادین ہو تو زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

وہ تہذیب و تزکیۂ نفس کے نام پر خانقاہ اور رہبانیت کی زندگی اختیار نہیں کرتا اور نہ ترکِ جہاں کو مسلک بنا کر غوغائے عالم سے محترز ہوتا ہے بلکہ ان سے الجھتا اور ان کی اصلاح کرتا ہے۔ کنجِ عافیت میں بیٹھ کر اللہ کی یاد اور عالمِ کون و فساد سے بے خبری افیون

خوردہ ست اعصابی اور خود فریبی ہے جس سے وہ ہمیشہ اجتناب ہی نہیں نفرت رکھتا ہے۔ وہ یہ تصور نہیں کرتا کہ خدا نے ایک مرتبہ اس دنیا کو بنا دیا اور خود اس سے کنارہ کش ہو گیا اور اس کی تعمیر و تکمیل سے اب اس کو کوئی مطلب و واسطہ نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کو وہ تغیر پزیر مانتا ہے۔ ہر لمحہ اس میں نمو اور تبدیلی پیدا ہوتے ہوئے دیکھتا ہے اور خود اپنے ضمیر کی قوت سے وہ نئے نئے عالم ایجاد کرتا ہے۔ ع

کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

اس طرح وہ ہر لحظہ ایک نئی شان سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ ع

فریب نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوق پرواز ہے زندگی

اس طرح وہ ہر ذرہ کو خدا کی صفت خود نمائی سے مملو پاتا ہے۔

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی — ہر ذرہ شہید کبریائی

کیونکہ عالمِ آب و خاک کا سرعیاں انسان ہے جس کے مطالعہ و مشاہدہ کے بغیر کائنات عدم و وجود برابر ہوگا۔ اور پھر انسان اپنی خودی کے مطالعہ سے خدا کی معرفت حاصل کرتا ہے۔

عالمِ آب و خاک و بادِ سرعیاں ہے تو کہ میں؟
وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں؟

ان وجوہ سے وہ تقلیدی فکر مسلک گوسفندی (یعنی نفی خودی) راہبانہ طرزِ عمل اور بندگی و بے چارگی سے نجات پاتا ہے۔ وہ کائنات پر تصرف کرتا ہے اور عرفانِ جلال و جمالِ کبریائی سے اپنے اندر فیضان جذب و شوق پیدا کرتا ہے۔ وہ بیدار رہتا ہے۔ خواب اس پر طاری نہیں ہوتا۔ ذوق عمل کی قوت سے بھی محروم نہ ہونیکی وجہ سے وہ سکر کی کیفیت سے بے نیاز رہتا ہے۔ اس لئے وہ تقدیر پر تکیہ نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی تقدیر خود بناتا ہے۔

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں — تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

جب وہ کوئی ارادہ کر لیتا ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ یہی تقدیر الٰہی ہے۔

فطرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

مردِ کامل ایک مردِ حر ہوتا ہے۔ آزاد اپنے اعمال و افعال اور اس کے نتائج و اسباب کی وہ خود ذمہ داری لیتا ہے۔ اس کا الزام وہ کسی اور ذات پر نہیں ڈالتا کہ خود مرتکبِ گناہ ہو اور اس کا محرک خالقِ کائنات کو قرار دے وہ تسلیم و رضا کو بھی تقدیر تسلیم نہیں کرتا بلکہ قانون اور اخلاق الہیہ کی اتباع کامل و اطاعت خالص کو تسلیم و رضا کا درجہ دیتا ہے۔ وہ مستی گفتار و مستی افکار سے بالا ہو کر مستی کردار کو اپنی رگ و پے میں پیدا کرتا ہے۔ وہ جرأتِ رندانہ کا سرمایہ دار ہوتا ہے اور آتش نمرود میں خود بے خطر بلا خیال نتائج کود پڑتا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

وہ انتہائی خوددار ہوتا ہے۔ کبھی غیرت و خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ وہ خطرات سے بھاگتا نہیں۔ بلکہ خطرات کو دعوت دیتا ہے اور اپنے آبدار موتی کو خطرات کے شعلہ میں ڈال کر اس کا امتحان لیتا ہے۔ اس کے نزدیک ع

خطر تاب و تواں را امتحاناں است عیار ممکنات جسم و جاں است

وہ حکمت عملیوں اور فریب کاریوں کے قریب نہیں جاتا۔ آزادی و بے باکی و حسن گوئی اس کی سرشت میں داخل ہو جاتی ہے۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

وہ زمان و مکان کا تابع نہیں ہوتا بلکہ ان زنجیروں کو توڑ کر اس سے پرے نکل جاتا ہے۔ اس لئے اس پر موت کبھی طاری نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشگی کی زندگی سے دوچار ہوتا ہے، جب ظاہری موت نمودار ہوتی ہے تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ رہتی ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اب وہ ابدی زندگی کی مسافرت اور منزل پر قدم رکھ رہا ہے۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

اس طرح وہ حیات ابدی کو حاصل کر لیتا ہے اور موت سے بھی نہیں مرتا۔

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیری خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

وہ رسم و رواج کا پابند نہیں ہوتا بلکہ اصول و اخلاق اور زندگی کی قدروں کی ترازو میں سب کو تولتا ہے اور جہاں جہاں وہ پورے نہیں اترتے ان کی زنجیروں کو توڑ کر پھینک

دیتا ہے اور نئے نئے تجربوں سے ہمیشہ اپنی خودی کو مستحکم کرتا ہے۔

ہر لحظ نیا طور نیا برق تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

اس کی زندگی مسلسل عمل ہوتی ہے اور اسی مسلسل عمل سے وہ اپنے وجود کے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوتا ہے۔

ساحل افتادہ گفت — من کے بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد — آہ کہ من کیستم
موج از خود رفتہ شد — نیز خرامید گفت
ہستم اگر می روم
گر نہ روم نیستم

ساحل افتادہ نے کہا کہ اتنے دنوں کی زندگی ملی مگر ہائے افسوس اب تک نہ معلوم ہوسکا کہ میں کون ہوں۔ از خود رفتہ موج تیزی سے گزری اور کہا کہ اگر میں حرکت میں رہوں تو میرا وجود ہے ورنہ میرا کوئی وجود نہیں، اور جس کی انتہا بظاہر موت ہے اور مادی دنیا اس کی اول منزل ہے، جس کے حصار زمان و مکان ہیں۔ مگر جب وہ ان حصاروں کو توڑ کر آگے بڑھتی ہے تو ضمیرِ وجود میں اس کو ہزاروں عالم دکھائی دیتے ہیں۔

یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت — یہ عالم کہ ہے زیر فرمانِ موت
یہ عالم یہ بت خانۂ چشم و گوش — جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کہ یہ ہے منزلِ اولیں — مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر — طلسم زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود
ہر اک منظر تیری یلغار کا — تری شوخیِ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار — کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار
تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت
تجھے کیا بتاؤں تیری سرنوشت

مردِ کامل مال و زر کا تمنائی نہیں وہ تو قوت و شوکت کے ساتھ املاکِ دنیوی کا خواہاں نہیں ہوتا بلکہ فقر اختیار کرتا ہے۔ مردِ کامل کا فقر بے زری کا دوسرا نام نہیں ہے۔ بلکہ

خودداری واعلیٰ حوصلگی، بلندی عزم اور حقیقت شناسی کا ایک مجسمہ ہے یہ وہ فقر نہیں جو راہب خانقاہ اختیار کرتا ہے اور جس سے سکون پرستی کی فضا پیدا ہوتی ہے بلکہ اس کا فقر ہمیشہ طوفانی ہوتا ہے۔

سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار　　فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

مردِ کامل فقر کو عام فطرت اور عالم نفس کا شکار بننے کے لئے اختیار نہیں کرتا بلکہ اس سے اسرارِ جہانگیری کھلتے ہیں۔ اور مئے اکسیر بن جاتی ہے۔

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری　　اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری
اک فقر ستوموں میں مسکینی و دل گیری　　اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری

مرد کامل کا نان جوئیں بازوئے حیدری ضروری رفیق ہے۔ یہ زندہ خودی کا شکوہ سنجر وطغرل یعنی معرفتِ نفس کے ساتھ استغنائے کامل اور جستجوئے عظمت وسکوت ہے ع

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے طغرل و سنجر سے کم شکوہ فقیر

خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیاں و حریر
نہنگ زندہ ہے اپنے محیط سے آزاد
نہنگ مردہ کو موجِ سراب بھی زنجیر

مردِ کامل کا فقر اسکندری سے بہتر ہے۔ کیونکہ یہ انسان کو اس شرف کامل پر تعمیر کرتا ہے۔

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی

مرد کامل حصول رزق کو جائز اور محنت کوش راستوں سے ناجائز نہیں تصور کرتا اور نہ وہ عام مدعیان قناعت وتوکل کے مانند بے حیل وحجت اپنا رزق منت غیر سے لینا چاہتا ہے۔ مردِ کامل تو باپ کے پسماندہ لعل کو بھی پا کر شرمندہ ہوتا ہے۔ وہ پتھر سے خود لعل نکال کر اس میں عیش ومسرت کا لطف حاصل کرتا ہے۔

پشیماں شو اگر لعلے ز میراثِ پدر خواہی
کجا عیش بروں آوردنِ لعلے کہ در سنگ است

مگر وہ بے زری کو حصولِ مقاصد کے لئے اختیار کرتا ہے۔ اس کا فقر اختیاری ہوتا ہے نہ کہ جبری۔ اس کے فقر میں قلندری اور کلہ داری کا امتزاج ہوتا ہے۔ اس سے وہ دونوں عالم کو تسخیر کر لیتا ہے۔

شنیدم روزے یک از مرد پیرے — کہن فرزانۂ روشن ضمیرے
اگر خود را نیا واری نگہ داشت — و گیتی را بگیر داں فقیرے

مردِ کامل کی زندگی مسلسل عمل و جہاد ہے۔ وہ کسی عالم سے اعتنا نہیں کرتا بلکہ اپنی دنیا آپ بناتا ہے۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے — سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

اس لئے کسی قسم کی غلامی کی گرد اس کے سراپا نور وجود کو میلا نہیں کر سکتی۔ وہ کسی دوسرے سے اکتساب نہیں کرتا بلکہ خود اپنے باطن کے نور سے فروزاں ہوتا ہے اور اس کے لمحات سے تمام کائنات کو منور کر دیتا ہے۔ وہ پروانہ کی طرح طواف شمع نہیں کرتا بلکہ اپنی فطرت کی تجلی گاہ میں آباد ہوتا ہے جو تاریکیِ اوہام کو دور کر کے یقین کامل کے اجالے کو نمودار کرتی ہے۔

شب خود روشن از نور یقیں کن
ید بیضا بروں آید از آستیں کن

وہ افلاطون اور فارابی کی آنکھوں سے دنیا کو نہیں دیکھتا بلکہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے وہ کسی سے آنکھ کی بھیک نہیں مانگتا۔

میانِ آب و گل خلوت گزیدم — ز افلاطوں و فارابی بریدم
نہ کردم از کسے دریوزۂ چشم — جہاں را جز بچشمِ خود ندیدم

اگر دنیا اس کے ساتھ سازگار نہیں ہوئی تو وہ خود دنیا سے ساز نہیں کرتا۔ بلکہ اسے الٹ دیتا ہے اور اس زمین و آسمان مستعار کو پھونک کر اسی کے خاکستر سے خود اپنی دنیا تعمیر کرتا ہے۔

گفتند جہانِ ما بہ خیالِ تو می سازد — گفتم نمی سازد گفتند کہ برہم زن
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار — اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
محبت مجھے ان جوانوں سے ہے — ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

وہ ساتھی نہیں ڈھونڈتا اور کثرتِ خلائق کی ہمرہی کا انتظار نہیں کرتا بلکہ تنہا انقلاب

پیدا کرتا ہے۔اس کا عمل دوسروں کی تائید پر منحصر نہیں ہوتا۔

سوئے گردوں نالۂ شب گیر کا بھیجے سفیر　　رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے

وہ اپنے افکار و عقائد پر پورا یقین رکھتا ہے اور محبت اس کے خمیر میں پوشیدہ ہوتی ہے۔گماں آباد ہستی میں اس کا یقین ایسا ہوتا ہے جیسے کہ بیابان کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی جگمگا رہا ہو۔ ع

گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا　　بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

اور عالمگیر محبت اس کا احاطہ کئے ہوتی ہے اور اس طرح وہ مسلسل عمل سے اپنے آپ کو مکمل کر کے اپنے آپ کو جہد زندگانی کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ ع

یقین محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم

جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ان صفات معنوی سے آراستہ و پیراستہ ہو کر "مردِ کامل" خلیفۃ اللہ یا نائب الٰہی کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے اور جب وہ آشکارہ ہوتا ہے تو کائنات میں ایک لرزہ پڑ جاتا ہے۔

زادنِ طفل از شکست شکم است　　زادن مرد از شکست عالم است

ہر دو زادن را دلیل آمد اذاں　　آں بلب گویند ایں از عین جاں

جاں بیدارے چوں زاید در بدن

لرزہا افتد دریں دیر کہن

یعنی پیٹ کے شکست ہونے سے بچے کی پیدائش، اور عالم کے شکست ہونے سے مرد پیدا ہوتا ہے۔دونوں کی پیدائش کے وقت اذان لازم ہے۔اول الذکر کے لئے اذان لبوں سے کہی جاتی ہے اور مقدم الذکر کے لئے عین جاں سے کہی جاتی ہے۔جب بدن میں جانِ بیدار پیدا ہوتی ہے تو اس دیر کہن میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اس کے جمال و جلال کا ایسا دل کش منظر ہوتا ہے کہ صرف اس کا وجود عالم میں حسن و خوبی کے لئے دکھائی دیتا ہے اور اس کا خاکی نہاد ہونا اس کی پرواز میں مانع نہیں ہوتا وہ شش جہت کو توڑ کر نکل سکتا ہے اور امواجِ روحانی و جسمانی حاصل کرتا ہے۔

چیست جاں جذب و سرور و سوز و درد　　ذوق تسخیر سپہر گرد گرد

از شعور است ایں گوئی نزد و دور　　چیست موجِ انقلاب اندر شعور

انقلاب اندر شعور از جذب و شوق　　و رہا ند جذب و شوق از تحت و فوق

ایں بدن با جان ما انبار نیست
مشت خاکے مانعِ پروا ز نیست

اس عروج کمال تک پہنچنے کے بعد وہ فرشتہ صیدِ یزداں کا شکار بن جاتا ہے اور ایک ایسی دنیا تعمیر کرتا ہے جو زیادہ رہنے کے قابل اور زیادہ آراستہ ہے۔

نوائے عشق را ساز است آدم — کشاید راز اورا راست آدم
جہاں او آفریدایں خوب تر ساخت — مگر با ایزد انبار است آدم

اجتماعی زندگی

اقبالؔ کا ''مردِ کامل'' فرد اکمل یا انسانِ مجسم ہونے کے بعد اپنے کو جماعت سے وابستہ کرتا ہے۔ اور جس طرح اس نے انفرادی خودی کو قائم کیا تھا وہ جماعتی خودی کو آشکارا کرتا ہے۔

روح ملت را وجود از انجمن — روحِ ملت نیست محتاجِ بدن
تا وجودش را نمود از صحبت است — مردہ چوں شیرازۂ صحبت شکست
مردۂ از یک نگاہی زندہ شو — گور از بے مرکزی پائندہ شو
وحدت افکار و کہ دار آفریں
تا شوی اندر جہاں صحب نگیں

جماعت فرد کے لئے رحمت ہے اور بلا جماعت فرد کی خودی مکمل نہیں ہو سکتی۔

فرد ربطِ جماعت رحمت است

فرد اور جماعت میں کوئی تضاد نہیں ہوتا بلکہ دونوں ایک دوسرے کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

فرد و قوم آئینہ یک دیگر اند — سلک و گوہر کہکشاں و اختر اند

فرد جماعت کے اندر اپنے آپ کو گم کر کے اپنی خودی کو زیادہ آبدار بناتا ہے۔

فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

جس طرح انفرادی خودی مقصد اور آرزو سے قائم اور عشق و محبت سے مستحکم و استوار ہوتی ہے اسی طرح جماعتی خودی مقصد اور آرزو رکھتی ہے۔ بلکہ انفرادی خودی جب تک جماعتی خودی میں نہ گم ہو جائے تخلیقِ مقاصد کر نہیں سکتی۔

فرد تنہا از مقاصد غافل است　　قوتش آشفتگی را مائل است
قوم باضبط آشنا گرداندش　　نرم تو مثلِ صبا گرد اندش
پابہ گل مانند شمشادش کند　　دست و پابندو کہ آزادش کند

جماعت کے اندر فردی پابندی عین اس کی آزادی ہے۔ کیوں کہ فرد کی طرح جماعت کی خودی کی تربیت بھی آئین اور اخلاق عالیہ سے ہوتی ہے۔

چوں اسیرے حلقۂ آئیں شود
آہوئے رم خوئے او مشکیں شود

فرد میں خودی خودنگر ہوتی ہے اور جماعت میں جا کر خودشکن ہو جاتی ہے۔ ابھی تک وہ ایک پھول کی پتی تھی اب ایک مکمل آراستہ چمن بن جاتی ہے۔

در جماعت خودشکن کردو خودی　　تا زگلبرگے چمن گردو خودی

جس طرح جمادات و نباتات کوئی ہنگامہ ہائے وہو برپا نہیں کر سکتے اور اپنی افتادگی اور بے کسی پر قانع ہیں۔ اسی طرح جماعتی آویزش کے بغیر اپنی انتہائی ریاضت وعبادت کے باوجود انسان حقیر و کم مایہ ہو جاتا ہے۔ مرد کامل جماعت کے ساتھ یلغار کرتا ہے اور باطل کو مٹا کر نقشِ آئینِ صالح قائم کرتا ہے۔

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل　　یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست　　یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

انسان کی فطرت علیحدگی کے خلاف بنائی گئی ہے اور وہ اپنی اصلیت پر قائم صرف اس حالت پر رہ سکتا ہے جب وہ جماعت کے ساتھ وابستہ ہو سکتا ہو۔

فطرتش وارفتۂ یکتائی است　　حفظ او از انجمن آرائی است

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ایک دوسرے سے مانوس ہوتے ہیں۔ اور موتی کے دانے کی طرح ایک رشتہ میں پروئے جاتے ہیں۔ جس سے زندگی کی مشکلات اور مہمات میں ایک دوسرے کے شریک بنتے ہیں اور رفیقانِ راہ کی طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ جس طرح ستارے جذب باہم سے اپنی محفل سجائے ہوئے ہیں اور ایک ستارہ کی ہستی دوسرے سے محکم ہوتی ہے۔

مردماں خوگر بیک دیگر شوند　　سفتہ در یک رشتہ چوں گوہر شوند
در نبردِ زندگی یار ہم اند　　مثل ہمکاراں گرفتارِ ہم اند
محفل انجم ز جذبِ باہم است　　ہستی کوکب نہ کوکب محکم است

ساقی ارباب ذوق

PDF BOOK COMPANY

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات :

Muhammad Husnain Siyalvi
0305-6406067
Sidrah Tahir
0334-0120123
Muhammad Saqib Riyaz
0344-7227224

مردِ کامل جو جماعت قائم کرتا ہے وہ قوت وشوکت حاصل کرتی ہے۔اور لازمی طور پر سریر آرائے حکومت ہوتی ہے۔"مردِ کامل" کی جماعت ہرگز کسی کی غلام نہیں ہوتی مگر وہ کسی کو غلام بھی نہیں بناتی۔وہ خود آزاد ہوتی ہے اور دوسروں کو بھی آزاد رکھتی ہے۔جوع الارض، کمزور پر ڈاکہ، چھوٹی قوموں اور جماعتوں کی لوٹ کھسوٹ اس سے پرے ہوتا ہے۔

کیونکہ وہ آئین واصول کی پابند ہوتی ہے۔اور اس کی تعمیر پختہ عقاید پر ہی ممکن ہے۔جس سے باز اور گوریا ایک ساتھ قعدہ میں نزدیک ہوتے ہیں۔

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام — نے غلام اورا نہ او کس غلام
بندۂ حق مرد آزاد است وبس — ملک و آئینش خدا داد است وبس
قاہر آمر کہ باشد پختہ کار — از قوانینِ گرد خود بندو حصار
جوعِ شاہیں تیز چنگ وزود گیر — معدہ را در کار ہا گردد مشیر

حکمتِ مشرق ومغرب نے سکھایا ہے مجھے ایک نکتہ کہ غلاموں کے لیئے ہے اکسیر
ین ہو فلسفہ ہو فقر ہو سلطانی ہو — ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر

مردِ کامل کے جماعت کی بنیاد رنگ ونسل یا جغرافیائی حدود ملک یا وطن پر نہیں ہوتی۔وہ اپنے خیالات کی پرواز میں عرش سے بھی بلند ہوتا ہے۔اور کسی ملک یا نسب کو اپنا نصب العین حیات نہیں بناتا۔انسانیت کے شرف ہی کو ضمیر تعمیر انسانی قرار دیتا ہے،اور اول انسان بننے کے بعد پھر کسی ملک یا وطن سے اپنے کو نسبت دیتا ہے۔اس کا سرچشمہ عرفانِ عقائد اور افکار عالیہ ہوتے ہیں نہ کہ انسانوں کی تقسیم یا قبائلی تعصب یا غرور وامتیاز رنگ و خوں کی خودنمائی ع

درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر اس کا بدخشاں، نہ بخارا، نہ خراساں
من اول آدم بے رنگ و بو دیم — ازاں پس ہندی و تورانیم من

وہ عالم گیریت کو اپنا اصول قرار دیتا ہے اور عام انسانی برادری کا اپنے کو ایک فرد تصور کرتا ہے۔اس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تمام انسانوں کو ایک رشتہ میں منسلک کردے اور اس لئے وہ عالم کا شہری ہوتا ہے اور بین الاقوامیت سے قومیت کی ابتدا کرتا ہے۔چنانچہ اس کا پرشور نعرہ یہ ہوتا ہے کہ

نہ میں عجمی نہ ہندی نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

آرٹ، ہنر اور فنونِ لطیفہ جن کی جماعت حق پرورش کرتی ہے۔ وہ ضمیر بندۂ خاک کو تابناک کرنے والے اور خودی کی حفاظت کے ضامن ہوتے ہیں۔

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر — گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یکدانہ
ضمیر بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی — بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات — نہ کر سکیں تو سراپا فسوں و افسانہ
گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر — وائے صورت گری و شاعری نالے و سرود
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں — جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

جماعت حق کا نظامِ حکومت جمہوری ہوتا ہے اور اس کی بنیاد آزادیِ کامل پر ہوتی ہے۔ جماعت حق کسی کی اور کسی طرح کی مادی یا ذہنی غلامی قبول نہیں کرتی وہ صرف خدا کی سرداری کو مانتی اور اس کے آگے گردن جھکاتی ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیر رہ نشیں

مگر اس کا جمہوری نظام صحیح معنوں میں جمہوری ہوتا ہے۔ جس میں قصہ خواب آور اسکندر و جم کی گنجائش نہیں ہے اور جو بیداریِ عوام پر مبنی رہتا ہے،

نغمہ بیداری جمہور ہے سامانِ عیش
قصہ خواب آور اسکندر و جم کب تلک

جماعت حق اپنے اندر دولت کی تقسیم مساویانہ رکھتی ہے۔ اس کے اندر سرمایہ داری پناہ نہیں پاتی۔ اور مزدور اور کسان باعزت اور نامور ہوتے ہیں۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام بنا کر تدبر کی فسوں کاری سے اس کو محکم کرنے کی سعی لاحاصل نہیں کرتی۔

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

مزدور کا دست دولت آفریں اس نظام میں اپنے حقیقی اعزاز کا طالب ہوتا ہے۔ اس کو خیرات کی طرح نہیں ملتی جیسا کہ سرِ دست رواج ہے ع

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

اور وہ کاشتکار زمیندار کے چنگل میں اس طرح گرفتار نہیں ہوتا کہ زمین دار تو روز موٹا ہوتا جاتا ہے اور کاشتکار نحیف و کمزور ہوتا رہے۔

دہقاں ہے کسی قبر کا اگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے

اس کا اصول ''الارض للہ'' اور اس کا خطاب زمیندار طبقہ سے یہ ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
وہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں میری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

زمین کی ملکیت زمین کا بیعنامہ و رہن نامہ اس کے اصول عالیہ میں ناجائز مطلق ہوتا ہے۔ کیونکہ زمین کسی کی ملک نہیں ہوتی۔

جماعت حق کے معاشی نظام کو بلحاظ ضرورت اولیت ہوتی ہے۔ اس میں بقاء نفس، تہذیب نفس پر تقدم رکھتا ہے مگر بلحاظ اہمیت تہذیب نفس کو بہت زیادہ تفوق حاصل ہے۔ وہ ''مساواتِ شکم'' پر اپنی اساس نہیں رکھتا اور نہ کل زندگی کو مادی تصور کرتا ہے۔ جماعتِ حق کا تمدن تعمیر مرد آزاد کا نصب العین رکھتا ہے اور اس کا خمیر حقائق سے بنتا ہے۔ جماعت حق عدل، مساوات، انسانی صداقت اور شجاعت پر قائم ہوتی ہے اور یہی اس کو نیابتِ الٰہی کا سزاوار قرار دیتے ہیں۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

ان اصولوں کی وجہ سے اقوام جہاں میں رقابت بند ہو جاتی ہے۔ کمزور کا گھر غارت گری سے محفوظ رہتا ہے۔ جنگ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ کرہ ارضی پر امن و صلح کی حکومت ہوتی ہے۔ تنازعات باہمی مثل سرمایہ دار و مزدور، زمین دار و کسان پیدا ہی نہیں ہوتے۔ دولت کے لئے حلال ذرائع ضروری قرار دئے جاتے ہیں اور منعم دولت کے امین بنتے ہیں۔

جماعت حق میں عورت کا درجہ

جماعت حق میں مرد اور عورت ایک دوسرے کے رفیق ہوتے ہیں۔ اور خلافتِ آدم کے قیام و بقا میں دونوں کا مساویانہ حصّہ ہوتا ہے۔ عورت زندگی کے سوز و ساز کی امین اور اسرارِ حیات کی ضامن ہے۔ وہ ہماری تپش اندرونی کو بیدار کرتی ہے اور خاک کو آدم بناتی ہے۔ زندگی کی تمام ممکنات اس کے خمیر میں پوشیدہ ہیں اور اس کے تب و تاب سے زندگی کا استحکام ہے۔ وہ ایک ایسا شعلہ ہے جس سے چنگاریاں نکلتی ہیں اور بلا اس کے سوز کے نہ تو جان بن سکتی ہے اور نہ تن۔ ہم سب لوگوں کی بلندیاں اس کی ارجمندیوں سے ہیں اور ہم سب اس کے باندھے ہوئے نقش پر ہیں۔ اگر خدا نے تجھے نرینہ بخشی ہے تو پاک بن اور عورت کی پاکیزگی اور بزرگی پر نظر کر ع

مرد و زن درستۂ یک دیگر اند — کائنات شوق را صورت گر اند

زن نگہ پارندۂ نارِ حیات — فطرت او لوحِ اسرارِ حیات

آتش مارا بجان خود زند — جوہر او خاک را آدم کند

در ضمیر ش ممکناتِ زندگی — جان و تن بے سوز او صورت نہ بست

ما از ارجمند یہائے او — ما ہمہ از نقش بند یہائے او

حق ترا داد ست گر تاب نظر
پاک شو قد سیت اورا نگر

اس لئے جماعت حق کے نظام میں عورت کو اس کا ممتاز و مخصوص درجہ دیا جاتا ہے۔ اور اس سے لاپرواہی نہیں برتی جاتی ہے۔ الغرض جماعت حق ایک زندہ قوم ہوگی جو صبح و شام اپنی تقدیر بدلتی رہے گی اور اس میں قلندرانہ ادائیں اور سکندرانہ جلال کے جلوے نظر آئیں گے۔

خودی سے مرد خود آگاہ کا جلال و جمال — کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں

شکوہ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن — قبول حق ہیں فقط مردِ حر کی تکبیریں

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

مردِ کامل اور مردِ مومن

مردِ کامل عقیدہ توحیدِ الٰہی سے محبتِ سرمدی رکھتا ہے۔ وہ خدا مست ہے اور اپنی انفرادی اور جماعتی خودی کو مکمل کرنے کے لئے ان قوانین و اخلاق عالیہ کا پابند ہوتا ہے۔ تاکہ شر کا گزر نہ ہو اور اس آبدار موتی پر آلودگیِ معصیت کی کوئی لکیر نہ ہو۔ مردِ کامل چونکہ عقل سے تسخیرِ فطرت کرنے کے بعد نفس کی آلودگی میں مبتلا ہو کر اپنی کاملیت و اکملیت کو نہ صرف کہ عروج پر نہیں پہنچا سکتا بلکہ ممکن ہے کہ وہ جنس گراں مایہ کو بالکل کھو کر ابلیسیت کا شکار ہو جائے۔ اس لئے اس کو تسخیرِ فطرت کے ساتھ ساتھ تسخیرِ نفس کی بھی فکر دامنگیر ہوتی ہے اور اس معاملے میں جیسا کہ پہلے کہا جا چکا، عقل اس کی رہنمائی سے مجبور ہے۔ اس لئے وہ عشق کو اپنا ہم سفر، رازداں و رہبر بناتا ہے۔ اس نئے نوامیس فطرت کی تلاش کرتا ہے اور وہ خالق فطرت کے سوا دوسرا نہیں دے سکتا۔ پس وہ خالق فطرت کے دئے ہوئے قوانین کے حصار میں اپنے کو محفوظ کر لیتا ہے۔ اور اپنی پختگی اور بے راہ روی سے بچنے کے لئے نیابت الٰہی کو معیارِ حق اسوۂ حسنہ ٹھہراتا ہے۔ اور اس طرح وہ اس کے اتباع میں لگ جاتا ہے کہ جس نے "روزگار تازہ آئیں" پیدا کیا۔ جو رحمۃ اللعالمین تھا۔ اور جس نے خالقِ کائنات کے دئے ہوئے فرامین کو اس طرح مکمل و مدون کر کے دے دیا ہے کہ تیرہ سو برس گزرنے کے بعد بھی اس میں کوئی تحریف نہیں ہوئی اور نہ اس کے ایک نقطہ میں کوئی فرق آیا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ مردِ کامل مردِ مومن ہی ہو سکتا ہے جو توحید برحق کے ساتھ اتباع و عشق رسالت پر ایمان و عمل رکھتا ہے۔ اس طرح مردِ کامل وہی ہے جو عشق رسول میں گم اور اتباع سنت میں کامل ہے۔ اس میں امکان کج روی مفقود ہے جبکہ دوسری جگہ موجود ہے۔ پس اقبال کا پیام "عشق رسولؐ" اور اس کا بیان مردِ کامل دونوں ایک ہی معنی کو ظاہر کرنے کے لئے مختلف الفاظ ہیں۔

☆

اقبالؔ کا مذہب

یہ شاعری کا اعجاز ہے کہ آج ہند اور بیرون ہند کا ہر دانشور، ادیب، نقاد اور اہلِ علم اقبالؔ کا معترف ہے اسے دنیا کے عظیم شاعروں کی صف میں جگہ دیتا ہے اور اس کی شاعرانہ فنکاری کی ہی مدح خواں نہیں ہے بلکہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ اس کے کلام میں آفاقیت اور عالمگیریت کے جواہر ریزے ہیں۔ مثلاً علی سردار جعفری اپنی تازہ تصنیف ''اقبال شناسی'' کے صفحہ ۲۷ پر تحریر فرماتے ہیں کہ ''اقبال کا ذہن فرقہ پرستی سے بلند تھا۔ انہوں نے کبھی ہندوؤں کے خلاف ایک لفظ نہیں لکھا اور مسلمانوں کے روحانی نشاۃ ثانیہ کو ہندوستان کی آزادی سے الگ نہیں کیا۔ ان کی شاعری اکثر و بیشتر اسلامی استعارے میں آفاقی حقیقتیں پیش کرتی ہے۔'' وہ دن چلے گئے جب نہ اقبالؔ کو شاعر تسلیم کیا جاتا تھا اور نہ ان کے کلام کی قدر و قیمت کا اندازہ تھا۔ یا تو مخالفانہ آوازیں تھیں جن کی نمائندگی مجنوںؔ گورکھپوری کی کتاب ''اقبال'' کر رہی تھی یا سکوتِ سخن شناس کا منظر تھا۔ حتیٰ کی جب اقبالؔ پر پہلی کتاب سر ذوالفقار علی خاں نے انگریزی میں لکھی تو کسی نے اس کا نوٹس تک نہیں لیا اور نہ کسی میں اقبال پر ریسرچ کرنے کا داعیہ پیدا ہوا۔ اسلام کا نام لینا ہی بہت سے لوگوں کے اجتناب کے لئے کافی تھا۔ لیکن ''شعر دلاویزے'' کے تسلسل کی کرامت ہے کہ رفتہ رفتہ ناقدین فن پر یہ راز آشکارا ہوا کہ ادب پر احتساب قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ انقلاب ''پیامِ مشرق'' شایع ہونے کے بعد نمودار ہونا شروع ہوا۔ حیرت سے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور اور دیگر دانشوروں نے آواز اٹھائی اور اب مطالعہ شروع ہوا تو اس کا اختتام نظر نہیں آتا۔

ان دو باتوں کے ساتھ کہ اقبالؔ ایک عظیم شاعر تھا اور اس کے کلام میں عالمگیریت اور آفاقیت ہے یہ بھی تسلیم ہے کہ اقبالؔ کی فکر کا محور اسلام ہے۔ اگرچہ بعض حلقوں میں اقبال نے رومی کی زبان سے جو ادعا کیا ہے کہ ''از تاک بادہ گیرم و در ساغرافگنم'' اسے تسلیم کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ایک زمانہ تک اقبالؔ کو نظر انداز کرنے کے بعد اب اس کی مدح و ستائش کا دریا اس شدت سے موج زن ہے کہ طوفان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ علی سردار جعفری ''اقبال شناسی'' کے صفحہ ۲۱ پر لکھتے ہیں:

''۲۵ سال تک ہندوستان نے اپنے عظیم شاعر اقبالؔ کو نظر انداز کیا اور کوئی

حیرت کی بات نہیں ہے، ہمارے شہر کے شاعر، ادیب اور قومی رہنما اکثر مختلف قسم کی تاویلوں کے شکار ہوتے رہتے ہیں..... ہندوستان کے ایک گروہ نے سیاست کے نشے میں اقبالؔ پر مسلم فرقہ پرستی کا الزام لگا کر انہیں قابلِ مذمت قرار دے دیا اور یہ بات پچیس سال تک مستند سمجھی جاتی رہی۔ اب اس کی تلافی کسی حد تک اندر کمار گجرال کی رہنمائی میں آل انڈیا ریڈیو نے کی ہے۔"

یہ بات صحیح ہو یا نہ ہو کہ اندر کمار گجرال کی رہنمائی میں پہلی مرتبہ سرکاری طور پر اقبالؔ کو تسلیم کیا گیا ہے اور یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ وہ کس "خدا کے پیغمبر" تھے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ ادیبوں، نقادوں اور فلسفیوں نے جب رنگ بدلا تو حکومت کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ اور ادیبوں، نقادوں اور فلسفیوں کو اقبال کی عظمت کے اعتراف میں رقیبانہ شوخ نگاہی کے زیر اثر بہت دیر لگی۔ لیکن اب فضا صاف ہو چکی ہے اور ہر چہار جانب نعرہ تحسین بلند ہو رہے ہیں۔ "نقوش اقبال" (مصنفہ مولانا سید ابوالحسن ندوی) کے دیباچہ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی تحریر فرماتے ہیں کہ:

محمد بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

یہ وہ عظیم شاعری ہے جو صحفِ سماوی کی مانند لازوال ہوتی ہے اس لئے صحائف کی دی ہوئی اور انہی کی ترجمان ہوتی ہے۔ یہ شاعری مذہب کو تہذیب، تہذیب کو مذہب سے اور دونوں کو زندگی سے مربوط، مستحکم اور تازہ رکھتی ہے۔ اردو شاعری میں اقبال کا یہی مرتبہ ہے..... ارمغانِ حجاز اور اپنی دوسری نظموں میں جا بجا اقبالؔ نے جس سپردگی اور جس شیفتگی سے "خاصہ خاصانِ رسل" کو پکارا ہے اور جو "حضور آیہ رحمت" میں نظر آتے ہیں۔ اس کو اردو شاعری میں ادب عالیہ کا درجہ حاصل ہے۔ مشہور مورخ نامور ماہر فلسفہ سیاست اور مشہور اہل علم ڈاکٹر تاراچند نے اپنی کتاب "تاریخ تحریک آزادی ہند" کی جلد سویم (انگریزی) میں ایک باب پنجم "مسلم افکار اور سیاست" قائم کیا ہے اس کا ایک ضمنی عنوان 'اقبال'، صفحہ ۲۳۵ پر ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:

"بیسویں صدی میں ہندوستان کے اندر رہنمایانِ مسلم افکار میں جو سب سے زیادہ عظیم تھا اور جس نے سب سے زیادہ اثر ڈالا وہ محمد اقبال تھے"

'انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ:

(۱) قرآن کامل اور مکمل دین کی تعلیم دیتا ہے جو انسان کے روحانی اور مادی معاملات کے حل کے لئے لاریب ہدایت ہے۔

(۲) قرآن خدا کا آخری الہام ہے اس نے تمام قدیم الہامات کو مکمل کر دیا اور اب کسی مزید الہام کی ضرورت باقی نہیں ہے۔

(۳) اسلام کی تعلیمات تمام دیگر مذہبی فرقوں کی تعلیمات سے برتر ہیں۔ یہ تعلیمات عالمگیر اور ابدی ہیں اور ان میں کسی طرح کی ترمیم ممکن نہیں ہے۔

(۴) محمدؐ نبی آخر الزماں ہیں۔

(۵) جو روشنی قرآن اور پیغمبر نے دی ہے اسی پر ان مقاصد کے حصول کے لئے جو معین کر دئے گئے ہیں انحصار کرنا چاہئے۔

آگے چل کر صفحہ ۲۴۵ پر فرماتے ہیں:

"یہ کہنا مشکل ہے کہ اقبال ترقی پسند تھے یا رجعت پسند دراصل وہ اسلام کے احیاء جدید کے مبلغ تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جس اسلام کی محمدؐ نے تعلیم دی اس میں عہد حاضر کی تمام حریت پسندی کی اقدار موجود ہیں۔ نہیں نہیں بلکہ ان اقدار کا جو فہم و ادراک اسلام نے پیش کیا ہے، مغرب کی حریت پسند کے اقدار سے کہیں زیادہ نفیس اور کہیں زیادہ جدت پسندانہ ہے۔ اگر چہ مغرب نے ثقافت کے میدان میں بڑی ترقی کی ہے۔ لیکن ان کی عمارت اس بنیاد پر تعمیر ہوئی ہے جسے مسلمانوں نے تعمیر کیا تھا، مثلاً علم طبیعیات اور علم حیاتیات۔ مغرب کے معاشرتی نظام کے اصول اور اس کے مادی نقطۂ نظر اسے اپنے سے اپنے کو تباہ کرنے کی راہ پر لے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کو مغرب کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس جدت کی مسلمانوں کو اجازت دی جا سکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ مسلمان ایمان و یقین کا وہ جذبہ پیدا کریں جس نے پیغمبر ﷺ اور ان کے فوراً بعد آنے والے خلفاء کے زمانہ کے مسلمانوں کے لہو کو گرمایا تھا۔"

کلامِ اقبالؔ کی اندرونی شہادت:

مندرجہ بالا سطور میں ہر نقطۂ خیال کے اکابرین کے اقوال آ چکے، اب مزید اسلام کا رشتہ ایک مضبوط رشتہ ہے اور اقبالؔ شاعر کا مذہب اسلام تھا اور مثالوں سے تمہید کو بوجھل کرنا مناسب نہیں ہے۔ منشا صرف یہ تھا جو پورا ہو چکا کہ اقبالؔ اور کلام اقبالؔ کی

اندرونی شہادت کا جائزہ لے لیا جائے "اسرار خودی" جس میں سب سے پہلے اقبال نے دعویٰ کیا ہے کہ مولانا روم نے جو کام اپنے عہد میں کیا تھا وہی کام وہ اس عہد میں کر رہے ہیں یعنی اسلام کو اجاگر کرنے کا کام۔ اس کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ خواب میں مولانا روم نظر آئے اور انہوں نے فرمایا ع

نالہ را انداز نو ایجاد کن　　　بزم را از ہائے و ہو آباد کن
خیز و جانِ نو بدہ ہر زندہ را　　　از قمِ خود زندہ تر کن زندہ را

یعنی عہد حاضر کے تقاضوں کے پسِ منظر میں حقیقتِ اسلام کو اسی طرح پیش کر رہا ہوں جس طرح انہوں (مولانا روم) نے اپنے زمانہ کی حالت کے مطابق یہ خدمت انجام دی تھی۔ کام وہی ہے صرف انداز نیا ہے۔ چنانچہ جابجا اس دعوے کو دہرایا ہے۔

نہ از ساقی نہ از پیمانہ گفتم　　　حدیث عشق بیباکانہ گفتم
شنیدم آنچہ از پاکان اُمت　　　ترا با شوخیٔ رندانہ گفتم

اس کے بعد خودی کے فلسفے کا مفصل بیان ہے پھر "حقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ" نیابت الٰہی، اطاعت، ضبط نفس وغیرہ کے تذکرے ہیں۔ اسی طرح رموز بیخودی پیش کش بحضور ملت اسلامیہ سے شروع ہوتی ہے اور اسلام کی مختلف تعلیمات مثلاً فرد و ملت کا تعلق ارکانِ اساسی ملت اسلامیہ، توحید، یہ کہ مقصود رسالت محمدیہ تشکیل و تاسیس، حدیث و مساوات و اخوت بنی نوع انسان ہے۔ سرّ حادثۂ کربلا، آئین ملت محمدیہ قرآن ہے سیرت ملیہ اتباع آئین الٰہیہ سے پختہ ہوتی ہے۔ مرکزِ ملتِ اسلامیہ بیت الحرام ہے اور یہ ہے کہ حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرہؓ النساء اسلام کے لئے اسوۂ کاملہ ہے۔ قل ہو اللہ کی تفسیر اور آخر میں دعا۔ جس میں بڑے کرب سے یہ آرزو کی ہے کہ حجاز میں میری موت ہو۔ اسی طرح زبور عجم، جاوید نامہ، ارمغان حجاز۔ پس چہ باید کرد اور اردو کی نظموں اور غزلوں میں اسلامی فلسفہ اور عشق رسول کا ولولہ بھرا ہوا ہے۔ مدینہ کا مسافر راستہ میں لوٹ لیا جاتا ہے اور اس بیان میں آگے جانے میں جان کا خطرہ ہے لیکن وہ والہانہ انداز میں کہتا ہے ع

بے زیارت سوئے بیت اللہ پھر جاؤں گا کیا　　　عاشقوں کو روز محشر منہ نہ دکھلاؤں گا کیا

کبھی اقبالؔ ساربان کی حدی میں اپنا جذبِ دل نمایاں کرتا ہے ع

ساربان یاراں بیثرب ماںجد　　　آں حدی کو ناقہ را آرد بوجد
جانم از درد جدائی در نفیر　　　آں رہے کہ سبزہ کم دارد بگیر

کبھی سکندر رومی کے بارے میں کہتا ہے کہ ع

آج ایشیا میں اس کو کوئی جانتا نہیں ۔ تاریخ دان بھی اسے پہچانتا نہیں
لیکن بلالؓ وہ حبشی زادۂ حقیر ۔ فطرت تھی جس کی نورِ نبوت سے مستنیر
جس کا امیں ازل سے ہوا سینۂ بلال ۔ مامور اس صدا سے ہیں شاہنشہ و فقیر
ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز ۔ صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوشِ چرخِ پیر
اقبال کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے ۔ رومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے

اسلام کی اساس حیات بعد الممات پر ہے اس کو طرح طرح سے اقبال نے پیش کیا ہے۔

چکبست کا ایک مشہور شعر ہے:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب ۔ موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

اس مادی نقطۂ نظر کو رد کرتے ہوئے اقبال پکارتا ہے:

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی ۔ ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

اسی طرح جب صبح نمودار ہوتی ہے تو برہمن اور مؤذن کو خبردار کرنے کے بعد

سوئے گورِ غریباں جب گئی زندوں کی بستی سے
تو یہ بولی نظارہ دیکھ کر شہرِ خموشاں کا
ابھی آرام سے سوتے رہو میں پھر بھی آؤں گی
سلا دوں گی جہاں کو خواب سے تم کو جگاؤں گی

کلام میں جگہ جگہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی تعلیمات بھی ہیں اور موثر انداز میں ہیں۔ توحید، رسالت، حیات بعد الممات، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور والہانہ عشقِ رسول کے بعد اب کیا باقی ہے جس کے لئے شاعر کے دین و مذہب کی تلاش کی جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کا مذہب اسلام تھا۔ لیکن بات اگر یہیں ختم ہو جانے والی ہوتی تو اس موضوع کو زیرِ بحث لانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیکن "اسلام" کا لفظ اب ابہام کا شکار ہو گیا ہے اور سوال کا جواب اگر صرف اسلام دیا جائے تو جواب تشنہ رہ جائے گا۔ اس لئے مزید تفصیل دریافت کرنے کی ضرورت ہے اس بنا پر دیکھنا ہوگا کہ اقبال سنی تھے یا شیعہ اگر سنی تھے تو کس گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ حنفی، شافعی، مالکی یا حنبلی یا اہلِ حدیث اور شیعہ تھے تو کس فرقہ سے وابستہ تھے۔ اقبال صوفی تھے یا متقشف عالم۔ تصوف اور خانقاہیت کے بارے

میں ان کے نظریات کیا تھے۔ اسی طرح قادیانیت اور معتزلہ اصولوں کے بارے میں ان کے کیا خیالات تھے۔ کیا تہذیب حاضر کی چمک دمک سے خائف و متاثر ہو کر انہوں نے اسلامی نظریات کی دور از کار تاویلات تو نہیں کیں۔

کیا اقبال شیعہ تھے؟

کلام اقبال کی اندرونی شہادت اس امر کا قاطع ثبوت پیش کرتی ہے کہ وہ حضرت علی کو وصی رسول اللہ اور خلیفۂ بلا فصل نہیں مانتے تھے۔ جس طرح وہ زور حیدری پر نغمہ سنج ہوئے ہیں اسی طرح فاروقیت اور صدیقیت کے بھی مدح خواں ہیں۔ اسرارِ خودی یا رموز بیخودی فارسی کلام ہو یا اردو ہر جگہ یہی منظر ہے۔ لیکن آیا وہ تفضیلیہ شیعہ تھے، یہ امر تنقیح طلب ہے کہا جا سکتا ہے کہ اپنی نظم "ایک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی" میں اقبال نے اپنے کچھ معتقدات کو مولوی صاحب کی زبان سے بیان کیا ہے۔ اس کا ایک شعر ہے ع

تفضیل علی ہم نے سنی اس کی زبانی ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا

اس لئے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ صاف صاف اعلان تفضیلیہ شیعہ ہونے کا ہے اور اس کی تائید ان کے بعد کے کلام سے بھی بالواسطہ ہوتی ہے۔

اسرار خودی میں نیابت الٰہی کے بعد فوراً در شرح اسماء حضرت علی مرتضیٰؓ شروع کر دیا ہے۔ اسی طرح رموز بے خودی میں رکن اول توحید اور رکن دوئم رسالت اور ان دونوں کے تفصیلی تقاضوں کے تذکرے کے بعد در معنی حدیث اسلامیہ و سرّ حادثہ کربلا کا باب ہے اور جس ولولے اور جوش کے ساتھ حضرت امام حسینؓ کی یادگار میں عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کئے ہیں ان سے تو کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا کیونکہ اس معاملے میں سنی اور شیعہ دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں جن تلمیحات کو درمیان میں لائے ہیں ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ سنی عقائد سے متعارض اور شیعہ عقائد سے قریب ہیں۔ مثلاً

آن امام عاشقاں پور بتول سرو آزادے ز بستان رسول
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر معنیٔ ذبح عظیم آمد پسر
سرّ ابراہیم و اسمٰعیل بود یعنی آں اجمال را تفصیل بود

(ترجمہ۔ وہ امام عاشقاں فرزند بتول رسول کے باغ کے سرو آزاد اللہ اللہ باپ

توبائے بسم اللہ اور پسر معنی ذبح عظیم۔ ابراہیم اور اسمعیل کا راز تھے یعنی وہ اجمال تھا یہ اس کی تفصیل تھے)

اسی طرح ''در شرح اسماء حضرت علی مرتضیٰ'' کا پہلا شعر ہے ع

مسلم اول شہ مرداں علی　　　　عشق را سرمایۂ ایماں علی

(ترجمہ۔ سب سے پہلے مسلمان شہ مرداں علی عشق کے لئے علی ایمان کا سرمایہ ہیں)

ان اشعار سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں اول یہ ہے کہ حضرت علی سب سے پہلے ایمان لائے اور دوسرے یہ کہ قرآن کی آیت وَفَدَیْنَاہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ حضرت امام حسین سے تعلق رکھتی ہے۔ حضرت ابراہیم نے اللہ کے حکم سے اپنے فرزند حضرت اسمعیل کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا اور چھری چلائی لیکن آنکھ کھولی تو دنبہ ذبح کیا تھا اور حضرت اسمعیل بچ گئے۔ آیۃ کا لفظی ترجمہ ہے۔

اور ہم نے ایک بڑا ذبح اس کے فدیہ میں دے کر اسے بچالیا۔

جہاں تک حضرت علی کی عظمت وشان اور ان سے محبت وعقیدت کا تعلق ہے دونوں گروہ سنی وشیعہ ایک دوسرے سے کم ہونے پر قانع نہیں ہیں۔ یہ بھی مسلم ہے کہ حضرت علی سابقون الاولون میں ہیں لیکن سنیوں کا عقیدہ ہے کہ جو لوگ سب سے پہلے ایمان لائے ان میں سب سے پہلے حضرت خدیجہ الکبریٰ آپ کی بی بی اور ام المومنین ہیں۔ اور جہاں تک کہ اوپر کی آیہ کا تعلق ہے جو تیسویں پارہ کی سورۃ صٰفٰت میں ہے اس کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسمعیل تک محدود سمجھتے ہیں اور شیعہ صاحبان بذبح عظیم کا اطلاق حضرت امام حسین پر بھی کرتے ہیں اور اسی کو اقبال نے کہا ہے کہ واقعہ کربلا سرِّ ابراہیم اور اسمعیل ہے اور وہ اس اجمال کی تفصیل ہے۔ آگے چل کر اقبال نے اس کو اور واضح کیا ہے ع

نقش اِلّا اللہ بر صحرا نوشت　　　　سطر عنوان نجاتِ ما نوشت

(ترجمہ۔ اِلّا اللہ کا نقش صحرا پر لکھ کر ہماری نجات کی دستاویز مرتب کردی۔ یہ عقیدہ بھی اختلافی ہے کہ کربلا کی شہادت امت کی بخشائش کے لیے ایک قربانی تھی، سنی عقیدہ نہیں ہے۔

سیدۃ النسا فاطمۃ الزہراؑ کے سامنے ہر مسلمان کی گردن خم ہے خواہ وہ کسی نقطۂ

خیال کا ہو۔ سنیوں کا یہ حال ہے کہ جمعہ کے دن ہر خطبہ میں حضرت فاطمہ الزہراؑ کی مدح ہوتی ہے اور حضرات حسنین کو جنت کے جوانوں کا سردار کہا جاتا ہے۔ لیکن اقبال نے حضرت فاطمہ الزہراؑ اور حضرت حسین کے بارے میں جو رموز بیخودی میں لکھا ہے صرف زور کلام دکھانے کے لئے اس کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں :

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز — از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز
نور چشم رحمۃ اللعالمیں — آں امام اوّلین و آخریں
آنکہ جاں در پیکر گیتی دمید — روزگارِ تازہ آئیں آفرید
بانوے آں تاجدار ھل اتی — مرتضیٰ مشکل کشا شیر خدا
بادشاہ و کلبۂ ایوان او — یک حسام و یک زرہ سامان او
مادر آں مرکزِ پرکارِ عشق — مادراں کارواں سالارِ عشق
آں یکے شمع شبستانِ حرم — حافظِ جمعیتِ خیر الامم
رشتۂ آئین حق زنجیر پاست — پاس فرمانِ جنابِ مصطفیٰ است
ورنہ گردِ تربتش گردید مے — سجدہ ہا بر خاکِ او پاشید مے

ترجمہ۔ حضرت مریم کا اعزاز تو صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت سے ہے لیکن حضرت فاطمہ الزہراؑ کا اعزاز تین نسبتوں سے ہے۔ رحمۃ اللعالمین امام اولین و آخرین کی آنکھوں کا نور (صاحبزادی) وہ کہ جس نے دنیا میں جان ڈال دی اور روزگار تازہ آئین پیدا کیا دوسرے تاجدار ھل الیٰ مرتضیٰ مشکل کشا شیر خدا وہ بادشاہ ہوتے ہوئے جھوپڑی میں رہائش رکھتے تھے۔ اور جن کے پاس سامان صرف ایک تلوار اور ایک زرہ تھی ان کی بی بی مرکز پرکارِ عشق اور کارواں سالارِ عشق کی ماں، یعنی ان کی ماں جو شمع شبستانِ حرم تھے اور خیر الامم کی جمعیۃ کے محافظ، آئین حق کی زنجیر کا رشتہ میرے پیروں کو باندھے ہوئے ہے اور جناب مصطفیٰ کے حکم کا پاس ہے ورنہ میں ان کی تربت کے گرد طواف اور ان کی خاک پر سجدہ کرتا۔

تصویر کا دوسرا رخ:

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا وہ تصویر کا ایک رخ تھا لیکن اس طرح کی شرح شاعر کے ساتھ ممکن ہے کہ ناانصافی قرار دی جائے کیونکہ جو کچھ اس نے کہا ہے اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی میں جو کچھ اقبال کے متعلق مولوی صاحب کی زبان سے نکلا اسے اقبال کا فرمودہ اور تسلیمی بیان مان لینا انصاف نہیں ہے کیونکہ آخر میں

اقبال کا فیصلہ یہ ہے :

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے　　کچھ اس میں تصنع نہیں واللہ نہیں ہے

اقبال جزئیات اسلام پر باہمی چپقلش سے بہت دور رہنا چاہتا ہے حتیٰ کہ شیطان کی مجلس شوریٰ میں قادیانیت اور اعتزال پر بحث و تکرار کو بھی وہ مکروہ قرار دیتا ہے وہ عمل کا مبلغ ہے چنانچہ شیطان یہ کہہ کر کہ ع

ہے اگر کوئی خطر مجھ کو تو اس امت سے ہے　　جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

اپنے مشیروں کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ :

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے　　یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے　　ہیں صفات ذات حق، حق سے جدا یا عین ذات

آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے　　یا مجدد جس میں ہوں فرزند مریم کے صفات

ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم　　امت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات

کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں　　یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے　　یا بساط زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے　　پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

ان اشعار میں قادیانی معتزلہ سب کے اقوال آ گئے اور ان سب پر مناظرے کو وہ شیطان کے کارخانے کا فروغ دیتا ہے۔ اس طرح اقبال، اقبال سے آگاہ نہیں کا منشا یہ ہے کہ کوئی کچھ بھی کہے میں بحثوں کا آدمی نہیں۔ میں خود اپنے متعلق کچھ نہیں کہتا ہوں۔ میں حنیفا مسلمہ سیدھا سادہ مسلمان ہوں۔ مشہور انقلابی مولانا عبید اللہ کے شاگرد عالمِ متبحر مولانا احمد علی شیرانوالہ دروازہ لاہور، صرف قرآن کی تعلیم کے لئے اپنی زندگی کو وقف کئے ہوئے تھے۔ اور بعد نماز فجر قرآن کی تفسیر بھی ابتدا سے عید کے دوسرے دن شروع کرتے اور ۲۹ رمضان کو ختم کر دیتے تھے۔ اور جب اس آیۃ پر آئے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ ایک سیدھے سادے مسلمان تھے تو جوش میں آ کر اسی آیۃ کو اس طرح پڑھتے تھے ما کان محمداً . محمدؐ نہ تو حنفی تھے نہ شافعی نہ مالکی نہ حنبلی نہ قادری نہ چشتی نہ نقش بندی وہ تو سیدھے سادے مسلمان تھے۔ اسی کا متبع اقبال تھا اور اس کا پورا کلام اور اس کی پوری زندگی ان مباحث سے یکسر خالی ہے۔ اقبال اس پر پختہ اعتقاد رکھتا تھا کہ اسلام میں کوئی فرقہ نہیں ہے اور جو اختلافات بظاہر دکھلائی دیتے ہیں وہ محض جزوی ہیں۔ اساس دین کے فلسفہ پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ڈاکٹر تاراچند بھی اپنی کتاب ''تاریخ تحریک آزادی ہند''

جلد سویم کے صفحہ ۳۴۹ پر حسب ذیل الفاظ میں اس کی تائید فرماتے ہیں: جہاں تک مذہب کا تعلق ہے اقبالؔ نے، مسلمانوں کے فرقوں میں جو اختلافات ہیں ان کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سب معمولی باتیں ہیں۔ اگر چہ ملا صاحبان مبالغہ سے کام لے کر ایک دوسرے پر لعن طعن کرتے ہیں اور اندھا دھند ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ اختلافات کوئی اہمیت نہیں رکھتے ہیں کیونکہ تمام فرقے عقائد کے بنیادی مسائل پر متفق ہیں اور جو اختلافات نظر آتے ہیں وہ سب اساسی بنیادوں کے تخیلات میں ضم ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح در شرح اسماء میں حضرت علی مرتضیٰؓ میں ایسی کوئی انوکھی بات نہیں کہ انہوں نے حضرت علیؓ کی منقبت بیان کی، کیوں کہ کوئی اختلافی مسئلہ کسی طرح کا ہے ہی نہیں اور چونکہ اقبالؔ پوری دنیائے اسلام کو مخاطب کر رہا تھا جس میں ایران اور شیعہ حضرات بھی شامل تھے اس لئے اس نے قرون اولیٰ کے بزرگ ترین لوگوں میں ان صاحب عظمت و رفعت کا انتخاب کیا ہے جس پر کوئی اختلاف نہیں ہے اور جس کے آگے سب کی گردن خم ہے۔ رہی یہ بات کہ حضرت علیؓ کو "مسلم اول" کہا ہے تو بھی تسلیم ہے کہ حضرت علی **سابقون الاولون** میں ہیں۔ مسلم اول سے مراد کس طرح لی جا سکتی ہے کہ **سابقون الاولون** میں سب سے پہلے ایمان لائے تھے۔ اقبالؔ قرون اولیٰ کے بزرگوں میں سے سب کے خصائص بیان کرتا ہے۔ اسی اقرار خودی میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مدح اور حضرت عمرؓ کا واقعہ بڑے جوش کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ان کا تازیانہ اونٹ کے نیچے گر گیا تو خود نیچے اتر کر اٹھایا۔ فاروق اور فاروقیت میں اتنی گرم جوشی سے بار بار لکھا ہے کہ خون گرما جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں ایک قطعہ بانگ درا میں ہے۔ واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ رسول ﷺ نے چندے کی اپیل کی حضرت عمرؓ اپنا نصف مال لائے پھر:

اتنے میں وہ رفیق نبوت بھی آ گیا — جس سے بناء عشق و محبت تھے استوار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مرد وفا سرشت — ہر چیز جس کو چشم جہاں میں ہوا عتبار
بولے حضورؐ چاہئے فکر عیال بھی — کہنے لگا وہ عشق و محبت کا رازدار

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس

حضرت امام حسین اور حضرت سیدۃ النسا کے بارے میں اقبال کا جوش اور ان کی

محبت ان کے ایمان کامل کی دلیل ہے اور **فدینٰہ بذبح عظیم** اور 'سطر عنوانِ نجات مانوشت' سے مراد صرف اس قدر ہے کہ جو مجلس شوریٰ توڑ دی گئی تھی اس کے خلاف جہاد کر کے اور شہادت قبول کر کے امت کو بہت ہی غلط راستے پر چلنے سے نجات دلائی۔ بقیہ شاعرانہ انداز سخن ہے اور عظیم سے عظیم تر ہے۔ اقبالؔ آل اور اصحاب کا یکساں احترام کرتا ہے ع

گرمی ہنگامۂ بدر و حنین
حیدرؓ و صدیقؓ و فاروقؓ و حسینؓ

شیعہ سنی اتحاد و اتفاق:

اقبالؔ شیعہ، سنی اتحاد کا ایک عظیم مبلغ ہے۔ جب پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیائے اسلام پر تاریکی چھائی ہوئی تھی تو اقبالؔ طلوع اسلام کا خواب دیکھ رہا تھا اور شیعہ، سنی اور تمام ملت کے اتحاد کو پکار رہا تھا۔

سرشک چشم مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا — خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے گہر پیدا
مابود آں ترک شیرازی دل تبریز کابل را — صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا

خضر راہ میں "دنیائے اسلام" کے عنوان کے تحت کہتا ہے ع

ربط و ضبط ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات — ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہوں — ملک و ملت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے — نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر
تا خلافت کی بنا دنیا میں پھر ہو استوار — لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکر و علی ہشیار باش

اقبالؔ کے حنفی مسلمان ہونے پر اس کے کلام کا ذرہ ذرہ شہادت دیتا ہے۔ اعمال صالحہ کے زیر عنوان نہایت فصاحت سے ارکان خمسہ کی ہدایت کرتا ہے ع

لذت ایماں فزاید در عمل — مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل
لا الہ باشد صدف، گوہر نماز — قلبِ مسلم را حجِ اصغر نماز
در کفِ مسلم مثال خنجر است — قاتل فحشا و بغی و منکرات
روزہ بر جوع و عطش شبخوں زند — خیبر تن پروری را بشکند

مومناں را فطرت افروز است حج　　ہجرت آموز و وطن سوز است حج
طاعتے سرمایۂ جمعیتے　　ربط اوراق کتاب ملتے
حب دولت را فنا سازد زکوٰۃ　　ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ
ایں ہمہ اسباب استحکام تست　　پختہ و محکم اگر اسلام تست

(مطلب: عمل سے ایمان کی لذت میں اضافہ ہوتا ہے اور ایمان جو عمل میں نہ آسکے مردہ ہو جاتا ہے۔ کلمہ توحید سیپ اور نماز اس کے اندر موتی ہے۔ نماز مسلمان کے قلب کے لئے حج اصغر کا درجہ رکھتی ہے، نماز مسلمان کے ہاتھ میں ایک خنجر ہے جس سے فواحش نافرمانی اور منکرات تہ تیغ ہو جاتے ہیں (ایک آیہ کا ترجمہ ہے) روزہ بھوک اور پیاس پر شب خوں مارتا ہے اور تن پروری کے قلعے کو توڑ ڈالتا ہے۔ حج مومن کے لئے فطرت افروز ہے، ہجرت کی تعلیم دیتا ہے اور وطن سوز ہے۔ زکوٰۃ حب دولت کو فنا کرتی ہے اور مساوات کا بھی سبق دیتی ہے اگر تیرا اسلام پختہ ہے تو یہ سب تیرے لئے اسباب (استحکام) ہیں۔

اقبال نے ایک باب رقم کیا ہے ع

در معنی اینکہ نظام ملت
غیر از آئین صورت نہ بندو
و آئین ملت محمدیہ قرآن است

یعنی نظام ملت بلا آئین ظہور پزیر نہیں ہو سکتا اور ملت محمدیہ کا آئین قرآن ہے۔

اقبال اور ائمہ اربعہ:

اب یہ سوال یہ ہے کہ سنی المذہب ہوتے ہوئے بھی وہ ائمہ اربعہ میں کس کا مقلد تھا یا کسی کا مقلد نہیں تھا۔ قبل اس کے کہ میں اس بحث میں کچھ کہوں میں یہ خیال ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ خود مجتہد تھا، اتباع و تقلید سے بے نیاز۔

قلندر جز دو حرف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا　　فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا
تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی　　رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے
نہ شیخ شہر نہ شاعر نہ خرقہ پاش اقبال　　فقیر راہ نشین است و دل غنی دارد
بے نیازانہ ز شوریدہ نوا ایم بگور　　مرغ لاہوتم و از دوست پیامے دارم
گیا ہے تقلید کا زمانہ مجاز رخت سفر اٹھائے　　ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا

اجتہاد

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے — نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں — آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں — ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

اِدعا

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم — مثالِ شاعراں افسانہ بستم
بجبریلِ امیں ہم داستانم — رقیب و قاصد و درباں ندانم
اگر آیم بدریائے نہ گنجم — اگر خاکم بہ صحرائے نہ گنجم
دلِ سنگ از زجاجِ من بہ لرزد — یمِ افکارِ من ساحل نہ درزد
نہاں تقدیرہا در پردۂ من — قیامت ہا بغل پروردۂ من

جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہو وہ وہی بات کہتا ہے جو جبرئیلِ امیں نے کہی۔ وہ جبرئیل کا ہم داستاں اگر پانی ہے تو دریا میں نہیں سما سکتا اور اگر خاک ہے تو صحرا میں نہ سمائے گا۔ جس کے افکار کے سمندر کا کنارہ نہیں ہے اور جس کے شیشے سے پتھر کا دل بھی لرز جاتا ہے۔ جس کے دامن میں تقدیر پرورش پاتی ہے اور قیامت جس کے بغل پروردہ ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ یہ نہ سوچنا کہ میں بے بادہ مست ہوں اور شاعروں کی طرح میں نے افسانے گڑھے ہیں۔ وہ بھلا مقلد کیسے ہو سکتا ہے۔ البتہ عشقِ رسول جو اس کا خاص موضوع اور پیام ہے جب اس کے بہار آفریں جلوہ کو دیکھتا ہے تو وجد میں آجاتا ہے۔ چنانچہ جب امام مالک نے حرم نبویؐ سے اٹھ کر اور ہارون رشید کے محل میں جا کر حدیث پڑھانے سے انکار کیا تو کس ذوق وشوق سے ترنم ریز ہوتا ہے۔

قائدِ اسلامیاں ہارون رشید — آنکہ فغفور آب تیغ اور چشید
گفت مالک را کہ اے مولائے قوم — رونق از خاکِ درت سیمائے قوم
لعل تا کے پردہ بند اندر یمن — خیز و در دار الخلافہ خیمہ زن
گفت مالک مصطفیٰ را چاکرم — نیست جز سودائے او اندر سرم
من کہ باشم بستۂ فتراک او — بر نہ خیزم از حریم پاک او
بے نیازی نازیا دارد بسے — نازِ او انداز ہا دارد بسے

جگن ناتھ آزاد نے لکھا ہے:

آیا ہے ایک تو اقبال کی جادو بھری شاعری جو اپنے بے پایاں کیف و تاثر کے ساتھ قاری کو بہا لے جاتی ہے۔ ایک ایسے کیف و تاثر کے ساتھ جو اقبال سے پہلے اردو شاعری میں موجود نہیں تھا.....''۔

ہم کو اقبال پر کچھ کہنے سے پہلے بہت احتیاط اور ہوش مندی سے کام لینا چاہئے۔ اسی لئے بطور مدح کہیں امام مالک اور کہیں امام شافعی کا ذکر آتا ہے لیکن ائمہ اربعہ میں سے کسی کی اتباع کا اشارہ نہیں ہے۔ کتاب و سنت سے ہی ان کو واسطہ تھا اور وہ قرون اولیٰ کے اسلام کے مبلغ تھے اور خود مسائل کے مجتہد۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اقبال نے شریعت میں کوئی اپج یا کوئی فکری ترمیم کی۔ ان کے عقائد و اعمال کا نچوڑ یہ ہے کہ ع

به مصطفیٰؐ برساں خویش کہ دیں ہمہ اوست — اگر به او نہ رسیدی تمام بولہبی است

(ترجمہ: مصطفیٰؐ تک رسائی کر کہ دین کل وہی ہے اور اگر ان تک رسائی نہ ہوئی تو تمام ابولہبی ہے۔)

دین فطرت از نبی آموختیم — درره حق مشعلے افسر وختیم
پس خدا بر ما شریعت ختم کرد — بر رسول ما رسالت ختم کرد
خدمت ساقی گری با ما گزاشت — داد مارا آخری جامے کہ داشت
لا نبی بعدی ز احسان خدا است — پردۂ ناموس دین مصطفیٰؐ است

(ترجمہ: ہم نے دین فطرت نبی سے سیکھا اور حق کی راہ میں مشعل جلائی بس خدا نے ہم پر شریعت ختم کردی اور ہمارے رسولؐ پر رسالت ختم کردی۔ ساقی گری کا کام ہمارے واسطے چھوڑا اور ہم کو آخری جام جو تھا دے دیا **لا نبی بعدی** یعنی میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا (حدیث) خدا کا احسان ہے اور دین مصطفیٰؐ کا پردۂ ناموس ہے)

اس طرح اقبال صرف ساقی گری کا کام کرتا ہے اور جام و مے عطا کردہ نبی کا ہے۔ اقبال نے اکثر اپنے کو ساقی کہا بھی ہے۔

خیر تو ساقی سہی لیکن پلائے گا کسے — اب نہ وہ میکش رہے باقی نہ مے خانے رہے
نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے — مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی
کٹی ہے رات تو ہنگامہ گستری میں تری — سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی

فکر اقبال کا منبع وماٰخذ :

کلام اقبال میں طالسطائی، شیکسپیر، ہیگل، گوئٹے، برگسان، بائرن، براؤننگ، لانگ فیلو، ٹینی سن، بیکن، مارکس، لینن، آئن اسٹائن کے تذکرے ملتے ہیں۔ اس لئے رام، گوتم بدھ، شیو، بھرتری ہری، شنکر آچاریہ، گرونانک پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن اس نے کوئی چیز مستعار لی ہے، کیا وہ ان میں سے کسی کا شاگرد یا متبع ہے۔ اس معاملہ میں حکمائے ہند متفق نہیں ہیں۔ اقبالیات پر تحقیق کرنے والا ہر مصنف اقبال کو اپنے خیال کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے جس کی ایک وجہ تو وہ ہے جس کو ہر ایک تسلیم کرتا ہے اور جسے جگن ناتھ آزاد نے اپنی کتاب ''اقبال اور مغربی مفکرین'' کے صفحہ ۱۰ پر ان الفاظ میں لکھا ہے:

''اصل میں جہاں تک کلام اقبال پر قلم اٹھانے کا تعلق ہے اس کی دلکشی، تازگی، رعنائی اور شگفتگی ہمیشہ میری راہ میں حائل رہی ہے۔''

دوسری وجہ وہ ہے جو فطری ہے اور جسے عبدالغنی صاحب نے رسالہ ''الفاظ'' کے اول شمارے کے صفحہ ۲۷ پر اس طرح لکھا ہے:

''ہر شخص اپنے خاص ذہن کے مطابق اپنے موضوع مطالعہ کی اسی جہت پر زور دیتا ہے جو اس کی سمجھ میں آتی ہے۔''

عبدالغنی صاحب کا یہ دعویٰ بھی بطور دلیل پیش کیا جا سکتا ہے کہ ان کے علاوہ اور کسی نے اقبال کو سمجھا ہی نہیں اور ''گیسوئے اقبالیات ابھی منت پزیر شانہ ہے''۔

چنانچہ عبدالغنی صاحب نے مطالعہ کے کچھ اصول بھی مرتب کئے ہیں:

''اسلام کو ملا صاحبان نے جس طرح تنگ دائرے میں محصور کر دیا تھا اس سے بھی کسی صاحب فکر اور اہلِ علم کو یہ ماننے میں تامل ہوتا ہے کہ اقبال نے جو کچھ کہا ہے کہ اسلام کی تعلیمات ہیں، اسلامی تعلیمات میں آفاقیت اور عالمگیریت کا اظہار و بیان چونکا دینے والا ہوتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ ایک عرصے تک اقبال کو نہ شاعر تسلیم کیا گیا نہ مفکر۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خود اقبال کا دعویٰ کیا ہے۔ اور خود اس کی شاعری کیا اعلان و اظہار کرتی ہے؟ اسرارِ خودی میں اقبال نے مثنوی مولانا روم کو حرف پہلوی میں قرآن قرار دیا ہے ع

روئے خود بنمود پیر حق سرشت　　گو بحرف پہلوی قرآن نوشت

(ترجمہ: پیر حق سرشت جس نے فارسی زبان میں قرآن لکھا نمودار ہوئے)

ایک پرانے مقولے کی تصدیق ہے ع

مثنوی ، مولوی، معنوی　　ہست قرآن در زباں پہلوی

ہر جگہ اقبال اپنے کو مرید اور رومی کو پیر کہتے ہیں۔ سارا کلام اس سے بھرا پڑا ہے

ع

مطرب غزلے بیتے از مرشدِ روم آور　　تا غوطہ زند جانم در آتش تبریزی

(ترجمہ: اے مطرب کوئی غزل یا شعر مرشد رومی سے لاتا کہ میری جان آتش تبریز میں غوطہ لگا سکے۔)

فلسفہ فکر انسانی ہے اور روحانیت الہام اور نور الٰہی ہے۔ رومی اسی الہام آخر کا مبلغ ہے اور وہ فلسفہ سے بالاتر ہے ع

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم　　دست رومی پردۂ محمل گرفت

(ترجمہ: بوعلی سینا فلسفی تو غبار ناقہ میں گم ہو گیا لیکن رومی کے ہاتھ نے پردہ محمل کو پکڑ لیا)

اسی طرح شعرا کا مقابلہ کر کے یہی خیال ظاہر کرتا ہے ع

برونگ

بے پشت بود بادہ سرجوش زندگی　　آب از خضر بگیرم و در ساغر افگنم

بائرن

از منت خضر نتواں کرد سینہ داغ　　آب از جگر بگیرم و در ساغر افگنم

غالب

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر　　بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

رومی

آمیزشے کجا گہر پاک او کجا　　از تاک بادہِ گیرم و در ساغر افگنم

(ترجمہ: زندگی کی ابلتی ہوئی شراب بے سہارا تھی اس لئے برونگ نے خضر سے پانی لیا اور ساغر میں ڈال دیا۔ بائرن نے خضر کے احسان سے اپنا سینہ داغدار کرنا پسند نہیں کیا اور اپنے جگر سے پانی نکالا اور ساغر میں ڈال دیا۔ غالب نے بادہ کو زیادہ تلخ اور سینے کو زیادہ زخمی کرنے کے لئے آبگینہ کو پگھلایا اور ساغر میں ڈال دیا۔ لیکن رومی فرماتے ہیں بھلا کہاں

آمیزش اور کہاں وہ گہر پاک میں تو انگور کے خوشے سے شراب نکالتا ہوں اور براہ راست ساغر میں ڈالتا ہوں۔)

یہ وہی خیال ہے جو اقبال نے جبریل سے ہم داستاں ہونے پر پیش کیا ہے۔ اس طرح اقبال اپنے کو رومی کا متبع تو کہتا ہے، دوسروں کا معترف بھی ہے، ثنا خواں بھی اور خردہ گیر بھی۔ لیکن کسی کا منت پزیر اپنے کو نہیں بتلاتا اور نہ بغور مطالعے سے ایسا ثابت ہوگا۔ اقبال کا دعویٰ یہ ہے، جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ رومی نے بحرف پہلوی قرآن اس زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے اور اس زمانے کی فکری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کہا اور میں نے اس زمانے کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر ہی کام کیا۔ ع

چو رومی در حرم دارم اذان من — از و آموختم اسرارِ جان من
بہ دورِ فتنۂ عصر کہن او — بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

یہ وضاحت، یہ اعلان، یہ دعویٰ قطعیت کا درجہ رکھتا ہے اور اسی پر اقبال آخر تک قائم رہا۔ اس لئے یہ بات جہاں تک خود شاعر اقبال کا دعویٰ ہے، طے شدہ ہے کہ اقبال کا منبع و ماخذ قرآن اور سنت ہے اور ان کی شرح کے اشارے انہیں مولانا روم سے ملے۔ یہ امر کہ اقبال نے مفکرین مغرب سے کوئی خیال مستعار نہیں لیا خود اقبال کے دعوے میں شامل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے مشرق و مغرب کے فلسفے کا مطالعہ کیا اور رومی نے اس کو منزل کبریا کا پتہ دیا۔

شعلۂ در گیر زد بر خس و خاشاک من — مرشد رومی کہ گفت منزل ما کبریاست

(ترجمہ: میرے خس و خاشاک میں آگ لگ گئی جب مرشد رومی نے کہا کہ ہماری منزل کبریا ہے)

مشرق و مغرب کے فلسفے کے مطالعے پر اقبال کو بڑا ناز ہے:

بہت دیکھے ہیں ہم نے مشرق و مغرب کے میخانے

اور دونوں کی حقیقت یوں بیان کرتا ہے ع

یہاں ساقی نہیں وہاں کمیاب ہے صہبا

ہے فلسفہ میرے آب و گل میں — پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی — برہمن زادہ اے رمز آشنائے روم و تبریز است

(مجھے دیکھو کیونکہ ہندوستان میں کوئی دوسرا ایسا نظر نہیں آئے گا۔ میں برہمن زادہ

اور روم وتبریز کا رمز آشنا ہوں)

مطالعہ کرنے سے کوئی متبع قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اقبال نے اس شک کا بھی علاج کر دیا ہے وہ صاف صاف کہتا ہے۔

زمانے با ارسطو آشنا باش — دمے با ساز بیکن ہم نوا باش
ولیکن از مقام شاں گزر کن — مشو گم اندا ین منزل سفر کن

(ترجمہ: ایک زمانے تک ارسطو کے شناسہ ہو اور ایک دم ساز بیکن سے بھی ہم نوائی کرو لیکن ان لوگوں کے مقام سے آگے نکل جاؤ ان کی منزل میں گم نہ ہو سفر کرو)

حکمت کے متعلق ایک حدیث ہے جس کو اقبالؔ نے شعر میں بیان کیا ع

گفت حکمت را خدا خیرے کثیر — ہر کجا ایں خیر را یابی بگیر

اور حالیؔ نے اس کو اردو میں فرمایا ہے ع

کہ حکمت کو اک گم شدہ لعل سمجھو — جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو

دوسری دلیل:

دوسرے اس بات کی کہاں تحقیق ہوئی کہ جو خیالات وافکار اقبال نے پیش کئے ہیں وہ خود ان کے نہیں ہیں جو انہوں نے قرآن وحدیث یا مثنوی مولانا روم سے مستنبط نہیں کئے ہیں۔ اس کی ایک مثال جگن ناتھ آزادؔ کی تصنیف ''اقبال اور مغربی مفکرین'' کے صفحہ ۴۳ کی عبارت میں ملتی ہے۔

''کانٹ کے اس نظریہ کے ساتھ کہ خودی کی بنیاد یقین ہے نہ کہ برہان اور علوم باطنی کی کنجی باطنی تجربہ ہے نہ کہ علمی تجربہ'' اقبالؔ کلی طور پر متفق ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ رومی کانٹ کی پیدائش سے سیکڑوں سال پہلے کہہ چکے ع

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

(ترجمہ: استدلالیوں کا پیر لکڑی کا ہوتا ہے اور لکڑی کا پیر سخت کمزور ہوتا ہے) اس کے بعد فاضل مصنف نے کانٹ اور اقبال میں فرق ظاہر کیا ہے:

''کانٹ کی نظر میں انسان کی مختاری اور حیات ابدی نظام کائنات کے انصاف

کی دلیلیں ہیں لیکن اقبال کے نزدیک یہ دونوں انسان کی اپنی جدو جہد کے انعامات ہیں۔ کانٹ فرد کو واجب الوجود قرار دیتا ہے۔ اقبال فرد کو جہد میں تپی ہوئی شخصیت۔ اقبال کے یہاں شخصیت تصور اس کے اہم ترین تصورات میں ہے۔ اصل میں اقبال کا سارا فلسفہ خودی شخصیت کی ارتقا کے گرد گھومتا ہے"

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ "اقبال پر کانٹ کے اثر کا ذکر ختم کرنے سے پہلے اقبال کا شعر پیش کرنا چاہتا ہوں ع

گماں مبر کہ ہمیں خاک داں نشیمن ماست
کہ ہر ستارہ جہاں است یا جہاں بودہ است

(ترجمہ: یہ مت خیال کرو کہ یہی خاک داں میرا نشیمن ہے کیونکہ ہر ستارہ ایک دنیا ہے یا دنیا رہ چکا ہے)

یہ کہنا تو دشوار ہے کہ یہ شعر کانٹ ہی کے افکار کا پرتو ہے لیکن کانٹ نے اپنی کتاب "آسمانوں کے مسائل" میں کہا ہے کہ تمام ستارے یا تو آباد رہ چکے ہیں یا ایک نہ ایک دن آباد ہو جائیں گے۔

میری گزارش ہے کہ اولاً تو اس معاملے کا تعلق اخلاقی و روحانی اقدار سے نہیں اور نہ قوموں کے عروج و زوال سے ہے۔ یہ ایک علم الافلاک کا مسئلہ ہے اور جس میں خود اقبال کے قول کے مطابق کوئی چیز حرف آخر نہیں قرار دی جا سکتی، دوسرے میں نے بعض بزرگوں سے سنا ہے کہ اس بارے میں کوئی حدیث بھی ہے۔

جس طرح سے اقبال نے مشرق اور مغرب کے فنکاروں کا ذکر کیا ہے اس میں ایک طرف تو ان کی روشن خیالی ظاہر ہوتی ہے اور دوسری جانب ان کی خود اعتمادی اور جدت پسندی بھی نمایاں ہے۔ رموز حکمت کو اپنانا کوئی عجیب چیز نہیں ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ آیا انہوں نے کہیں کوئی ایسی بات کہی ہے جو ان کے اس دعوے کی تکذیب کرتی ہو کہ میں وہ کام اس زمانے میں انجام دے رہا ہوں جو رومی نے اپنے زمانے میں انجام دیا تھا۔ اور رومی کی طرح میں بھی حرم میں اذان دے رہا ہوں۔ اور میرا پیغام خالص وہ ہے جو جبرئیل امین لائے تھے۔ یعنی کیا اقبال کے جبرئیل کی ہم داستانی کا دعویٰ حقیقی ہے یا کھوکھلا؟ اور حرم میں جو اذان وہ دے رہا ہے اس میں ناقوس مفکرین مغرب و مشرق کی صدا بھی شامل ہے؟

اس لئے آج تک میری نظر سے کوئی دلیل نہیں گزری۔ اور جب کبھی کسی نے یہ آواز اٹھائی کہ اقبال کا کوئی نظریہ کسی سے مستعار لیا گیا ہے تو اقبال نے خود اس کی تردید کی۔ چنانچہ جب لوگوں نے یہ کہا کہ اقبال کے ''مردِ کامل'' کا نظریہ نیطشے کے ''فوق الانسان'' کا چربہ ہے تو اقبال نے جو خط ڈاکٹر نکلسن کو لکھا ہے اس میں اس کی تردید کے بعد لکھا کہ ''نیطشے کا ''فوق البشر'' اور میرا ''مردِ کامل'' ایک ہی چیز نہیں ہیں اور میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل مردِ کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا اور یہ وہ زمانہ ہے کہ جب نہ تو نیطشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا اور نہ اس کی کتابیں میری نظروں سے گزری تھیں۔

اسی طرح بعض ناقدین مثلاً علی سردار جعفری وغیرہ اقبال کو کارل مارکس کا خوشہ چیں قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ''خضر راہ'' میں مزدور کی حمایت اور دوسری نظموں میں زمینداری کی پرزور مخالفت اور کسانوں کی حمایت کے لئے مضامین اقبال نے کارل مارکس سے لئے ہیں۔ اتنا کہنے کے بعد ان کو یہ دقت واقع ہوتی ہے کہ کارل مارکس خالص مادی نقطۂ نظر رکھتا ہے اور وہ یہ کہہ کر دامن بچا لے جاتے ہیں کہ اقبال اسلامی سوشلسٹ تھے۔ بہت سے لوگ اقبال کے شعر ع

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

سے یہ مطلب نکالتے ہیں کہ اس سے مراد کارل مارکس یا لینن ہیں۔ یہ خواہ مخواہ کی زبردستی ہے۔ پہلی جنگ عظیم ایک آگ تھی جس نے جاگیردارانہ نظام اور سرمایہ داری پر کاری ضرب لگائی تھی اور پوری دنیا اس کی کریڈٹ لے رہی تھی۔ سرمایہ داری پر پوری طاقت اور اپنی فن کارانہ مہارت سے جو چوٹ اقبال نے کی ہیں اس کو اسلام سے پرے اس لئے سمجھا جاتا ہے کیونکہ خود مسلمانانِ عالم اس کے شکار ہو چکے تھے۔ ازمنہ وسطیٰ نے نظریہ سلطانی اور جاگیرداری و سرمایہ داری کو جزو دین بنا دیا تھا۔ اقبال قرون اولیٰ کی طرف مسلمانوں کا ذہن پھیرنا چاہتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد اپنی کتاب ''اقبال اور مغربی مفکرین'' کے صفحہ ۷۵ پر تحریر فرماتے ہیں :

> ''مذہب کے بارے میں ایسے خیالات رکھنے والے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ اشتراکی ہے یا اشتراکیت سے قریب ہے۔ اب رہا اس قسم کے

کے اشعار جیسے کہ 'ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے' وغیرہ وغیرہ (یہاں پر وہ اشعار حذف کر دئے گئے ہیں جو اس موضوع پر نقل تھے) تو ان کا محرک ایک تو وہ دردِ انسانی ہے جس سے اقبال کی شخصیت عبارت تھی دوسرا حالاتِ حاضرہ پر ان کی کڑی نظر، تیسرا ان کی بصیرت یا فراست جس کی بدولت انہوں نے ۱۹۰۷ء میں شعر کہے تھے ع

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

"آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ روس میں اتنا بڑا انقلاب نمایاں ہو اور اقبال ایسا حساس فنکار اس سے متاثر ہی نہ ہو لیکن متاثر ہونا اور بات ہے اور اپنا نظریہ اور عقیدہ اس کی نذر کر دینا دوسری بات ہے، اقبال اس انقلاب سے صرف متاثر ہی ہوئے ہیں اور متاثر ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلام بھی ملوکیت اور سرمایہ داری کا دشمن ہے اور انقلاب روس نے بھی ملوکیت اور سرمایہ داری کو اپنا نشانہ بنایا ورنہ جہاں تک مارکس کے نظریہ اشتراکیت کا تعلق ہے اقبال کے لئے اس نظریہ کو قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ایک اشتراکی کے لئے خدا، روح اور مذہب تینوں سے انکار لازمی ہے۔"

دلچسپ بات یہ ہے کہ علی سردار جعفری نے جب اپنے خیال کی تائید میں "شمع و شاعر" کے آخری بند کو صفحہ ۸۳ پر نقل کیا تو یہیں تک آکر کہ ع

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

ختم کر دیا اور نتیجہ نکال لیا اور "واقعی چند سال میں دنیا کیا سے کیا ہو گئی"۔ اور اسے مغربی سامراج کی شکست اور ایشیا کی بیداری قرار دے دیا اور یہ شعر حذف کر گئے جو پورے بند کا حاصل ہے اور جو اس بادۂ ناب کو دوسرے جام میں منتقل کرنے میں مانع ہے ع

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

تیسری دلیل:

اس سلسلے کی تیسری بات اور قابلِ غور ہے کہ اقبال نے مغربی مفکرین اور دیگر فلسفیوں کے بارے میں کیا خیالات ظاہر کئے ہیں۔ ان کا ایک سرسری جائزہ دل چسپ ہوگا

ع

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ روح اس کی مدنیت کی نہ رہ سکی عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید — ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف
دانش مغربیاں فلسفۂ مشرقیاں — ہمہ بت خانہ و در طوف بتاں چیزے نیست
مئے از میخانۂ مغرب چشیدم — بجان من کہ درد سر خریدم
نشستم با نکو یان فرنگی — ازاں بے سوز تر روزے ندیدم

(ترجمہ: دانش مغربیاں اور فلسفۂ مشرقیاں سب بت خانہ ہے اور بت خانے کا طواف بے سود ہے۔ میں نے مغرب کے مے خانہ کی شراب بھی چکھی اس سے میں نے گویا درد سر خریدا اور فرنگی حکماء کے ساتھ میں بیٹھا لیکن اس سے خراب دن میں نے کوئی نہیں دیکھا)

اقبال جہاں خوبصورت چیز دیکھتا ہے اس کا مدح خواں ہو جاتا ہے لیکن اس میں جذب نہیں ہوتا۔ چنانچہ فلسفہ مغرب کے بارے میں نہایت وضاحت سے کہتا ہے

در ہوایش گرمی یک آہِ بیتابانہ نیست
رند ایں مے خانہ را یک لغزشِ مستانہ نیست

(ترجمہ: وہ دن یاد کرتا ہوں جب میں خمستان فرنگ میں تھا۔ اس کا جام سکندر کے آئینے سے زیادہ روشن ہے، اس کے مے فروش کی چشم مست بادہ کے لئے پروردگار ہے اور بادہ خواروں کے لئے نگاہِ ساقی پیغمبر ہے لیکن اس کا جلوہ بے کلیم اور اس کا شعلہ بے خلیل ہے اس کی عقل ناپروا متاعِ عشق کو غارت کرنے والی ہے اس کی ہوا میں آہ بے تابانہ کی کوئی گرمی نہیں ہے اور اس کے مے خانہ کے رند کے پاس ایک بھی لغزش مستانہ نہیں ہے)

نیٹشا کے بارے میں اقبال کہتا ہے ع

آنکہ بر طرح حرم بت خانہ ساخت — قلب او مومن دماغش کافر است

(ترجمہ: اس نے حرم کی طرز پر بت خانہ تیار کیا اس کا قلب مومن اور دماغ کافر ہے۔)

نیٹشا نے امریکی فکر پر اسلامی نقطۂ نظر سے حملہ کیا ہے لیکن خود اسلام سے دور رہا۔ نبی کریم نے یہ جملہ ''آمن لسانہٗ و کفر قبلۂ'' (اس کی زبان ایمان لائی لیکن اس کا دل کافر ہے) عرب شاعر بنوامیہ ابن الصلت کے متعلق فرمایا تھا جس کی شاعری اسلامی تھی لیکن اسلام نہیں لایا۔ اسی طرح مزید فرمایا ع

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں — تو اقبال اس کو سمجھا تا مقامِ کبریا کیا ہے

اقبال خود کہتا ہے ع

شرابِ میکدۂ من نہ یادگارِ جم است
فشردۂ جگر من بشیشۂ عجم است

(ترجمہ: میرے مے کدے کی شراب جمشید کی یادگار نہیں ہے یہ میرے جگر سے نچوڑی ہوئی ہے صرف پیالہ عجم کا ہے۔)

مرا اگر چہ بہ بت خانہ پرورش دادند
چکید از لب من آنچہ در دل حرم است

(ترجمہ: اگر چہ میری پرورش بت خانہ میں ہوئی ہے لیکن میرے لب سے جو ٹپکا ہے وہ وہی ہے جو حرم کے دل کے اندر ہے۔)

اقبال نے جاوید نامہ میں ''اشتراکیت اور ملوکیت'' کے عنوان سے دونوں کی مذمت کی ہے ع

رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک — جز بہ تن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبر ناحق شناس — بر مساوات شکم دارد اساس
تا اخوت را مقام اندر دل است — بیخ او در دل نہ در آب و گل است

ترجمہ: روح تن سے رنگ و بو اختیار نہیں کرتی اور اشتراکیت سوائے تن کے اور کسی چیز سے تعلق نہیں رکھتی اس پیغمبر ناحق شناس (یعنی کارل مارکس) کے مذہب کی اساس مساوات پر ہے۔ چونکہ اخوت کا مقام دل ہے، اس کی جڑ دل کے اندر ہوتی ہے، اخوت آب و گل میں پرورش نہیں پا سکتی)

آخری شعر میں اسلامی اخوت اور مارکسی مساواتِ انسانی کا مقابلہ کیا ہے۔ ملوکیت اور اشتراکیت دونوں کو اقبال نے مقصدی نظریہ کے ماتحت قابلِ رد قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں ع

غرق دیدم ہر دو را در آب و گل ہر دو را تن روشن و تاریک دل

(ترجمہ: دونوں (ملوکیت اور اشتراکیت) کو آب و گل (مادیت) میں غرق پایا دونوں کے تن روشن اور دونوں کے دل تاریک ہیں)

الغرض مشرق اور مغرب، فکر و فلسفہ کے بارے میں اقبال کا آخری فیصلہ یہ ہے کہ مشرق و مغرب سب باطل ہیں۔ صرف اسلام نے حیات و کائنات کے بارے میں جو فکر انسان کو دی ہے اور جس کو وہ بزم شبانہ کے نام سے پکارتا ہے، وہی نگہ محرمانہ یعنی حقیقت الحقائق ہے۔ ع

مشرق خراب و مغرب ازاں بیشتر خراب عالم تمام مردہ و بے ذوقِ جستجو است

ساقی بیار بادہ و بزم شبانہ ساز مارا خراب یک نگہ محرمانہ ساز

(ترجمہ: مشرق برباد اور مغرب اس سے زیادہ برباد ہے یعنی تمام عالم مردہ اور بے ذوق جستجو ہے، اے ساقی شراب لا اور بزم شبانہ کو پھر آراستہ کر، تاکہ ہم لوگوں کو ایک نگہ محرمانہ سے مست کر دے۔)

اسی لئے اقبال اس پر مرثیہ خواں ہے کہ مسلمان نے اپنا صحیح موقف غلط قسم کی پیری اور ملائیت کے اثر سے بدل دیا اور ع

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری اے کشتۂ ملائی و سلطانی و پیری

اقبال اور تصوف:

مذہب کا بڑا تعلق تصوف سے ہے۔ تصوف صرف تزکیہ نفس نہیں حیات و کائنات کا فلسفہ بھی ہے۔ ہندو مذہب میں بھگتی کی تحریک وحدتِ ادیان کے طور پر شروع ہوئی۔ اس سے پہلے لوگ ہر ہم چرج نپتا وغیرہ ایک خاص نظریہ اصنام پرستی کے تابع تھے۔ وحدتِ ادیان نے ہندوؤں میں بڑے بڑے صوفی اور فقیر پیدا کئے اور ڈاکٹر تارا چند کی نگاہ میں کبیر داس اور گورو گوبند اسی نظریۂ وحدتِ ادیان سے نمودار ہوئے۔ جب سے انسان نے سوچنا اور فکر کرنا شروع کیا وہ یہ سوال کرتا رہا ہے کہ یہ کائنات کیا ہے۔ حیات کے کیا معنی ہیں اور وہ خود کیا ہے؟ اس سلسلے میں مختلف طرزِ فکر چمکے اور آج بڑے بڑے گروہوں کے الگ الگ نظریات ہیں۔ جس متصوفانہ نظریے نے سب سے زیادہ متلاشیانِ معرفت الٰہی اور شعرا کو متاثر کیا وہ نظریہ وحدت الوجود ہے یعنی صرف خدا کا وجود ہے اور کسی کا وجود نہیں، بقیہ سب وہم و گمان ہے، ملاحظہ ہو خواجہ اجمیری کے پیر کا ارشاد ع

منم عثمان ہارونی کہ یار شیخ منصورم ملامت می کند خلقے و من بر دار می رقصم

اس نظریہ کو ماننے کے بعد انسان کو اپنے اور عالم دونوں کے وجود سے انکار کرنا ہوتا ہے اور ان سب کو وہم و گمان ماننا پڑتا ہے۔ یہی ویدانت فلسفہ بھی ہے جس کی سوامی شنکراچاریہ نے تعلیم دی اور جسے علامہ ابن عربی نے اسلام میں داخل کیا اور پھر یہ صوفیا اور شعرا کا حرز جاں بن گیا۔ لیکن اقبال اس کے قائل نہیں۔ اس نے حافظ کو تسلیم نہیں کیا۔ اور اپنی پہلی تصنیف ''اسرارِ خودی'' میں حافظ کی سخت مذمت کی جس سے خانقاہوں اور ایوانِ صوفیہ میں تہلکہ مچ گیا۔ ہر چہار جانب سے اقبال پر حملے ہونے لگے۔ ان کے عقائد اسلامی پر بھی شک کیا گیا۔ انجام یہ ہوا کہ اقبال نے 'اسرارِ خودی' کے دوسرے ایڈیشن سے حافظ پر لکھے ہوئے اشعار نکال دیے اور دیباچہ میں یہ معذرت کی کہ انہوں نے حافظ کی ذات سے اختلاف نہیں کیا تھا بلکہ حافظ پر جرح ادبی نصب العین کے نقطۂ نظر سے تھی۔ حافظ کے بارے میں اقبال کے چند اشعار جو مجھے یاد رہ گئے ہیں ذیل میں درج کرتا ہوں ع

ہوشیار از حافظ صہبا گسار جامش از زہر اجل سرمایہ دار
گوسفند ملت و نوا آموختہ است عشوہ و ناز و ادا آموختہ است
آن فقیہ ملت مے خوار گاں آں امام امت بے چارگاں
آنچناں مست شراب بندگی است خواجہ محروم ذوق خواجگی است
نعرہ زن با عرفی ہنگامہ خیز زندۂ از صحبتِ حافظ گریز

اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ نمبرا کہ تصوف کے نظریات کا کتنا گہرا اثر قائم ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ اقبال کو اپنے کلام سے حافظ پر جرح کے اشعار حذف کرنے پڑے۔ دوسرے اقبال کس درجہ باریک بینی سے اصلاح کرنا چاہتا تھا اور برہنہ گفتن پر گل پیرا ہونے کا خواہش مند تھا۔ ع

نہ از شیشہ نہ از مے خانہ گفتم حدیث عشق بے باکانہ گفتم

ضمناً یہ بھی ذکر کرنے کے قابل بات ہے کہ حافظ کا شعر ع

بیا تا گل بہ افشانیم دمے در ساغر اندازیم فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

اقبال نے خود نقل کیا ہے۔ اور حافظ کا شعر ع

من ندانیم کہ منزل گہ مقصود کجا است ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

وہی معنی رکھتا ہے جو اقبال کے شعر میں پنہاں ہے ع

تو اے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ　　جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی

دونوں کے اشعار اسلام کے اس نظریہ کی حمایت کرتے ہیں کہ روحِ انسانی لافانی ہے اور وہ ابدالآباد تک ترقی کرتی رہے گی۔ لیکن خدا کبھی نہ بن سکے گی۔ اقبال نے اس اصول حیات و ممات کو بڑے دل فریب انداز میں اور بڑے کیف و جذب سے مختلف جگہ بیان کیا ہے۔ وہ اپنے کو ایسا قطرہ نہیں سمجھتا جو دریا میں جذب ہو جائے بلکہ جو خود دریا بننے کے لئے کوشاں ہو، اس کی وجہ سے یہ رہبانیت، دنیا سے کنارہ کشی، خود فراموشی تقدیر پر تکیہ وغیرہ جیسی باتیں پیدا ہوئیں اور جب اقبال نے اپنا کلام پیش کرنا شروع کیا ہے تو دماغوں پر یہ تصوف چھایا ہوا تھا اور اسی لئے حافظ شیرازی کے کلام کی روحانی تعبیر کی جاتی ہے۔ ان کی مے اور ان کا مے خانہ سب شراب حقیقت اور درس معرفت تھا۔ بقول غالب ع

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

عقیدہ وحدۃ الوجود:

اقبال کے فلسفۂ خودی نے اس پر کاری ضرب لگائی۔ اقبال نے پکارا ع

ہم ز خودی خدا طلب　　ہم ز خدا خودی طلب

(ترجمہ: خدا سے خودی اور خودی سے خدا کی طلب کر)

یہ گویا حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے اس قول کا ترجمہ ہے "**من عرف نفسہ فقد عرف ربہ**" (جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے خدا کو پہچانا) اور اس نے صاف صاف فلسفۂ وحدۃ الوجود کو رد کیا۔ زبور عجم میں اقبال نے چند سوالات قائم کئے ہیں اور پھر ان کے جواب دیے ہیں۔ یہیں وضاحت کے ساتھ اس نے اپنا فلسفۂ حیات بیان کیا ہے چنانچہ سوال یہ ہے کہ انا الحق کیا چیز ہے، کس نکتہ کو انا الحق کہتے ہیں اور کیا رمزِ مطلق محض فضول گوئی ہے اور جواب میں پہلے وہ انا الحق کو بیان کرتا ہے

خدا خفت وجود ما ز خوابش　　وجودِ ما نمود ما ز خوابش
چوں او بیدار گردد دیگرے نیست　　متاعِ عشق را سودا گرے نیست
تواں گفتن جہان رنگ و بو نیست　　زمین و آسمان و کاخ و کو نیست
تواں گفتن کہ حق بے بافسونے است　　حجاب چہرہا آں بے چگونے است

(مطلب یہ ہے کہ خدا سو رہا ہے ہمارا وجود اور ہمارا نمود سب اسی کا خواب ہے،

ہے کہ اس جہانِ رنگ و بو کا وجود نہیں ہے، زمین و آسمان، کاخ و کو کا وجود نہیں ہے، کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب خواب ہے یا افسوں ہے اور اس بے مثل چہرے کا ایک حجاب ہے اور بس)

علی سردار جعفری ''اقبال شناسی'' کے صفحہ ۹۰ پر اس فلسفے کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

''ہندو تصور کے مطابق کائناتِ کے اول بنیاد پانی کی تاریک سطح پر پڑے ہوئے محوِ خواب وشنو (مہا پرش، ذات مطلق) کی ناف سے ایک ننھا کنول باہر نکلتا ہے جس میں خالص سونے کی ہزار پنکھڑیاں سورج کی آب و تاب سے جگمگاتی ہیں اور یہ خالقِ آفاق وشنو، کنول کے ساتھ ساتھ برہما کو بھی باہر نکالتا ہے جو کنول کے بیچوں بیچ میں بیٹھا اپنی تخلیقی قوتوں کے نور سے جگمگا رہا ہے۔ اس طرح وشنو کے ایک خواب سے دنیا بیدار ہوتی ہے اور اپنی بیداری کے چکر کو ختم کرنے کے بعد وہ خود بھی ختم ہو جاتی ہے اور دوسری دنیا بیدار ہوتی ہے۔ ایک برہما کے بعد دوسرا برہما آتا ہے۔ ایک آدم کے بعد دوسرا آدم پیدا ہوتا ہے۔ یہی وشنو کا خواب ہے، یہی مایا ہے، یہی وقت ہے اور تمام انسان اس کے دائرے میں اسیر ہیں۔''

اقبال نے ان سب تصورات کو غلط قرار دیا ہے وہ کہتا ہے کہ اپنا وجود کیسے فراموش کر دیا جائے وہ تو ایک حقیقت ہے ع

اگر گوئی کہ من وہم و گماں است　　نمودش چوں نمودِ ایں و آنست
بگو ہا من کہ دارائے گماں کیست　　یکے در خود نگر آں بے نشاں کیست

(اگر کہو کہ ''من'' (انا اپنا وجود) وہم و گمان ہے تو یہ بتلاؤ کہ یہ وہم و گمان کرنے والا کون ہے۔ ذرا اپنے اندر دیکھو کہ وہ بے نشان کون ہے)

پھر ذرا جھلا کر کہتا ہے ع

جہاں پیدا محتاجِ دلیلے؟　　نمی آید بفکر جبرئیلے

(دنیا سامنے دکھلائی دیتی ہے اور اس کے لئے دلیل کی ضرورت ہے؟ یہ بات تو جبرئیل کی فکر میں بھی نہیں آنے والی ہے)

اور آخر میں فیصلہ صادر کرتا ہے ع

دگر از شنکر و منصور کم گوئے　　خدارا ہم براہ خویشتن جوئے

ترجمہ: اب کبھی سوامی شنکر اچاریہ اور منصور حلاج کا ذکر مت کرنا، خدا کو بھی اپنی خودی کے راستے سے تلاش کرو۔

یہ بھی دوسرے مسائل کی طرح اقبال کی تحقیق نہیں بلکہ مقربانِ بارگاہِ ربانی کے اقوال کی تصدیق ہے اور اس کی تشریح علامہ سید احمد سرہندی نے بھی، جنہیں امام ربانی مجدد الف ثانی کے لقب سے ایک طبقہ یاد کرتا ہے اور جن کا ذکر سر سید اور مولانا آزاد احترام سے کرتے ہیں، کی ہے۔ انہوں نے اپنا حال بیان کیا ہے اور فرمایا ہے "وحدت الوجود" صحیح نہیں ہے "وحدت الشہود" صحیح ہے۔ یعنی سالک پر ابتدا میں ایک ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس سے سب خدا ہی نظر آتا ہے۔ لیکن جب مبتدی آگے قدم بڑھاتا ہے تب اس پر حقیقت نمودار ہوتی ہے۔ چنانچہ اپنی حالت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرے اوپر بھی یہی کیفیت ابتدا میں طاری ہوئی تھی اور میں گڑگڑا کر خدا سے یہ دعا مانگتا تھا کہ یہ کیفیت باقی رہے لیکن جب میرے مدارج بلند ہوئے تو مجھے نظر آیا کہ خدا خدا ہے اور دنیا دنیا۔

اس طرح یہ مسئلہ بھی اسلام ہی کا ہے۔ کہیں سے مستعار نہیں لیا گیا۔ چنانچہ اقبال نے اسلامی عقیدے کو ہی اپنایا ہے کہ خدا، مادہ اور روح تینوں کا وجود ہے اور خدا روح اور مادہ کا خالق ہے۔

اقبال صرف ایک مفکر ہی نہیں مصلح بھی ہے۔ اس لئے وحدت الوجود سے پیدا ہونے والی تمام خرابیوں اور خانقاہیت کی تمام کمزوریوں پر بڑی کڑی نکتہ چینی کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو ع

صوفی ما چارہ از غیرم نداشت　　طاقتِ غوغائے ایں عالم نداشت

(ہمارے صوفی کو بھاگ جانے کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا، وہ اس دنیا کے شور و شر کی برداشت کی طاقت ہی کہاں رکھتا تھا)

یا وسعت وافلاک میں تکبیر مسلسل　　یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

یہ مسلک مردانِ خود آگاہ و خدامست　　وہ مسلک ملا و جمادات و نباتات

زمن گو صوفیانِ با صفا را　　خدا جویانِ معنی آشنا را

غلام ہمت آں خود پرستم　　کہ از ذوق خودی بیند خدا را

(ترجمہ: میری جانب سے خدا جویاں یعنی آشنا صوفیان باوصف سے کہو کہ میں اس خود پرست کی ہمت کا غلام ہوں جو خودی کی راہ سے خدا کو پہچانتا ہے)

اور زیادہ مثالیں دینا بیکار ہے پورا کلام اس سے بھرا ہے حتیٰ کہ شیطان نے اپنا مسلک ابلیسی پھیلانے کے لئے جو کام اپنے مشیروں کو دیا ہے وہ یہ ہے کہ ع

مست رکھو ذکر و فکر و صبح گاہی میں اسے　　پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

خانقاہوں اور سجادہ نشینوں کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ ع

میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد　　زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے　　خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

مگر یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہئے کہ وہ تصوف یا بزرگانِ دین سے کنارہ کشی رکھتا تھا۔ یہ سب باتیں محض اصلاحی ہیں۔ چنانچہ جو حضرت مجدد اور حضرت محبوب الٰہی کے مزار پر حاضری دے، جو شمس تبریز کا قصیدہ خواں ہو، جو مولانا روم سے بطور مرید اکتسابِ فیض کرنے پر فخر کرے، وہ کس طرح تصوف سے بیزار ہو سکتا ہے۔ اس کا کل فلسفہ حیات تزکیہ اور احتساب نفس پر مبنی ہے جس سے انسان میں اپنے وجود کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اسی سے وہ خدا تک پہنچتا اور اسی کو "خودی" کے لفظ سے یاد کرتا ہے ع

شکستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک
کہ تو نغمۂ رومی سے بے نیاز اب تک

اقبال کا فقر کار جز خواں ہے مگر وہ فقر جو راہبی سے ہم کنار نہ ہو بلکہ جس میں انقلاب روزگار کی مستیاں ہوں ع

سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار　　فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

اس کی پکار ہے کہ ع

باخرقہ وسجادہ و شمشیر و سناں خیز

وہ قرون اولیٰ کی طرف لوٹنے کی تعلیم دیتا ہے۔ جب تمام شب عبادت اور تمام دن جہاد میں گزرتا تھا۔ آگے چل کر امتداد زمانہ کے ساتھ اس میں عجمیت داخل ہو گئی اور پورا فلسفۂ حیات بدل گیا جس کا نتیجہ دنیا کے شور و ہنگامے سے اجتناب اور کنج خلوت میں اللہ کی یاد تک مردِ مومن کی تگ و دو باقی رہ گئی ع

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اور دعا کرتا ہے کہ ع

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے　　دلِ مرتضٰی سوزِ صدیق دے

مرید ہندی (اقبال) پیر رومی سے سوال کرتا ہے ع

کاروبارِ خسروی یا راہبی　　کیا ہے آخر غایتِ دینِ نبی

یعنی کاروبار خسروی یا راہبی ان دونوں میں سے دین نبیؐ کی آخر غایت کیا ہے۔

پھر رومی جواب دیتے ہیں ع

مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ
مصلحت در دین عیسٰی غار و کوہ

یعنی دین نبوی کی پالیسی جنگ و شکوہ ہے اور دین عیسٰی کی پالیسی غار و کوہ یعنی راہبی ہے۔

ایک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری　　ایک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری　　ایک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری　　میراثِ مسلمانی سرمایۂ شبیری

اقبال جس وقت نمودار ہوئے عالمِ اسلام سخت کرب و اضطراب سے گزر رہا تھا۔ مسلم حکومتیں زوال پزیر تھیں۔ سب سے بڑی مسلم سلطنت ترکی دم توڑ رہی تھی۔ اس کا بال بال رہن ہو چکا تھا اور اس کے لقمۂ اجل ہو جانے میں بس وقت کا انتظار تھا۔ افغانستان، ایران، مصر، شمالی افریقہ سب مغرب کے غلام ہو چکے تھے اور زیر اثر آ گئے تھے۔ ہندوستان میں جو برائے نام مغلیہ سلطنت تھی اس کی بساط الٹ چکی تھی اور انگریز کا راج مسلط ہو گیا تھا۔ اندرون و بیرون ہند کچھ عظیم ہستیاں انقلاب لانا چاہتی تھیں جن میں ملا جمال الدین افغانی اور علمائے دیوبند مولانا قاسم، مولانا محمود الحسن اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ لوگ پوری دنیائے اسلام میں دو طرح کا انقلاب لانا چاہتے تھے۔ نمبر ۱ یہ کہ اسلامی حکومتیں، جہاں مسلم آبادی کی غالب اکثریت ہے، صحیح معنوں میں اسلامی حکومتیں بن جائیں اور طواف شمع سے آزاد ہو کر اپنی فطرت کی تجلی گاہ میں آباد ہوں اور نمبر ۲ یہ کہ جہاں مسلم آبادی کی غالب اکثریت نہیں ہے وہاں غیر مسلموں سے مل کر آزاد جمہوری حکومتیں فلاح و عوام کی بنیاد پر قائم کریں۔ ہندوستان میں مولانا ابوالکلام آزاد حریت اور ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ لگا رہے تھے لیکن ان سب باتوں کے باوجود پوری مسلم قوم میں مایوسی اور بے دلی اور پست ہمتی پھیلی ہوئی تھی اور

اس سے قدرتاً وہ تصوف وجود میں آیا جو انسان کے وجود ہی سے انکار کرتا ہے اور قطرہ بن کر دریا میں غائب ہو جاتا ہے۔ اس تنگ دلی نے شاعری، مصوری، موسیقی سب کا احاطہ کر لیا۔ اقبال حالی کی طرح ان تمام خرابیوں کو تلاش کر کر کے نکالتا ہے اور شاعرانہ فنکاری کے تمام حربے استعمال کر کے راہِ حق دکھانا اور دلوں میں ولولۂ تازہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہ وہی صور ہے جو مولانا آزاد خفتگانِ خواب غفلت کو بیدار کے لئے تلاش کر رہے تھے۔ حالی اور اقبال دونوں قوم کی برائیوں کے مرثیہ خواں ہیں لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے۔ حالی سرسید کے علی گڑھ مکتبۂ فکر سے وابستہ تھے۔ ان کی مرثیہ خوانی کے بعد ان کی تعلیم یہ تھی کہ ع

حکومت نے آزادیاں سب کو دی ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں

یعنی ''زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ساز'' اور اقبال للکار کر پکار دیتا ہے ع

گفتند جہاں ما آیا بہ قومی سازد گفتم کہ نمی سازو گفتند کہ برہم زن

(ترجمہ: مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا زمانہ تمہارا ساتھ دے رہا ہے میں نے کہا کہ نہیں، ساتھ نہیں دے رہا ہے تو کہا کہ الٹ دو)

وقت کی کلائی کو موڑ دینا اور آتش بے گانہ سے دریوزہ گری ترک کرنا اصل مقصد پیغام اقبال کا ہے۔ اسی سے سرمست ہو کر کبھی وہ ابلیس کو داد دیتا ہے کہ وہ مقابلہ پر اتر آیا اور ابلیس کی زبان سے جبرئیل کو اس طرح مخاطب کرتا ہے ع

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو ،اللہ ہو

کبھی جنت سے پناہ مانگتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ کور ذوقوں کی دنیا ہے کیونکہ یہاں تصادم اور مقابلہ نہیں ہے یعنی اللہ تو ہے شیطان نہیں ہے ع

مزی اندر جہانِ کور ذوقے کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

انسان کو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں لا کر کھڑا کرتا ہے اور اس کی تخلیقی قوتوں اور صلاحیتوں کو نمایاں کرتا ہے۔ کہتا ہے تو نے رات بنائی چراغ میں نے تیار کیا، تو نے مٹی بنائی تھی میں نے جام بنایا، تو نے بیاباں، پہاڑ اور اوسر زمیں بنائی تھی میں نے سبزہ زار، باغیچے اور باغ تیار کئے ہیں ، میں وہ ہوں کہ پتھر سے آئینہ اور زہر سے نوشینہ بناتا ہوں۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیاباں و کہسارو زاغ آفریدی گلستان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اس طرح کے تمام کلام کے نچوڑ پر نظر رکھنی چاہئے۔ بعض علماء الحفظ کی طرح لغوی معنی پر جانا مناسب نہیں ہے۔ اقبال مفکر ہونے کے ساتھ ایک عظیم سے عظیم شاعر بھی ہے۔

سر سید کی پوری اسکیم اس خیال پر مبنی تھی کہ مسلمان کے زوال کی وجہ اس کی مفلسی ہے اور اسے دور کرنے کے لئے انہوں نے قسمت آزمائی کی۔ اس وقت کے دو اسلامی مفکرین اور شعرا اکبر اور اقبال دونوں نے اس کو غلط ٹھہرایا۔ اکبر نے کہا ع

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
سید نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

اقبال کہتے ہیں ع

زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں
سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے

بلکہ اقبال بے زری پر ناز کرتا ہے۔ وہ نان جویں اور زور حیدری کی آمیزش کا قائل ہے۔ جاوید کو نصیحت کی ہے ع

خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے

الغرض جس طرح کہ اسلام انسان کے ہر شعبۂ حیات پر حاوی ہے اور اس کے لئے ایک واضح تعلیم رکھتا ہے، اقبال نے بھی انسان کے ہر شعبۂ حیات پر نظر ڈالی ہے، اسے پرکھا اور جانچا ہے اور اسی تعلیم کو خوبصورت شاعری میں پیش کیا ہے اور یہی شاعر اقبال کا مذہب ہے۔ اقبال کے اسی قطعہ کو دہرا کر یہ مقالہ ختم کیا جاتا ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے ع

چوں رومی در حرم دادم اذاں من
از او آموختم اسرار جاں من
بہ دورِ فتنۂ عصر کہن او
بدورِ فتنۂ عہد رواں من

☆

اقبالؔ کا پیغام طلباء عصر کے نام

اقبالؔ کا پیغام طلباء عصر کے نام ایک ایسا موضوع ہے جو بیحد جذب و کشش رکھتا ہے۔ کیونکہ خود علامہ اقبال کی زندگی از ابتدا تا انتہا طلب علم و جستجوئے حقائق میں بسر ہوئی حتیٰ کہ بستر مرگ پر بھی تحقیق و تفحص میں مشغول تھے اس لئے ضروری ہے کہ اقبال کا صحیح ادراک پیدا کرنے کے لئے علامہ اقبال کی زندگی کے اس پہلو پر ایک نظر ڈالی جائے کیونکہ یہ تمام کلام کی اولین تمہید ہے۔

علامہ موصوف نے دنیا کے تمام کتب خانوں کو چھان مارا، تمام صوفیائے قدیم و جدید کے نظریات کی جانچ کی تمام علماء و مفکرین متقدمین و متاخرین کو صداقت کی کسوٹی پر پرکھا۔ تمام فلسفہ شرق و غرب سے طلب صادق کی صدا لگائی اور خالی الذہن ہو کر ہستی، انسان، محسوسات اور ما وارالمحسوسات کا مطالعہ کیا۔ یہ تمام وقت نظر انفرادیات و اجتماعیات دونوں میں تھی۔ وہ کبھی خمستان مغرب میں ''یک دست جامِ بادہ'' و یک دست زلف یار نظر آتے ہیں تو کبھی شاعر ہندی ''برتری ہری'' کی صحبت میں سوال و جواب کرتے ہیں۔ کبھی گیٹے، نیٹشا اور برگستان کے نتائج تحقیق کے مطالعہ میں غرق ہیں تو کبھی عارف ہندی کے نہ نکات سے استدراک کرتے ہیں۔ ڈیوزا ہیگل برکلے، کلیم، غنی، غالب، سوامی رام تیرتھ، لینن، کارل مارکس، مسیولینی، شیکسپیر، عرفی، نظیری الغرض شاعر ہو یا مفکر، یا مدبر کوئی علامہ موصوف کے امتحان گاہ سے بچکر نہیں جاتا۔ یہی ساری زندگی کا شغل ہے۔ اور یہی سارے کلام کی بحث، اصول یہ ہے کہ ع

گفت حکمت را خدا خیرے کثیر ہر کجا ایں چیز را یابی بگیر

گویا **الطلب العلم ولو کان بالسین** اور **اطلب العلم من المھد الی اللحد** کی مکمل اور جامع تفسیر ہے۔

مناظر قدرت سے بدرجہ اتم استفادہ کرتے ہیں۔ شبنم، لالہ، صبح و شام، گلِ رنگین، غنچہ نورسیدہ، شفق، پہاڑ، دریا، مرغزار، حسن و عشق، جلال و جمال سب سے مطالبہ علم و ادراک کر کے اپنے تخیلات کا دامن پر کیا ہے۔ اور یہ سب ایک غرض واحد، صرف ایک مقصد کے لئے ہے کہ ہستی اور کائنات کا صحیح حل تلاش کیا جائے اور وہ پردہ جو حیات انسانی پر پڑا ہوا

ہے اسے چاک کر کے حقیقت آشکارا کر دی جائے۔ جیسا کہ حضرت علیؓ نے فرمایا ولو کشف الغطاءُ لما ازرت یقینا ۔یعنی اگر ظاہر و باطن کا پردہ چاک کر کے مجھے حقیقت کبریٰ کا صاف صاف مشاہدہ کرا دیا جائے تو میرے یقین میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوگا۔

اسی یقین کامل کو خود پیدا کرنا چاہتے ہیں اور دوسروں کے اندر بھی دیکھنے کے متمنی ہیں۔ مگر حیات انسانی کے مختلف شعبوں اور صیغوں میں حقیقت کی تلاش کرنا اور ہر جزوی لہر کے متعلق ایک مضبوط دلیل قائم کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ زندگی کا ایک بڑا حصہ درک و مطالعہ اور شک و شبہ میں صرف ہو گیا۔ پہلے وطنیت کے مروجہ تخیل سے آغاز کار کیا۔ اس وقت اپنی تحقیقات مکمل نہیں ہوئی تھی اور آخر کار وطنیت کو سر پاء استحقار اس طرح ٹھکرا دیا کہ پورا کلام اس کی مذمت سے بھرا ہے۔ واضح ہو کہ وطنیت بھی ایک مکمل نظام تعلیم و عمل ہے۔ جس کی بنیاد ایک ملک اور اس کے باشندوں کی خاطر بہترین سے بہترین ذاتی قربانی کرنا، اور اپنی قوم کے سرمایۂ اخلاق کو تمام دنیا کی دیگر قوموں پر فوقیت دے کر اس کو عالم میں مظفر اور منصور بنایا ہے۔ یہی وہ تخیل ہے جس کی بنیاد پر انگلستان ہندوستان میں اپنا وجود مبنی بر انصاف نہیں بلکہ منجملہ فرائض انسانی کے تصور کرتا ہے اور تمام مغرب اس بات کا مستحق اپنے کو سمجھتا ہے کہ مشرق کو اخلاق اجتماعی (جس میں قیام جمہوریہ بھی شامل ہے) اور حفاظت امن کے لئے مشرق ہی کی محافظت کی خاطر اس پر نگراں رہے۔ اسی تخیل کی ایک کڑی "انجمن بین الاقوام" کا قیام ہے جو دنیا میں اس تخیل کی حمایت و حفاظت کے لئے عالمِ وجود میں آئی۔

اس لئے ظاہر ہے کہ قومیت یا وطنیت بھی اپنے اندر اخلاق انسانی کی اصلاح کا ایک فریب دہ سہی مگر نظرِ فریب نظر یہ رکھتی ہے اور اس کے اندر گھس کر بھی غواصانِ معانی بہت سے موتی نکال سکتے ہیں۔ اس لئے علامہ اقبال نے بھی اپنے کلام کا آغاز اسی فلسفہ سے کیا لیکن بعدہٗ ان پر جب حقیقت کا انکشاف ہوا اور حیات و کائنات پر جامع اور بالغ نظر ڈالنے کے بعد جب انہوں نے انسانیت کا ایک کامل اور مکمل نظام بنانے کا ارادہ کیا تو وطنیت کو نہ صرف ناکافی بلکہ زہر پایا چنانچہ نہایت زوردار الفاظ میں فرمایا ع

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

مگر یہاں پر اس امر کا اظہار کر دینا اشد ضروری ہے کہ علامہ اقبال کا فلسفہ مخا کس تخیل پر مبنی ہے جہاں تک میرا ناچیز مطالعہ کلام اقبال کا ہے یہ مخالفت حب الوطنی کی مخالفت نہیں بلکہ وطنیت کے اس جارحانہ فلسفہ کی مخالفت ہے جو اس وقت بنی نوع انسان کے اخلاق اجتماعی کا مرکزی فلسفہ قرار دیا گیا ہے اور جس نے مذہب، اصول، ادب، انشا سب کو محیط کر ہے۔ ورنہ اس انسانیت کے فلسفہ کے نقطہ نگاہ سے قطع نظر اگر ہندوستان اور اس سے محبت کا تذکرہ کیا جائے تو اقبال نے جس ترانہ کی ابتدا کی تھی اسے آخر عمر تک قائم رکھا۔ چنانچہ حال کے کلام کا صرف ایک شعر اس نظریہ کی حمایت کرنے کے لئے کافی ہے۔ ع

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضا مند

ہندوستان کی غلامی اس کا کامل استیصال اور اپنے وطن سے محبت اقبال کا ایک مستقل موضوع ہے جن سے ان کا کلام بھرا پڑا ہے۔ مگر چونکہ اس وقت میں صرف ان کے عظیم فلسفہ اخلاق سے بحث کررہا ہوں اور اسی بنیادی اصول کو پیش کرنا چاہتا ہوں جو اقبال انسانیت کی صحیح تعمیر کے لئے لازمی سمجھتے ہیں اس موضوع کو سرِ دست نظر انداز کرتا ہوں۔ یہ میرے مقصد سے غیر متعلق ہے البتہ اس قدر واضح رہے کہ جہاں میں وطنیت کا لفظ استعمال کرتا ہوں اس سے مراد جارحانہ وطنیت اور وہ فلسفہ اخلاق ہے جس پر مغرب یا فرنگ کی تعمیر ہے۔ یہ صرف اس نیت سے ہے کہ انسانوں کی بستیاں جو مختلف ممالک میں جغرافیائی حدود سے تقسیم ہو کر الگ الگ ہوگئی ہیں اور صرف ان حدود سے الگ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے رقابت اور دشمنی رکھتی ہیں۔ جس کی وجہ سے کمزور قومیں مضبوط قوموں کی غلام ہو جاتی ہیں۔ اپنا اجتماعی فلسفہ اس تقسیم ملکی یا بستی سے کوئی بلند تر بنائیں۔ اور وطنیت کا سیاسی تصور قائم کرنے کے بجائے جو محض تودہ ہائے خاک کے اجتماع کا نام ہے کوئی دوسری مضبوط دلیل حیات انسانی کے حل کی تلاش کریں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مختلف ٹولیاں اور جماعتیں کسی معمولی غرض مشترک کے لئے متحد و منظم نہ ہوں اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام دنیا کہ صرف ایک حکومت رہے اور اسے مختلف ٹکڑوں میں بغرض حفظ امن و نظام قانون تقسیم نہ کیا جائے نہیں۔ بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ ایسا کرنے کے بعد اپنا سیاسی تصور، اپنا اجتماعی نصب العین اصول حقیقت اور انسانیت کی عام برادری پر مبنی کیا جائے نہ صرف ایک کرۂ ارضی کے باشندوں کی ہر جائز و ناجائز حمایت پر۔ اس طرح انجمن بین الاقوام چونکہ وطنیوں کے انہیں اجتماعات کا ایک نظام ہے جن کی بنیاد جارحانہ قومیت پر ہے اس وجہ

سے اس کے خلاف بھی اس طرح فرماتے ہیں۔ ع

برفتد تا روشِ رزم وریں بزم کہن، دردمندانِ جہاں طرزِ نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

دوسری جگہ فرمایا کہ ع

مکہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم

اس شعر نے علامہ موصوف کا نظریہ متعلق وطنیت بالکل واضح کر دیا۔ صاف طور پر ظاہر ہو گیا کہ وطنیت اور خاص کر موجودہ جارحانہ وطنیت کی مخالفت صرف اس وجہ سے ہے کہ اس سے انسانیت نظر انداز ہو جاتی ہے۔ اور اقوام مرکزِ سیاسی تخیل بن جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس میں انسانیت کا کوئی حل موجود نہیں اور اس لئے کہ اس کا نظام محض ایک بے بنیاد حقیقت یعنی جغرافیائی حدود کے ماتحت انسانوں کے اجتماع کو قائم کرنا ہے۔ اور اسی کو مرکز پرکارِ تخیل بنانا ہے۔ بدیں وجہ حضرت علامہ نے وطنیت، قوم، اقوام اور جمعیۃ الاقوام سب کو ناجائز و باطل قرار دیا اور جس زبردست قومی ترانہ کی بنیاد آغاز شباب میں آپ نے ڈالی تھی دنیائے تحقیقات کی سیر کے بعد اس کی بساط الٹ دی۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ علامہ موصوف انسانیت عالم، کائنات کا مطالعہ جامع اور کامل طور پر کرنا چاہتے ہیں۔ حیات و کائنات کے جملہ رموز کو فاش کر دینے کے طالب ہیں۔ ان کی پرواز اتنی بلند ہے کہ وہ حقیقۃ الحقائق تک بلا واسطہ پہنچنا چاہتے ہیں اور سرچشمۂ عرفاں سے براہ راست سیراب ہونے کے خواستگار ہیں۔ وہ بادہ فروشی کے حلقۂ بیانات پر اعتماد نہ کریں گے کہ ان کے جام کی مے گلرنگ خوشۂ انگور کی ہے۔ بلکہ وہ خوشۂ انگور کو خود درخت سے توڑ کر لائیں گے اور اس سے شراب خانہ ساز تیار کریں گے۔ تب انہیں اطمینان ہوگا ع

از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

وہ بارگاہِ حقائق سے براہ راست استفادہ کرنے کے متمنی ہیں۔ ناموس اکبر کے اعتماد پر بھی اعتماد نہیں کرتے

بجبریل امیں، ہم داستانم
رقیب و قاصد و درباں ندانم

اور اس طرح اطمینانِ واعتقاد کرنے کے بعد وہ رازِ سربستہ عالم کا ایک حل پیش کرتے ہیں اور وہی کام کلام اقبال کا نچوڑ یا اس کا پیام ہے۔

حقائق کائنات:

چنانچہ اس تمام دقت نظر تجسّس و تلاش کا ماحصل یہ ہے کہ علامہ اقبال نے ''پیر روم'' کے سامنے زانوے شاگردی تہ کر دیا اور تمام علم و عرفاں جو مشرق مغرب کے کتب خانوں کا سرمایہ تھا وہ سب حضرت مولانا رومؒ کی تعلیم کے مقابلے میں ایک ہنگامہ باطل بن کر رہ گیا ع

مکدر کرد مغرب چشمہ ہائے علم و عرفاں را　　جہاں را تیرہ تر ساز و چہ مشائی چہ اشرفی

پھر فرماتے ہیں ع

دانش مغربیاں فلسفہ مشرقیاں　　ہمہ بتخانہ و در طوف بتاں چیزی نیست

کیونکہ ''پیر روم'' نے انسانیت اور زندگی اور کائنات اور اجتماعات کے متعلق بالکل دوسرے نظریوں کو کیا ہے جو حقائق پر مبنی ہیں۔

باز بر خوانم ز فیض پیر روم　　دفتر سر بستہ اسرار علوم
جان آواز شعلہ ہا سرمایہ دار　　من فروغ یک نفس مثل شرار
شمع سوزاں تاخت بر پروانہ ام　　بادہ شبخوں ریخت بر میخانہ ام
پیر رومی خاک را اکسیر کرد　　از غبارم جلوۂ ہا تعمیر کرد

چنانچہ آپ کے تمام فلسفہ کی بے نقابی اس طرح شروع کی ہے کہ آپ خزانہ حقائق کو اپنے سینہ میں چھپائے محوِ خواب ہیں کہ ع

روئے خود بخود پیر حق سرشت　　کہ بحرف پہلوی قرآن نوشت

اور آپ کو یہ پیام دیا:

خیز و جاں نو بدہ زندہ را　　از قم خود زندہ تر کند زندہ را
خیز و پا بر جادۂ دیگر بنہ　　جوش سودائے کہن از سر بنہ
آشنائے لذت گفتار شو　　اے درائے کارواں بیدار شو

پس اس وقت آپ نے حقیقت کے چہرہ سے نقاب کشائی کے لئے اشعار کو زینت بخشنا شروع کر دیا ہم لوگ جو مدرسوں اور کالجوں میں درسی کتابیں پڑھنے اور ظن و تخمین سے مسائل عالم کو بلا تلاش و جستجو حل کرنے کے عادی ہیں اور بعض اوقات ایسی رائے قائم کر لیتے ہیں جن کے لئے ہمارے پاس کوئی معقول وجوہ نہیں ہوتے۔ یہ ضرور جاننا اور معلوم کرنا چاہیں گے کہ مشرق اور مغرب کے تمام میخانوں کی خاک چھاننے کے بعد علامہ اقبال

نے ''دفتر سربستہ اسرار علوم'' کو کس طرح ہمارے سامنے بیان فرمایا ہے۔ علامہ اقبال کے تمام مطالعہ کا نتیجہ جو ان کے کلام سے ظاہر ہے یہ ہے کہ زندگی حیات و کائنات عالم تمام رموز کا حل دین فطرت اسلام میں موجود ہے اور دراصل انسانیت کا جو فلسفۂ انفرادی و اجتماعی محمد عربیؐ نے پیش کیا ہے وہی مبنی برحق وصداقت ہے۔ علامہ اقبال دیکھتے ہیں کہ کائنات کے ذرہ ذرہ پر اسلام کے حقایق درج ہیں اور زندگی کے رموز کو سرکار دو عالم ﷺ نے اس طرح عریاں کر دیا ہے کہ اب انسان کو کسی تلاش و تفتیش کی ضرورت باقی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یکطرفہ فلسفۂ مغرب و مشرق کو باطل قرار دینے اور اس کی انفرادی و اجتماعی تعلیمات کے نقائص بتلانے میں سرگرم ہیں تو دوسری جانب عقل و خرد کی مذمت کر کے تقلید و عشق کا پیام دیتے ہیں۔ رحمۃ العالمین ﷺ کی بارگاہ میں وہ اس طرح عرض پرواز ہیں ع

اے ظہور تو شباب زندگی — جلوہ ات تعبیر خواب زندگی
اے زمین از بارگاہت ارجمند — آسماں از بوسۂ بامت بلند
ششجہت روشن زتاب روئے تو — ترک و تاجیک و عرب ہندوئے تو
از تو بالا پایۂ ایں کائنات — فقر تو سرمایۂ ایں کائنات
در جہانی حیات افروختی — بندگاں را خواجگی آموختی

چنانچہ ظہر الفساد فی البر والبحر دیکھ کر روح محمد مصطفیٰ ﷺ سے اس طرح فریاد کرتے ہیں:

اے سوارِ شہب دوراں بیا — اے فروغ دیدۂ امکاں بیا
رونق ہنگامۂ ایجاد شو — درسواد دیدۂ ہا آباد شو
شورش اقوام را خاموش کن — نغمۂ خودرا بہشت گوش کن
خیز و قانون اخوت ساز دہ — جام صہبائے محبت باز دہ
بازور عالم بیارایام صلح — جنگجو یاں رابدہ پیغام صلح
نوع انساں مزرع وتو حاصلی — کاروان زندگی را منزلی

صاف اور کھلے الفاظ میں اقبال کے تمام کلام کا منشا صرف یہ ہے کہ انسان کے تمام انفرادی واجتماعی امور کی ہدایت کامل مذہب اسلام کے اندر ہے اور تمام مسائل حاضرہ کا صحیح اور واقعی حل جو اسلام نے پیش کیا ہے وہی دراصل فلسفہ اور حقائق کا منتہائے فکر ہے لیکن اقبال اپنا نظریہ نہایت بلند سطح سے پیش کرتے ہیں۔ وہ انفرادی اور اجتماعی تمام افکار و

اعمال کو جانچتے ہیں اور ہر جزو پر اپنی رائے دلائل کے ساتھ پیش کرتے ہیں لیکن اس کے لئے ایک نمار مزو کنایہ سے لبریز زبان استعمال کرتے ہیں۔ احکام اسلام اک تذکرہ عریانی کے ساتھ بہت کم نامزد کرنے کے عادی ہیں۔ خود فرماتے ہیں:

وقت برہنہ گفتن است من بکنا یہ گفتہ ام
خود تو بگو کجا برنفاہر نِ خام را

گویا کلام اقبالؔ ایک ایسے مفکر فلسفی شاعر کا کلام ہے جو نقلی اصول پیش کرنے کے بجائے ہر شعبۂ حیات کے متعلق اسلام کے نظریہ کو عقلی وجوہ اور فلسفیانہ دلائل کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ لیکن یہ دعوت دیتا ہے کہ کاش عقل وخرد کو خیر آباد کہہ کر امت مسلمہ حقائق اسلام کو بے چوں وچرا تسلیم کر لے اور میدان عشق میں اس طرح سرفگندہ کھڑی ہو جائے کہ اس کائنات کو الٹ دینے کا عزم بالجزم رکھے۔ اس موقع پر یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اقبال کسی جماعت یا نظام سیاسی یا معاشرتی سے اپنے آپ کو مطابق نہیں کرتے۔ اور جہاں تک ان کے کلام کا تعلق ہے اس کا صرف ایک نظریہ ہے اور وہ ہے کہ دنیا میں وہ بلند اسلامی تخیل پیدا کر چاہتے ہیں جو بنی نوع انسانی کے تمام انفرادی واجتماعی اعمال وحرکات کا محرک ہو۔ معلوم ہونا چاہئے کہ ایک مرکزی تخیل ہر قوم کے لئے اس کے جملہ اعمال کا محرک ہوتا ہے اور بلا اس تخیل کے کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ مثلاً جاپان کے سپاہی چین کی عورتوں اور وہاں کے بچوں کو قتل کرنے میں دریغ نہیں کرتے اور چین کو غلام بنانے کے لئے لاکھوں انسان سر بکف موجود ہیں۔ اٹلی نے حبشہ کے ساتھ حال میں یہی برتاؤ کیا ہے۔ یہ وہ اعمال ہیں جن پر دنیا کا ضمیر آج سخت بیچین ہے مگر جاپان اور اٹلی اس چیز کے لئے جسے بیرونی دنیا سخت مذموم تصور کر رہی ہے اپنی بہترین قربانیاں پیش کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس میں کیا راز ہے؟ اقبال کا ارشاد ہے دراصل مادیت اور وطنیت جارحانہ کا ایک مرکزی تخیل ایسا پیدا ہو گیا ہے جس نے بدترین افعال کو بہترین اخلاق اور تسفل کو ایثار کا درجہ دے دیا ہے۔ ع

ناپاک جسے کہتی ہے مشرق کی شریعت
مغرب کے فقیہوں کا یہ فتویٰ ہے کہ ہے پاک

پس ظاہر ہے کہ ہر جماعت اور ہر قوم کا ایک مرکزی تخیل ہوتا ہے جس پر وہ چلتی ہے اور مرکزی تخیل نہ صرف اعمال سیاسی میں بلکہ تمام اعمال ذاتی میں اور زندگی اور سلطنت کے ہر شعبہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اقبالؔ یہ چاہتے ہیں کہ بنی نوع انسان میں مرکزی تخیل اسلامی پیدا کریں تا کہ شعبہ ہائے حیات میں جو خورد ونوش سے لے کر حکومت تک حاوی ہو اسلام کا

مرکزی تخیل ہی کارفرما نظر آئے۔ ان کی نگاہ میں انسان کی موجودہ پستی اور نظام عالم کی باہمی خوں ریزیوں اور عداوت و دشمنی کا واحد حل و علاج یہی ہے۔ اس مرکزی تخیل کو پیدا کرنے کے لئے وہ دنیا کے تمام مرکزی تخیلات کی مذمت کر کے اس کا اثر و اقتدار مٹانے اور اس کو مختلف پیرایہ میں ترنم ریز ہو کر دلکش و جاذب بنانے کے خواستگار ہیں۔ اقبالؔ کو کسی جماعت بندی سے وابستہ کرنا یا کسی موجودہ تخیل سے مطابق قرار دینا میری ناچیز رائے میں سخت غلطی ہے وہ عرش اعلیٰ سے بولتے ہیں۔ فرش پر اتر کر کبھی آتے نہیں۔ انہیں فرش پر لا پٹکنا اور کسی ادارہ کا خیر خواں بنا دینا اقبال کی کمال توہین ہے۔ اور اس مرکزی تخیل اسلامی کے قیام کے لئے ہر چیز کو جانچنے اور تولنے میں زندگی، سرمایہ داری، مزدور، زمیندار، کسان، سلطنت، اصلاح، حقوق، رعایا، معاشیات، لینن، کارل مارکس، سود، تجارت، نماز، عبادت، مسجد، خانقاہ، ملا، صوفی الغرض کوئی شے ان سے بچ کر نہیں جاتی۔ مگر کسی جگہ بلند فلسفہ کی سطح سے اتر کر نیچے نہیں آتے اور ان تمام چیزوں سے بحث کرتے ہیں جو مخالف اسلام پیدا ہو کر انسانون کے تخیل کو حقیقت سے ہٹانے والی ہیں۔ ان کا پیام پیامِ کائنات یا پیامِ اسلام ہے اور اس مجموعہ کا ایک نچوڑ ''عشق رسول'' ہے۔ سرکار کی زندگی میں وہ جملہ مشکلات کا حل پاتے ہیں اور اسے اسوۂ حسنہ قرار دے کر اس کو مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے اور دنیا کو ''عشق رسولؐ'' کا درس دیتے ہیں دراصل اگر ایک جملہ یا چند الفاظ میں اقبال کا پیام بیان کرنا ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کا پیام ''بنی نوع انسان'' کے نام صرف ''عشق رسول'' ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ جملہ تخیلات، جملہ افکار، جملہ فلسفہ، جملہ علوم محو کر دئے جائیں اور بنی نوع انسان کا کل سرمایہ کائنات صرف ''عشق رسول'' رہ جائے۔ چنانچہ جواب شکوہ میں اس طرح صاف صاف آخری بند میں اس پیام کو واضح کر دیا ہے جو بالعموم ان کا شعار نہیں ہے۔

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری — میرے درویش خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری — تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اسی طرح حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر جو نظم تحریر فرمائی ہے اس میں اولاً یہ لکھنے کے بعد کہ سکندر رومی جیسے فاتح و عظیم شخص کو آج تاریخ داں بھی نہیں جانتا مگر حضرت بلال کا ترانہ عشق

اقبالؔ کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے
رومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے جواب میں امت کو یہ تعلیم دی ہے۔ ع

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس

ایک اور نظم ''ایک حاجی مدینہ کے راستہ میں'' عجیب و غریب دلکش تحریر ہے۔ایک قافلہ مدینہ کے راستہ میں لوٹا گیا اور ایک نوجوان نے نہایت خوشی سے دیارِ رسول کی مسافت میں جان دی۔اب قافلہ کا ایک بچا ہوا حاجی سوچ رہا ہے کہ سوئے یثرب چلوں یا نہ چلوں۔ایک طرف ڈاکوں کا خوف اور جان کا ڈر، دوسری جانب اشتیاق زیارت دیارِ رسول۔اس طرح ادا کیا ہے۔ ع

خوف کہتا ہے کہ یثرب کی طرف تنہا نہ چل — شوق کہتا ہے کہ تو مسلم ہے بیباکانہ چل
بے زیارت سوئے بیت اللہ پھر جاؤں گا کیا — عاشقوں کو روز محشر منہ نہ دکھلاؤں گا کیا
خوف جاں رکھتا نہیں کچھ دشت پیمائے حجاز — ہجرتِ مدفونِ یثرب میں یہی مخفی ہے راز

اسی طرح شفاخانہ حجاز بننے کی خبر آئی تو عاشق رسول تڑپ گیا اور ایک واقعہ قلمبند کیا کہ ایک صاحب اقبال سے شفاخانہ حجاز کے لئے چندہ طلب کرنے آتے ہیں اور اس طرح گویا ہوتے ہیں۔ ع

دست جنوں کو اپنی بڑھا جیب کی طرف — مشہور تو جہاں میں ہے دیوانۂ حجاز
دار الشفا حوالیٔ بطحا میں چاہئے — نبضِ مریض پنجۂ عیسیٰ میں چاہئے

اس کا جواب انہیں یہ ملتا ہے۔ع

میں نے کہا کہ موت کے پردہ میں ہے حیات — پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں
تلخابۂ اجل میں جو عاشق کو مل گیا — پایا نہ خضر نے مے عمر دراز میں
دیں اور کو حضور یہ پیغامِ زندگی — میں موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں

نغمہ ساربان حجاز:

اقبال کا ایک زبردست شاہکار ہے جس میں عاشق بیتاب کے اصرار پر ساربان اپنی اونٹنی کو ذرا تیز چلنے کی طرف راغب کرتا ہے اور اس کی مدح وثنا کے ترانے گاتا ہے تاکہ دیارِ محبوب میں جلد داخل ہو جائے اس کا نغمہ تکرار کے ساتھ یہ ہے

تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست

اس طرح ایک رہ پیمائے یثرب بیتابی عشق میں ایک دوسری نظم کے اندر ساربان سے اس طرح مخاطب کرتا ہے۔ ع

ساربان یاراں بہ یثرب ما بہ نجد　　　آں حدی گو ناقہ را آرد بہ وجد

وہ سوچتا ہے کہ شاید پانی برس جانے سے ناقہ کی رفتار سست ہے چنانچہ کہتا ہے ع

ابر بارید از زمیں بالیدہ سبزہ است　　　می شود شاید کہ پائے ناقہ سست

اور بعد ازاں بےچین ہو کر یوں گویا ہوتا ہے ع

جانم از درد جدائی در نفیر　　　آں رہے گو سبزہ کم دارد بگیر

یعنی غالباً سبزہ کی وجہ سے ناقہ تیز نہیں ہے۔ ذرا ایسے راستہ سے چلو جہاں سبزہ کم ہو۔ میں درد جدائی سے بیتاب ہو رہا ہوں ع

ناقہ مست سبزہ و من مست دوست　　　او بدست تست و من در دست دوست

حلقہ حلقہ چوں پر تیہو غمام　　　ترسم از باراں کہ دوریم از مقام

ساربان یاراں بہ یثرب ما بہ نجد
آں حدی کو ناقہ را آرد بہ وجد

میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ اقبال کا سارا کلام "عشق رسول" کی ترنم خیزیوں اور بیتابیوں سے بھرا پڑا ہے۔ کائنات کے صفحات پر اقبال نے عشق رسول کا پیام لکھ دیا ہے اور اس طرح بنی نوع انسان کو نجات کا راستہ بتلا دیا ہے۔

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراک صاحب دولتے بستم سر خود را
وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

اب انسانیت کو اختیار ہے کہ خواہ وہ راستہ اختیار کرے یا نہ کرے مگر اقبال متیقن ہے کہ انسانیت آخر کار اسی راستہ پر گامزن ہو کر اپنی فلاح و نجات کا سامان کرے گی۔

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیش نظر لایخلف المیعاد دار

پیام طلباء کے نام

اس تمہید کے بعد اب اصل موضوع پر آتا ہوں کہ طلبہ کے نام اس شاعر اعظم کا پیام کیا ہے جو خود تمام عمر طالب علم رہ کر ہمارے لئے حقائق بر دقائق کا ایک جامع اور مکمل دفتر چھوڑ گیا ہے۔

اول پیام یقیں:

سب سے پہلا پیام جو کلام اقبال طلبائے عصر کو دیتا ہے وہ وہی پیام ہے جو ان کو اس مرکز تخیل پر لایا ہے، یعنی کائنات کا نظر غائر سے مطالعہ اور تحقیق و تلاشِ حق۔

زمانے با ارسطو آشنا باش — دمے با ساز بیکن ہمنوا باش
ولیکن از مقام شاں گزر کن — مشوگم اندریں منزل سفر کن

مقام تو بروں از روزگار است
طلب کن آں یمیں گو بریسار است

لیکن اقبال اس حقیقت سے آشنا ہے کہ ہر شخص کے لئے یہ راہ سازگار نہیں آسکتی اس لئے خود فلسفہ کے راستہ سے حقائق اسلام تک پہنچنے اور ذرہ ذرہ کو حکومت اور تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد وہ چاہتے ہیں کہ نوجوان اسلام علم و معرفت کو فلسفہ کے بجائے یقین کے راستے سے تلاش کریں۔ چنانچہ وہ نہایت مضبوطی کے ساتھ عقل می مدمت میں سرگرم ہیں اور عشق یقین اور ایمان کا پیام دیتے ہیں۔ اقبال کی لغت میں یہ تینوں الفاظ مترادف ہیں۔

یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم — جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں
ولایت پادشاہی علم اشیاء کی جہانگیری — یہ کیا ہیں فقط اک نقطۂ ایماں کی تفسیریں
گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا — بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

مگر اقبال کو تعلیم جدید، موجودہ مغربی تخیل کے رعب و اقتدار کے باعث یہ یقین و ایمان پیدا کرنے والی نظر نہیں آتی چنانچہ کل مغربی تعلیم کے نتائج کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

رہبر کے ایما سے ہوا تعلیم کا سودا مجھے — واجب ہے صحرا گرد پر تعمیل فرمانِ خضر
لیکن نگاہ نکتہ بیں دیکھے زبوں بختی مری — رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر

یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

طلباء علیگڈھ کالج کو جو اس تحریک تعلیم جدید کا مرکز ہے۔ یہ فتویٰ دیتے ہیں

واعظ اندر مسجد و فرزنداندر مدرسہ　　آں بہ پیری کود کے ایں پیر در عہد شباب

انقلاب، انقلاب، اے انقلاب

ہندی مکتب کو غلامی تخیل مغرب کا ایک نمونہ تصور کر کے یوں فرماتے ہیں۔

اقبالؔ یہاں نام نہ لے علم خودی کا　　موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی　　موسیقی، صورت گری و علم نباتات

اس لئے اس تعلیم کو اپنی تحقیق حق یعنی دین فطرت اسلام کے لئے سخت زہر تصور کرتے ہیں۔

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم　　ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے　　قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے　　کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

یعنی موجودہ نظام تعلیم ایک جماعتی معصیت اور ملت کا ایک گناہ ہے۔

اسکولوں کی تربیت کا نتیجہ یوں ظاہر کرتے ہیں۔

دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار　　کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت　　وہ کہنہ دماغ اپنے زمانہ کے ہیں پیرو

آخری شعر ایک واضع تعلیم ہے وہ طالب علم کو زمانہ کا مصلح بنانا چاہتے ہیں اور اس پر سوگوار ہیں کہ نوجوان طلبا نے بجائے زمانے کو پلٹ کر اپنی راہ پر لانے کے زمانے کی پیروی اختیار کر لی ہے چنانچہ جس غلامی کا سب سے زیادہ ماتم اقبال کے کلام کے اندر پایا جاتا ہے وہ ذہنی اور دماغی غلامی اسی فلسفہ و دانش مغرب کی ہے جسے اقبال باطل ثابت کر چکے ہیں۔ چنانچہ اس کا ترنم ان اشعار میں ہے۔

غلامی کیا ہے ذوق حسن و زیبائی سے محرومی　　جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر　　کہ دنیا میں فقط مردان حر کی آنکھ ہے بینا

چنانچہ سخت حیرت کرتے ہیں کہ کس طرح حقائق اسلام عجم کے باطل فلسفہ سے مرعوب ہو جائے۔ ع

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

مگر حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ موجودہ تعلیم نے جس طرح ہمارے نوجوانوں کے قلب ماہیت کو بدل دیا ہے اس کا صحیح نقشہ کھینچنا شاعر کا فرض ہے۔

دل طور سینا و فاراں دونیم — تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم
مسلماں ہے توحید میں گرم جوش — مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تمدن، تصوف، شریعت، کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ امت روایات میں کھو گئی
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے — مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

چنانچہ اپنے اس کارواں میں اپنی پوری متاع تحقیق لٹا دینے کے آرزومند ہیں اور اس طرح دعا گو ہیں۔ ع

جوانوں کو سوز جگر بخش دے — مرا عشق میری نظر بخش دے
اُمنگیں مری آرزوئیں مری — امیدیں مری جستجوئیں مری
مرا دل مری رزمگاہِ حیات — گمانوں کا لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلہ میں لٹا دے اسے — لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

اقبال دیکھتے ہیں کہ کائنات کے ذرّہ ذرّہ پر اور باغ عالم کے پتہ پتہ پر یقیں محکم کا وہ پیام درج ہے جسے تعلیم جدید مغرب نے پوشیدہ کر دیا ہے وہ نہایت بلند آواز سے طلبہ کو یوں مخاطب کر کے پکارتے ہیں۔

اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا — جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
مدرسہ نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو — خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

غالباً جہاں تک ان کا کلام شایع ہو چکا ہے۔ طلبہ کو آخری خطاب اس طرح فرمایا ہے۔ ع

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے — کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو — کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

اللہ اللہ کیا بلندی ہے اور کس مقام پر وہ طالب صادق کو پہنچانا چاہتے ہیں۔ ان کا پیام ہے کہ ہر طالب علم صاحب کتاب بن کر پیغمبرانہ یقین و ثبات پیدا کرے۔ مگر یہ چیز موجودہ تعلیم کے اندر کہاں؟ موجودہ تعلیم زیادہ سے زیادہ واقفیت عام کا دروازہ کھولتی ہے مگر عشق و زندگی سپے نیاز کر دیتی ہے۔ اس لئے اقبال کے نزدیک زندگی اور حقائق زندگی کی منزل علم کے راستہ سے

طے نہیں ہو سکتی اس کے لئے عشق کا راستہ ہے۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانہ کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا نام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات
عشق سے نور حیات عشق سے نارِ حیات

فلسفۂ و خرد کلام اقبال میں زندگی سے دوری اور حضوری سے مہجوری کا نام ہے

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوز جگر ہے علم ہے سوز دماغ

علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

اہل دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہل نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا دماغ

شیخ مکتب کے طریقے سے کشادہ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

چنانچہ علم اور عشق کا محاکمہ بڑے دھوم سے لکھا ہے جس کا پہلا بند حسب ذیل ہے۔ ع

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن

بندہ تخمین و ظن کرم کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب

اب اس کا مداوا یہ ہے کہ تمام علم کی راہوں کو ترک کر کے اور خرد کا دروازہ بند کر کے فلسفہ سے احتراز اور یقین کامل تقلید روشن کا راستہ اختیار کیا جائے تا کہ الفاظ کے دائرے سے نکل کر حقیقت کی جانب رہنمائی ہو۔ حضرت اقبال کیونکہ خود رہگذر عام سے نشان منزل کی تلاش میں بھٹکے ہوئے پھر چکے ہیں۔ اس لئے انہیں نوجوانون اور طالب علموں کی دماغی کیفیت کا صحیح صحیح اندازہ ہے اور وہ پورے یقین اور اطمینان کے ساتھ دعوت دیتے ہیں۔ اور پکارتے ہیں کہ اس خطرناکی سے بچو اور الفاظ کے الجھاؤ سے نکل کر حقیقتِ کلام کو مضبوط پکڑو۔

افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں
پوشیدہ نہیں مرد قلندر کی نظر سے

معلوم ہیں مجھ کو ترے احوال کہ میں بھی
مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہ گزر سے

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خون جگر سے

اقبال کا یہ طریقہ ہے کہ وہ اپنا پیام کتابوں اور اشاروں، استعارات اور تشبیہات

میں بیان کرنے کے بعد کہیں ایک جگہ واضح حقیقت صاف الفاظ میں بھی بیان کرتے ہیں تاکہ ابہام رفع ہو جائے۔ اور حقائق کا آفتاب ابر آلود نہ رہے یعنی اپنا پیام برگ گل پر لکھنے کے بعد کسی ایک جگہ صفحۂ قرطاس پر بھی قلم بند کر دیتے ہیں چنانچہ ایک ''فلسفہ زدہ سید زادہ کے نام'' جو نظم تحریر کی ہے اس میں ایک جامع اور مانع فصاحت اس نظریہ کی موجود ہے میں اس سے اس درجہ لذت اندوز ہوا ہوں کہ اس کا بیشتر حصہ آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا — زناری برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی — ہے اس کا طلسم سب خیالی
محکم کیسے ہو سب زندگانی — کس طرح خودی ہو لازمانی
آدم کو ثبات کی طلب ہے — دستور حیات کی طلب ہے
میں اصل کا خاص سومناتی — آبا مرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد — مری کفِ خاک برہمن زاد

برہمن زادگی پر ایک اور جگہ اس طرح ارشاد فرمایا :

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی — برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

یعنی نسبتاً بھی برہمن زادہ ہونے کی وجہ سے میں فلسفی ہوں۔ اور عملاً بھی اس سے باخبر ہوں۔ اس لئے جو پیام میں سناتا ہوں وہ مبنی برحق ہے :

ہے فلسفہ میرے آب و گل میں — پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبالؔ اگرچہ بے ہنر ہے — اس کی رگ رگ سے باخبر ہے
شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز — سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز
انجام خرد ہے بے حضوری — ہے فلسفۂ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت — ہیں ذوق عمل کے واسطے موت
دیں مسلک زندگی سے تقویم — دیں سرّ محمد ابراہیم

دل در سخن محمدی بند
اے پور علی زبو علی چند

جوانوں اور طالب علموں کی نفسیات سے اقبالؔ اس درجہ مایوس ہیں کہ وہ کسی صادق تحریک میں ان کی شرکت پر اعتماد نہیں کرتے۔ جب تحریکات کے زمانہ میں طلبائے

علی گڈھ ایک کوشش کامل کا عزم لے کر مسلم یونیورسٹی کی سرزمین سے نکلے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی اور علامہ اقبال کو دعوت دی کہ وہ تشریف لاکر اپنا پیام سنائیں تو علامہ موصوف نے اس جذب وسوز پر بھی اعتقاد قائم نہیں کیا اور ایک غزل دعائیہ لکھ کر بھیج دی جس کا آخری شعر نوجوانوں کو مخاطب کر کے یہ تھا۔

نوجواں خام سوزے بخشم تمام سوزے
غزلے کہ می سرائم بتو سازگار بادا

نوجوانوں کی نفسیات کا کس قدر صحیح مطالعہ تھا جو آج واقعات کی روشنی میں مبنی بر حق ثابت ہو چکا ہے، رمز و کنایات سے در گزر کر کے صاف اور صریح الفاظ میں اقبال کا پیام حقیقت اسلام پر ایک مضبوط اور مستحکم یقین براہ عشق قائم کرنا ہے ان کا پیام یہ ہے کہ اسلام تمام جزئیات اعمال زندگی میں حقیقت کا آئینہ دار ہے اور کیا عبادت و نور قلب اور کیا معاملات و سیاست و معاشیات و اقتصادیات الغرض حیات انفرادی و اجتماعی کے ہر صنف میں حق و صداقت کا علم بردار ہے اس لئے بنی نوع انسان کی نجات اسلام پر ایمان بالغیب میں مضمر ہے۔ پس نوجواں اور طالب علموں کو پکارتے ہیں کہ وہ آزادی افکار و تحقیق و مسائل کو ترک کر کے اپنے ہر معاملے کا حل احکام اسلامیہ و سیرت مبارکہ نبی علیہ السلام میں تلاش کریں اور اس کے بعد خیر و برکت و نصرت و کامرانی کے تمام دروازے ان پر کھل جائیں گے۔ چنانچہ صاف الفاظ میں اس پیغام کو بہ غل و غش اس طرح پیش کیا ہے، فرماتے ہیں :

خدائے لم یزل دست قدرت تو زباں تو ہے — یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی — ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا — خدا کا آخری پیغام تو ہے جاوداں تو ہے
حنا بند عروس لالہ ہے خونِ جگر تیرا — تری نسبت براہیمی ہے معمار جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی — جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر — نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

دوسری جگہ فرماتے ہیں :

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں — جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا — نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

چہ باید مرد را طبعے بلندے مشربے نالے
دل گرمے نگاہ پاک بینی جان بے تابے

اور فیصلہ کن انداز میں یقین کے نتائج کے متعلق یہ حکم صادر ہوتا ہے :

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے یہی قوت ہے جو صورت گرے تقدیر ملتی ہے

اس یقین کو پیدا کرنے کے لئے تمدن اور تہذیب مغرب کی زبوں حالی اور اس کے بطلان کو طرح طرح سے بیان کیا ہے اور اشارات و کنایات کا ایک پورا دفتر جو حقائق و معانی سے لبریز ہے کلام اقبال میں پایا جا سکتا ہے ان سے قطع نظر کر کے میں وہ واضح اور صاف کلام پیش کرتا ہوں جس میں اس کے کذب و تاریکی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ذیل کا بند اس نقطۂ خیال کی وضاحت کے لئے کافی ہے :

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیٔ تعمیر میں رونق میں صفا میں گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کے فیضان سماوی سے ہو محروم حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

اس لئے تخیل و فلسفہ فرنگ کی غلامی سے آزاد ہو کر نظام حقائق اسلام پر پورا یقین قائم کرنا اقبال کے کل کلام کی اوّلین تمہید ہے اور وہ اس کی طرف مختلف انداز میں دعوت دیتے ہیں۔ میں ان کا ایک بند اور لکھ کر اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں:

فریاد ز افرنگ و دل آویزی افرنگ فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چیزی افرنگ معمار حرم باز بہ تعمیری افرنگ
ناموس ازل را تو امینی تو امینی دارائے جہاں تو یساری و یمینی
اے بندہ خاکی تو زمانی و زمینی صہبائے یقیں در کش و از دیر گماں خیز

کیا نوجوانوں اور طالب علموں کو یقین و ایمان کامل پیدا کرنے کے لئے صرف یہ اعتماد کافی نہیں ہے کہ خمستان مغرب کے اس سب سے بڑے مے نوش نے پوری اور کامل تحقیق کے بعد "پیمانہ برداریٔ خمستان حجاز" کا مسلک عظیم اختیار کر لیا اور تحقیق کی روشنی میں حقائق اسلام کے ہر جزو کو اس طرح مبنی بر صداقت پایا کہ بار بار مغرب کو مخاطب کر کے اس کو اپنے پیام اور اسلام کی سچائی کی تعلیم دی۔

وہ پکارتے ہیں :

دریں محفل کہ کار او گزشت از بادہ و ساقی — ندیمے گو کہ در جامش فرو ریزم مے ساقی
کسے گو زہر شیریں می خورد از جام زرینے — مئے تلخ از اسفال کن کجا گیرد تبر یاقی
شرار از خاک من خیزد کجا ریزم کجا سوزم — غلط کردی کہ در جانم فگندی سوز مستانی

کیا نوجوان اس پکار پر لبیک کہیں گے۔ کیا نوجوان اس مئے باقی کو جام دل میں ڈالیں گے۔ کیا وہ اقبال کے مئے تلخ کو جو آب حیات ہے جام زریں کے زہر شیریں کے بجائے قبول کریں گے اور کیا جو بجلیاں خاک اقبال سے چمکی ہیں ان سے جلنا پسند کریں گے؟

اقبال کا دوسرا پیام

خودی یا معرفت نفس

یقین کامل پیدا کرنے اور ایمان مکمل کے ظہور کے بعد اقبال جب انسانیت کا جدید حریم تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے جس پیام کو پیش کرتے ہیں وہ خودی یا معرفت نفس ہے۔ خودی روح انسانی کے تمام امکانات پر حاوی ہے اور اس کے انوار تجلیات کا اندازہ کرنا ہر اس شخص کے لئے غیر ممکن ہے جو اس کے درک و احساس سے محروم ہے۔ اسی لئے موجودہ تعلیم، مغربی تخیل، مروجہ فلسفہ کو مادیت کا سرمایہ دار تصور کر کے فلسفہ خودی کا متناقض خیال کرتے ہیں اور بار بار پکارتے ہیں کہ یہ "زمین و آسمان" حاضر مستعار ہے اور خودی کی جلوہ گری سے وہ متمنی ہیں کہ وہ آشکارا ہو کر اسے پھونک ڈالے اور جہان تازہ پیدا کرے۔ خودی بلا تخلیق و تولید مقاصد عالم وجود میں نہیں آسکتی۔ جس طرح زندگی کے ہر شعبہ میں اور حیات کے ہر جزوی اعمال میں ایک عیاں یا نہاں مقصد پوشیدہ ہے۔

زندگی سرمایہ دار آرزوست　　عقل از آئیدگان بطن اوست
چیست نظم قوم و آئین رُسوم　　چیست رازِ تازگیہائے علوم
دست و دنداں و دماغ و چشم و گوش　　فکر و تخیّل و شعور و یاد و ہوش
زندگی مرکب چوں در جنگاہِ باخت　　بہر حفظ خویش این آلات ساخت

اسی طرح خودی کا بھی ایک مقصد ہے، اس کی بھی ایک آرزو ہے اور اسی آرزو اور مقصد سے وہ زندہ رہے گی ورنہ :

زندہ را نفی تمنا مردہ کرد　　شعلہ را نقصان سوز افسردہ کرد

وہ مقصد کیا ہے جس کے لئے خودی بیتاب ہے یا جس کے لئے خودی کو بیتاب ہونا چاہئے۔ اقبال اس مقصد کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

اے ز رازِ زندگی بیگانہ خیز　　از شرابِ مقصدِ مستانہ خیز
مقصدے مثلِ سحر تابندۂ　　ماسوا را آتش سوزندۂ
مقصدے از آسماں بالاترے　　دلبرائے دلستانے دلبرے
باطلِ دیرینہ را غارتگرے　　فتنہ در جیبے سراپا محشرے

ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم
از شعاع آرزو تابندہ ایم

چنانچہ خودی کا مقصد اپنے کو آشکارا کرنا اور اپنے شعلہ سے باطل کے تمام خس و خاشاک کو پھونک ڈالنا ہے خودی ایک نور ہے اور وہ نور جو تخلیق عالم اور میلاد آدم کا باعث ہے اور اس کا حیات انسانی کے ذرہ ذرہ میں نمایاں ہونا اس کا ازلی اور ابدی مقصد ہے اس لئے جس جگہ حیات کے کسی ضمن یا جزو میں باطل پرستی، یا کجروی ہے وضعف خودی ہے خودی سارے عالم میں ساری اور تمام کائنات پر غالب ہے یا اس کو غالب ہونا چاہئے اگر ایسا نہیں ہے تو اسے نمودار کر کے اقبال ایک نئی دنیا اور اس کے لئے ایک نیا آدم تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ زندگی کے حقائق، انسانیت کے مقام بلند اور آدم کا مقصد ظہور سب خودی کی تکرار اور خودی کے شعبہ جات کی تفسیر ہیں۔ کلام اقبال میں زندگی کا مادی تخیل انسانی پستی اولادِ آدم کا نور تجلی سے بیگانہ ہو کر ابلیس ہو جانے کے جو تذکرے ہیں سب اسی مقام خودی کے عزل کے دوسرے نام ہیں جو باطل کے خس و خاشاک سے تعبیر کیئے گئے ہیں اور جن کو خودی کی ایک چنگاری سے پھونک ڈالنا خودی کے آشکارا ہونے کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے جس کی جانب وہ دعوت و پیام دیتے ہیں۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے　　سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

اقبال یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خودی غلط رو بھی ہو سکتی ہے اس کا حق کوش کے بجائے حق پوش اور باطل سوز کے بجائے باطل نواز ہونا بھی ممکن ہے مگر دراصل یہ خودی کا صحیح جلوہ نہیں ہے، بلکہ نفس انسانی کے امکانات کا نہایت ناجائز اظہار اور نور آدم کے بجائے تاریکیِ ابلیس کا مظاہرہ ہے اس لئے سب سے پہلی چیز جو کلام اقبال میں خودی کی حقیقی جلوہ گری کی تعلیم میں نظر آئے گی وہ زندگی کا وہ تخیل ہے جو اسے قید امروز و فردا سے آزاد کر کے دوام سے وابستہ کر دے تا کہ وہ ہمیشہ اپنے انوار تجلی کی ترقی میں سرگرم رہے۔

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی

اور اسی لئے ان کا پیام ہے۔

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سر زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و صبح سے جاوداں ہو جا
من چہ گویم از یم بے ساحلش
غرق اعصار و ہوا اندر دلش

اس حقیقت نور، اس ابدی حیات کے احساس کے پانے کا طریقہ انسانیت کے راز کا معلوم کرنا ہے اور اس معرفت کی تخلیق کہ نفس آدم کی حقیقت کیا ہے۔ خودی جب اس مقام بلند پر پہنچ کر اپنے اندر اس نور حقیقی کو جلوہ کر لے گی اور اس کا احساس اسے ہو جائے گا تو وہ تمام خامیوں اور کمزوریوں سے پاک ہو کر وہ درجہ حاصل کرے گی جس کے بعد وہ کبھی باطل کی جانب رجوع نہ ہوگی۔ میلاد آدم میں اسی تخیل کا نظارہ ہے۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد　　حسن لرزیدہ کہ صاحب نظرے پیدا شد

دوسری جگہ ارشاد ہے:

آنچہ در آدم نگنجد است　　آنچہ در عالم نگنجد آدم است
آشکارا مہر و مہ از جلوتش　　نیست رہ جبرئیل را در خلوتش
برتر از گردن مقام آدم است
اصل تہذیب احترام آدم است

چنانچہ خودی کی تجلی سے جس تہذیب کی بنیاد اقبال رکھنا چاہتے تھے وہی ''احترام آدم'' اور اجتماعی حیثیت میں ''جمعیۃ آدم'' ہے۔ چنانچہ فرشتے آدم کو جنت سے رخصت

کرتے وقت اس طرح رجز خواں ہیں۔

سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

اور روح ارضی آدم کے استقبال میں اس طور پر قصیدہ خواں ہے:

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے دیکھیں گے تجھے دور گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحر تخیل کے کنارے پہونچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیر خودی کر اثر آہِ رسا دیکھ

آدم کا نور ایسا جاذب ہے کہ

نوریاں بہ تماشائے خاکیاں مستند

حتیٰ کہ آدم کے مقام بلند کو اقبال کی زبان سے سن کر جبرئیل بھی یہ دعا کرتے ہیں۔

مرا ناز و نیاز آدمے دہ بجانِ من گداز آدمے دہ

اور فرشتے بارگاہ ربوبیت میں اس طرح اقبال کے ثنا کی ہیں۔

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی گستاخ ہے کرتا ہے فطرت کی حنا بندی
خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی رومی ہے نہ شامی ہے کاشی نہ سمرقندی
سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے آدم کو سکھاتا ہے آداب خداوندی

مادیت مغرب ایک دوکان ہے اور خودی تب و تاب دل۔

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرت پرویز خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد

چنانچہ ان دونوں تخیلات کا غلط اور باطل نقشہ قائم کرنے کا نتیجہ مغرب کی موجودہ تہذیب ہے جسے اقبال اپنی زبان میں افرنگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ مادیت اور سرمایہ داری کی لعنتیں ہیں۔ مادیت نے زندگی کو دوام کے درجہ سے گرا کر اس درجہ اسفل میں پہونچا دیا ہے جہاں اس کا خاتمہ موت پر ہو جاتا ہے اور جسے ہندوستان کے ایک مشہور شاعر نے اس شعر میں ادا کیا ہے:

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

مگر اقبال اس نظریہ کی سختی سے تردید کرتے ہیں ان کی نگاہ میں

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
اور: موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

اور : زندگی در صدف خویش گہر ساختن است در دل شعلہ فرو رفتن و نگداختن است

چنانچہ جو غلبہ و استیلا ''افرنگ'' یا خودی کی غلط نمائش نے آج قائم کر لیا ہے اسے اپنے تمام کلام میں طرح طرح سے ظاہر کیا ہے اور جسے اس دعا کے ذریعہ سے بھی بتلایا ہے

یا دگر آدم کہ از ابلیس باشد کمترک یا دگر ابلیس بہر امتحانِ عقل و دیں

یا چناں کن یا چنیں

چنانچہ جو انانیت خودی کی کجروی اور معرفت نفس کے فقدان نے اس دنیائے حاضر میں پیدا کر دی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شخص آج نور حقیقی سے جدا ہو کر مادیت میں گرفتار ہے اور نور واجب الوجود کے آگے سر فگندہ ہونے کے بجائے خود اپنے آپ کو کبریائی کا درجہ دے رہا ہے۔ خدایان کہن کی مجلس میں نغمہ ''بعل'' اسی جانب اشارہ کرتا ہے۔

آدم ایں نیل تبق رابر درید آنسوے گردوں خدائے راندید
درد دل آدم بجز افکار چیست ہمچو موج ایں سر کشیدہ آں رمید
جانش از محسوس می گیرد قرار بو کہ عہد رفتہ باز آید پدید
زندہ باد افرنگی مشرق شناس زانکہ مارا از لحد بیروں کشید

اے خدایانِ کہن وقت است وقت

اسی طرح خواجۂ اہل فراق یعنی ابلیس کی دعا میں اسی حقیقت کو آشکارا کیا ہے۔ ابلیس اس امر کا خواستگار ہے کہ کاش کہیں انسان ملتا تا کہ اس سے لذت شکست نصیب ہوتی۔

ابن آدم چیست یک مشت خس است مشت خس را یک شرار از من بس است
اندریں عالم اگر جز خس نہ بود ایں قدر آتش مرا دادند چہ سود
آں چناں تنگ از فتوحات آمدم پیش تو بہر مکافات آمدم
اے خدا یک زندہ مرد حق پرست لذتے شائد کہ یابم از شکست

خودی کی دوسری غلط نمائش اس کا خود اپنے وجود سے انکار ہے جو معرفت نفس کے منافی ہے لیکن صوفیائے قدیم نے اسے شدت سے اختیار کر لیا تھا اور آج بھی اسے تصوف کا معراج کمال بعض حلقوں میں تصور کیا جاتا ہے۔ یہ ویدانت فلاسفی یا مسئلہ وحدت الوجود ہے۔ اقبال اس نفی خود کے نہائت زبردست مخالف ہیں۔ اور تمام دلائل اور براہین سے اسے غلط ثابت کرتے ہیں۔ دراصل خیال میں یہ انسانیت کی بدترین پستی ہے کہ خودی اپنے وجود ہی سے منکر ہو جائے، روح اپنے کو تسلیم ہی نہ کرے اور نفس اپنی معرفت سے اس

درجہ بیگانہ ہو جائے کہ اپنی ہستی کے انکار ہی میں دنیا کی نجات تصور کرے۔ چنانچہ اس فلسفہ کو ان الفاظ میں بیان کرنے کے بعد :

خدا خفتہ است وجودِ ماز خوابش — وجود مانمودے ماز خوبش
مقام تخت وفوق چارسو خواب — سکون وسیر وشوق وجستجو خواب
دل بیدار وعقل نکتہ بیں خواب — گمان وفکر وتصدیق ویقیں خواب
ترا ایں چشم بیداری بہ خواب است — ترا گفتار وکرداری بہ خواب است
چوں او بیدار گردد دیگرے نیست — متاع شوق راسوداگرے نیست

اس کا جواب ان مدلل اشعار میں دیتے ہیں۔

نگہ را در حریمش نیست راہے — کنی خود را تماشا بے گناہے
حساب روزش از دور فلک نیست — بخود بینی زن وتخمین وشک نیست
اگر کوئی کہ "من" وہم وگمان است — نمودش چوں سودایں وآں است
بگو با من کہ دارد بے گماں کیست — یکے در خود نگر آں بے نشاں کیست
جہاں پیدا ومحتاج ودلیلے — نمی آئد بفکر جبرئیلے

اور خودی کے وجود کو ان زوردار الفاظ میں بیان فرماتے ہیں :

خودی پنہاں زحجت بے نیاز است — یکے اندیش ودریاب ایں چہ راز است
خودی راحق بداں باطل مپندار — خودی راکشت بے حاصل مپندار
خودی چوں پختہ گردد لازوال است — فراقِ عاشقاں عین وصال است

اسلئے مغرب ومشرق دونوں کے متعلق ان کا نظریہ یہ ہے۔

مشرق خراب ومغرب ازاں بیشتر خراب — عالم تمام مردہ وبے ذوق جستجو است

ساقی ارباب ذوق

PDF BOOK COMPANY

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات :

Muhammad Husnain Siyalvi
0305-6406067
Sidrah Tahir
0334-0120123
Muhammad Saqib Riyaz
0344-7227224

اسلامیان عالم اور خودی

اقبالؔ کے مطالعہ میں مشرق و مغرب کی اس خرابی نے اسلامیان عالم کی خودی کو بھی مکدر کر دیا ہے۔

بت خانہ و حرم ہمہ افسردہ آتشے
پیر مغاں شراب ہو اخردہ در سبو است

اس لئے ان کے کلام میں ملا اور پیر، خانقاہ اور مسجد، نظام و حکومت و سلطنت اسلامی ہر شے اور ہر ادارہ میں خودی کی وہ نمائش نظر نہیں آتی جو نور حقیقی کی جلوہ گری اور صحیح معرفت حق کا نتیجہ ہے۔ اس لئے ہر جگہ مذمت ہی مذمت نظر پڑے گی، یہ تمام مذمت کا دفتر صرف ایک نکتہ کی تفسیر ہے کہ خودی پنہاء عالم از روئے حقیقت کارفرما نہیں رہ گئی ہے۔ اور ہر جگہ اس کا غلط نقشہ اور کج رو مظاہرہ تقلید افرنگ یا غلامی عجم کے باعث نمودار ہے۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل — دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے — خانقاہوں میں کہیں لذت اسرار بھی ہے

نغمہ ''بعل'' میں بھی اسی کی جانب حسب ذیل اشعار میں کنایہ ہے۔

در جہاں باز آمد ایام طرب — دیں ہزمیت خوردہ از ملک و نسب
از چراغِ مصطفیٰ اندیشہ چیست — زانکہ اور الف زند صد بولہب
گرچہ می آید صدائے لا الہ — آنچہ از دل رفت کے ماند بہ لب
اہرمن راز ندہ کرد افسوں غرب — روز یزداں زرد رواز بیم شب

اے خدایان کہن وقت است وقت

چنانچہ ان کا پیغام یہ ہے کہ

ساقی بیار بادہ و بزم شبانہ ساز — مارا خراب یک نگہ مجرمانہ ساز

یعنی خودی بلا پابندیِ احکام الٰہیہ جو تحقیق اقبال میں مجموعہ حقائق ہے عالم حاضر کی اصلاح واقعی کی ذمہ دار نہیں ہو سکتی اس لئے وہ خودی کو تقلید اغیار سے آزاد کر کے ''عشق حقیقی کا پیام دیتے ہیں۔ ان کی رائے میں خودی بلا عشق محکم اور استوار ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ اقبال کے عالمانہ اور فاضلانہ تحقیق میں محمد عربی صلعم کے نور نبوت سے وابستہ ہوئے بغیر خودی نور کے بجائے نار اور الوہیت کے بجائے ابلیسیت کی جانب رجوع ہو جائے گی اور روح محمدیؐ

کو کارگاہِ عالم میں اس طرح کارفرما دیکھتے ہیں کہ حقائق کی روشنی میں اس سے انکار ممکن ہی نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا کا انکار ممکن ہے مگر محمد ﷺ کا انکار دلائل و براہین حقائق و دقائق کی روشنی میں ناممکن ہے۔

مصطفےٰ اندر حرا خلوت گزید　　مدتے جز خویشتن کس را ندید
نفس مار ادر دل اور یختند　　ملتے از خلوتش انگیختند
می توانی منکرِ یزداں شدن　　منکر از شان نبیؐ نتواں شدن

چنانچہ خودی کو عشق رسول سے آراستہ کرنے کے بعد اس نور کو جلوہ گر کرنا چاہتے ہیں اور تمام موجودہ نظام اور اداروں کی بساط الٹ کر ایک نیا عالم اس حقیقت کی بنیاد پر تعمیر کرنا ان کا مقصد ہے، یعنی صاف الفاظ میں وہ معرفت نفس سکھا کر عشق رسول کا پیام دیتے ہیں اور روح انسانی کو حقیقت کے معنوں میں بیدار کر کے اور اس کو اصلیت کی جانب رجوع کر کے اسے محمد عربی صلعم کا غلام بنا دینے کے خواستگار ہیں اور جب اس طرح خاک آدم کی تعمیر ہو جائے تو اسی پر نظام تمدن و تدبر منزل، معاشرت و سیاست کا محل تعمیر کرنے کے خواستگار ہیں اقبال کی رائے میں اس ذوق و وجدان کے بغیر یہ جملے ہنگامہ باطل ہیں اور ان کا اُلٹ دینا ان کا زبردست پیام ہے۔

یا بکس در سینۂ من آرزوئے انقلاب　　یا دگرگوں کن نہاد ایں زمان و ایں زمیں
یا چناں کن یا چنیں

پس اقبال کا پیام نوجواں کو یہ ہے کہ اپنے نفس کی معرفت حاصل کریں اور اپنی خودی کو عشق رسول سے وابستہ کر کے ایک ایسا نور تعمیر کریں جو ان کے عالم جدید کی بنیاد ہو۔ کیا نوجوان اقبال کے اس پیام کو اپنی زندگی کا عظیم ترین نصب العین بنائیں گے؟

☆

اقبال کا تیسرا پیام

فقر

اقبالؔ کی لغت میں معرفت تامہ اور استغنائے کامل کا نام فقر ہے۔ ان کا کلام فقر کی تعریف و مدح سے بھرا پڑا ہے، وہ خودی کی تیغ کو فقر کی سان پر چڑھانا چاہتے ہیں، خودی سوال سے بے نیاز ہے، خودی احتیاج میں اور زیادہ غیرت مند ہوتی ہے، خودی فقر کے بغیر کج رو و غلط اندیش ہے، خودی تمام عالم سے مستغنیٰ ہے وہ جبرئیل کو بھی اپنی کمند میں لانا کوئی کمال نہیں سمجھتی بلکہ یزداں شکار ہے۔ فقر کا مقصود عفت قلب و نگاہ ہے۔ وہ مقام خبر نہیں بلکہ مقام نظر ہے اس کے معجزات تاج و سریر و سپاہ ہیں، یہ مستی کردار پیدا کرتا ہے، اسی کی بے نیازی ساز و سامان سے کنارہ کش ہو کر طلسم مجاز کو اپنی ہمت سے شکست دیتی ہے۔ موجودہ دنیا کا نظام جو عقل بے زمام اور عشق بے مقام سے لبریز ہے اور جس میں عشق کی گرہ کشائی کا فیض عام نہیں ہے اس فقر کے معیار بلند کا معرف نہیں اس لئے اس کی انفرادیت میں ہوس تمام اور اجتماعیت میں مرض جوع الارض کا مظاہرہ ہے اور اس لئے کہ اس کا تخیل بیتابی دل، عرفان نفس اور عشق حقیقت کی رہبری کے لئے ضروری ہے۔ اقبال نور حقائق کو فقر کے بغیر ظہور پزیر ہونا ممکن ہی تصور نہیں کر سکتے۔ مگر وہ اس کو واضح کر دیتے ہیں کہ وہ فقر جس کی تعلیم مرد قلندر دے رہا ہے وہ صوفیہ کا فرسودہ طریقہ رہبانیت نہیں ہے وہ خودی کی موت نہیں بلکہ عین حیات ہے، وہ نفس سے انکار نہیں بلکہ نفس کی معرفت ہے، وہ دون ہمتی نہیں بلکہ جستجوئے عظمت و سطوت ہے، وہ تقاضائے عمل سے دور نہیں بلکہ جنون کوشش کامل کا مطالبہ ہے۔ وہ عزت و اقبال کی تولید ہے، عزم و استقلال کی پیدائش ہے، وہ فقر کیا ہے اور کیا نہیں ہے اسے خود اقبال کی زبان سے سنئے:.....

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہاں گیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری میراث مسلمانی سرمایۂ شبیری

پنجاب کے پیرزادوں سے خطاب کرتے وقت شاعر محقق شیخ مجدد کی لحد پر حاضر ہو کر یہ عرض کرتا ہے کہ اس کو فقر عطا کیا جائے اور اس کو عارف کامل سے یہ جواب ملتا ہے۔

آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہوا بند ہیں اہل نظر کشور پنجاب سے بیزار

عارف کا ٹھکانا نہیں وہ خطہ کہ جس میں — پیدا کلہ فقر سے ہو طرۂ دستار
باقی کلۂ فقر سے تھا ولولۂ فقر — طروں نے چڑھایا نشہ خدمت سرکار

پس یہ فقر اقبال کا طرۂ امتیاز نہیں۔ وہ فقر جسے وہ نوجوانوں کی نئی امت میں پیدا کرنا چاہتے ہیں، اسی کو اپنے عزیز فرزند جاوید کے نام پیام دے کر ظاہر کیا ہے:

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر — نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو — سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں — سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے — خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

دوسرا پیام جاوید کے نام اسی تخیل پر یہ ہے:

ناپید ہے بندۂ عمل مست — باقی ہے فقط نفس درازی
ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی ہے پیدا — اللہ کی شانِ بے نیازی
کنجشک و حمام کے لئے موت — ہے اس کا مقام شاہ بازی
روشن اس سے خرد کی آنکھیں — بے سرمۂ بے علی و رازی
یہ فقر غیور جس نے پایا — بے تیغ و سناں ہے مرد غازی

مومن کی اسی میں ہے ہمیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری

چنانچہ آج کل جو ماتم گساری و سینہ کوبی مسلمانوں کی اقتصادی تباہی کے متعلق ہے اور جسے مسلمانوں نے بالا اتفاق اپنے تنزل و ادبار کی اصلی وجہ تسلیم کرلیا ہے اور جو دراصل مغربی تعلیم مروجہ سر سید علیہ الرحمہ کا بنیادی اصول و محرک ہے، اقبال کے لئے ذرا بھی جاذب توجہ نہیں، وہ ہرگز یہ تسلیم نہیں کرتے کہ یہ زوال دولت و جاگیر کی کمی سے واقع ہوا ہے، اس کی وجہ وہی مقام خودی کا عزل اور منت غیر پر تکیہ ہے نہ کہ ناداری اور تہی مائیگی۔ اگرچہ وہ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ دراصل کمی معاش نے طالب و محقق کو مرتبۂ خودی سے گرا دیا ہے مگر اس کا علاج وہ سوال از غیر کے بجائے غیرت مردانہ تجویز کرتے ہیں۔

اے فراہم کردۂ از شیر الاخراج — گشتۂ روبہ مزاج از احتیاج
خستگی ہائے تو از ناداری ہست — اصل درد ے تو ہمیں بیماری است
می ربائد رفعت از فکر بلند — می کشد شمعِ خیال ارجمند

اس حقیقت کے بیان کرنے کے بعد علاج یہ تجویز کرتے ہیں:

گرچہ باشی تنگ روز و تنگ بخت — در رہِ سیل بلا افگندہ رفت
رزق خویش از نعمت دیگر مجو — موج آب از چشمۂ خاور مجو
تا نہ باشی پیش پیغمبر خجل — روز فردائے کہ باشد جاں گسل
از سوال آشفتہ اجرائے خودی — بے تجلی نخل سینائے خودی

اس لئے زوال مسلم کا اصلی راز یہ ہے:

اگر چہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات — جو فقر سے ہے میسّر تونگری سے نہیں
اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور — قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں
سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے — زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں
اگر جہاں میں مرا جوہر آشکارا ہوا — قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں

پس نوجوانوں کو سوز گداز زندگی اور لذتِ جستجو کی دعوت صدائے دردمندانہ اور نوائے دلپزیر کے ساتھ مرد قلندر کی تحقیق میں پیام فقر ہے جو خودی کی زندگی سے وابستہ ہو کر بے تیغ و سناں مرد غازی کے لئے فتوحات کا دروازہ کھولتی ہے۔

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی — نہیں ہے طغرل و سنجر سے کم شکوہ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بے کراں پایاب — خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر

نہنگ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد
نہنگ مردہ کو موج سراب بھی زنجیر

اقبال کا فقر اسکندری سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ یہ آدم کو نور حقیقی کی بنیاد پر تعمیر کرتا ہے۔

میرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی

﴿☆﴾

جہاد و عمل کی دعوت

ریگ عراق منتظر و دشتِ حجاز تشنہ کام
خون حسین باز دہ کوفہ و شام خویش را

اقبالؔ کا فلسفیانہ تخیل جو خرد کی راہ سے حقائق اسلام پر منتج ہوا اور جس میں خودی یا معرفت نفس کو عشق رسول سے آراستہ کر کے کارزار عالم کا مکمل حل بتلایا گیا۔ اور جس کی تعلیم میں فقر قلندری و درویشی کو درجہ اولیٰ دیا گیا وہ صرف ایک ذہنی تخیل نہیں ہے جسے خانقاہوں میں بیٹھ کر ارباب معرفت سیر روحانیاں کے نام سے تعبیر کریں بلکہ زندگی عمل جہاد کا ایک زبردست پیام ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے، ایک عشر دقیقہ کے لئے، اس عالم، اس نظام، اس تخیل اور اس ادارہ سے اعتنا کرنا نہیں چاہتے جو درجۂ حقیقت سے معذور اور نور خودی کے جلوہ سے محروم ہے وہ حافظ کی زبان میں پکارتے ہیں۔

بیا تا گل بافشانیم دمے در ساغر اندازیم فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

اقبالؔ اس فرسودہ فلسفہ کو کہ

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ باز

سر پائے استحقار سے ٹھکراتے ہیں ان کا پیام سازگاری زمانہ کے بالکل خلاف ہے وہ یوں صدا دیتے ہیں:

گفتند جہاں ما آیا بہ تو می سازد گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زد

اسی لئے کلام اقبال نے تمام پرانے استعاروں اور تشبیہات کو الٹ ڈالا۔ وہ جس طرح معنی میں ایک جدید راہ نکالتے ہیں اسی طرح اس معنی کے ادا کرنے میں جن الفاظ اور مثالوں کا استعمال کرتے ہیں وہ بھی جدت سے لبریز ہیں۔ تمام پرانے اساتذہ پروانے کو محور عشق قرار دے چکے ہیں مگر اقبال پروانہ سے بیزار ہیں کیونکہ اس میں خود کوئی روشنی نہیں بلکہ وہ دوسرے کی روشنی پر نثار ہوتا ہے اور شمع سے سوز طلب کرتا ہے۔ اقبالؔ چاہتے ہیں کے سینہ کے نور کو آشکارا کیا جائے اور شمع غیر کے طواف سے آزادی حاصل ہو۔ اسی لئے ان کے کلام میں جگنو کی تعریف اور پروانہ کی مذمت ہے کیونکہ جگنو میں خود روشنی ہے۔ شیخ سعدی علیہ

الرحمہ نے کہا تھا:

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

لیکن اقبالؔ پروانہ اور جگنو کا موازنہ یوں کرتے ہیں:

جگنو بھی ایک پتنگا پروانہ اک پتنگا　　وہ روشنی کا جویا یہ روشنی سراپا

جگنو کی زبان سے اس طرح گویا ہیں:

اللہ کا صد شکر کہ پروانہ نہیں میں　　در یوزہ گر آتشِ بیگانہ نہیں میں

ان کا پیام یہ ہے:

کر مکِ ناداں طواف شمع سے آزاد ہو　　اپنی فطرت کی تجلی گاہ میں آباد ہو

اسی طرح ماہی بچہ اور شاہیں بچہ کی گفتگو نظم کی۔ ماہی بچہ تو دریا کی ہر موج کو دریا تصور کرتا ہے۔ اور دیدہ و نادیدہ بلاؤں سے موجزن ہے کیونکہ بال و پر سے محروم ہے مگر شاہیں بچہ بلند پرواز ہے وہ پکارتا ہے کہ میں شاہیں ہوں دریا ہو کہ صحرا ہو میرے بال و پر کے نیچے ہیں۔ اس کے بعد یہ پیام دیتے ہیں۔

بگذر سرِ آب و بہ مینائے ہوا ساز　　ایں نکتہ نہ بیند مگر آں دیدہ کہ بیناست

پس اقبالؔ ایک ایسی خانقاہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں جہاں اندیشہ اور گمان کا گزر نہ ہو۔ یقین کامل کی فرمانروائی ہو عشق رسولؐ کی اطاعت میں اور جہاد عمل کا ایک زبردست طریقہ کار نافذ ہو، اس خانقاہ میں نہ مستی گفتار کافی ہے اور نہ مستی احوال، یہاں خالص مستی کردار کی طلب ہے یہاں عمل کے جوہر کا مطالبہ ہے یہاں جہاد بالحق کی حقیقت کا اعلان ہے۔ چنانچہ کیا خوب فرمایا ہے:

صوفی کی طریقت میں فقط مستی احوال　　ملا کی شریعت میں فقط مستی گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق　　افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھکو　　ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار

اقبالؔ کشمکش حیات میں بلا خوف نتائج کود پڑنا چاہتے ہیں۔ ان کو ساز و سامان کی ضرورت نہیں۔ ان کا یقین، ان کا ایمان، ان کی حرارت فتح و کامرانی کے لئے کافی ہے۔ چنانچہ صوفی کی زاویہ نشینی کو عمل سے گریز اور تابِ مقابلہ سے احتراز تصور کیا ہے۔

صوفی ما چارۂ غیر از رم نہ داشت　　طاقت غوغائے ایں عالم نہ داشت

اس لئے خواہ کسی قدر شراب معرفت کے خم کے خم لنڈھائے جاتے ہوں مگر اگر خا

نقاہوں میں زندگی کی کشمکش سے گریز ہے تو اقبال کے نزدیک یہ خودی معرفت اور حقیقت سب کی شکست ہے۔ فرماتے ہیں:

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں — بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست
فقیہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور — کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دستبدست
گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

اس لئے مردانِ خدا کو ضرب کاری کا حکم دیتے ہیں:

وہی ہے بندۂ حر جس کی ضرب ہے کاری — نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیاری
ازل سے فطرت احرار میں ہے دوش بدوش — قلندری و قبا پوشی و کلہ داری

اس لئے اقبال کے نزدیک امام وقت وہی ہے جو

موت کے آئینہ میں تجھ کو دکھا کر رُوئے دوست — زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے
دیکے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے — فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

اقبال خودی کی تربیت میں آتش ہمہ سوز پیدا کرنا چاہتے ہیں اور انہیں اس کے تھک جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا — پُر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

اِن ہی وجوہ کی بنا پر عقل سے مشورہ کئے بغیر عمل و جہاد کے میدان میں کود پڑنا چاہتے ہیں۔

دفعتاً جس سے بدل جاتی ہے تقدیر امم — ہے وہ قوت کہ حریف اس کی نہیں عقل سلیم
ہر زمانہ میں دگرگوں ہے طبیعت اس کی — کبھی شمشیر محمد ہے کبھی چوب کلیم

عقل و حکمت، تدبر و فراست، ساز و سامان سے کنارہ کش ہونا، عمل جہاد کے عظیم تخیل کا لازمہ ہے۔

خودی را سوز تاب دیگرے دہ — جہاں را انقلاب دیگرے دہ

چنانچہ۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے — ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

اور اس لئے وہ نہ صرف خطرات سے لاپرواہ ہونا سکھاتے ہیں بلکہ خطرات میں کودنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ دو ہرنوں کا قصہ نہایت لطف لے کر تحریر کیا ہے۔ ایک ہرن دوسرے سے کہتا ہے کہ چلو حرم میں چل کر پناہ لیں کیونکہ صحرا میں صید بند کمیں گاہوں میں موجود ہیں اور ہر وقت جان کا خطرہ ہے۔ اس کا جواب دوسرے ہرن کی طرف

سے اقبال کا ایک پرعزیمت پیغام ہے۔

رفیقش گفت اے یار خرد مند　　اگر خواہی حیات اندر خطر زی
دمادم خویشتن رابر فساں زن　　زتیغ پاک جوہر تیز تر زی

عشق کا تقاضہ یہی ہے کہ بلاغور فکر خطرے میں کود پڑے

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عقل مصلحت اندیش سے عشق خطر طلب مشورہ نہیں کرتا بلکہ جذب و یقین سے استخارہ کرتا ہے۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبا عقل　　لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اسی وجہ سے کلام اقبال میں ''جرأت رندانہ'' کی تعلیم کا ایک مکمل دفتر ہے۔

میری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں
کچھ کام نہیں لیتا بے جرأتِ رندانہ

مضمون طویل ہوگیا ہے ورنہ خطرات میں اپنے آپ کو ڈالنا کلام اقبال کا ایک مستقل باب ہے۔ وہ ملت کے اندیشۂ خطرات کو نور خودی کے منافی تصور کرتے ہیں اور طرح طرح سے اس مرض روحانی کا علاج تجویز کیا ہے۔ آخر خطرات کو دعوت دئے بغیر اقبال کی جدید دنیا نور حقیقت خودی بہ اتباع عشق محمدی تعمیر ہی کیسے ہوسکتی ہے۔

پس خودی اور بے خودی کے اس مجموعہ کا نام پیام اقبال ہے۔ اور میں نے یہ چند سنگریزے بحر اقبال کے ساحل سے چن کر نوجوانان اسلام کے سامنے پیش کردئے۔ غواص معانی کے لئے بہت گنجائش باقی ہے اس لئے نہ صرف میرا کلام تشنہ ہے بلکہ میں خود تشنہ ہوں۔ اب میں اقبال کی اس دعا پر اپنے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر　　حریم کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے　　اسے بازوے حیدر بھی عطا کر

''آمین''

﴿☆﴾

برادرانِ عزیز!　مضمون کو ختم کرنے کے بعد بھی میں اس تذکرہ سے باز نہیں رہ سکتا کہ اقبال جس امت کو تیار کرنا چاہتے ہیں، جس میں وہ نور کی بجلی بھرنا چاہتے ہیں اور جسے خودی کی سان پر چمکا کر عالم آشکارا کرنے کے خواستگار ہیں وہ آپ ہی نوجوانوں کی امت ہے۔ وہ اپنے زمانہ سے مایوس لیکن آنے والے زمانہ سے پرامید ہیں۔

نغمۂ من از جہاں دیگر است　　ایں جرس را کاروانِ دیگر است

وہ کارواں آپ ہی کی جماعت ہے، اقبال ماضی کو عمل کا نمونہ، حال کو انحتاط کا کمال اور مستقبل کو درخشاں تصور کرنا ایمان سمجھتے ہیں مگر اس مستقبل کے معمار کون ہیں۔ وہ رازِ معرفت کس کے سینوں میں بھرا جائے گا۔ وہ برق تجلی کن اجسام سے چمکے گی۔ وہ حقائق و معانی کا دفتر کون اٹھائیں گے۔ وہ نور اسلام کس سے منور ہوگا۔ کیا یہ تاریک راتیں صبح خیزاں سے روشن نہ ہوں گی۔ اقبال تو کہتے ہیں۔ ع

انتظار صبح خیزاں می کشم

وہ تو پیام امید سے لبریز ہیں، وہ تو جانتے ہیں کہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں　　محوِ حیرت ہوں یہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے　　یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

وہ تو آمد بہار کے پہلے منتظر تھے اور آخر کلام میں اس کی آمد کی بشارت سناتے ہیں۔

بیا ساقی نوائے مرغ زار از شاخسار آمد　　بہار آمد نگار آمد نگار آمد قرار آمد
سرت گردم تو ہم قانون پیشیں سازدہ ساقی　　کہ خیل نغمہ پردازاں قطار آمد قطار آمد
بہ مشتاقاں حدیث خواجۂ بدر و حنین آور　　تصرف ہائے پنہاں بچشم آشکار آمد
سر خاک شہید برگ ہائے لالہ می پاشم　　کہ خونش او نہال ملت ما سازگار آمد

مگر اس بشارت کا حامل کون ہے، اقبال اس کا یقین رکھتے ہیں کہ آخر کار جس طور کو انہوں نے جلایا ہے اس کے کلیم پیدا ہوں گے۔ ان کا ایمان ہے کہ دنیا موجودہ تخیل فرنگ کو ترک کر کے مرکز تخیل اسلامی پر آئے گی۔ اور چمن کدۂ عالم بلبل رنگیں نوا کے ترانوں سے معمور ہوگا۔ مگر وہ جماعت کون ہوگی جو اس خیر و برکت کی سزاوار پائے گی اور جس کے مبارک ہاتھوں سے افرنگ کا مرقد اور انوار الٰہیہ کا حرم تعمیر ہوگا۔ اقبال کے تخیل میں اس جماعت کا کوئی تعین نہیں وہ نور الٰہیہ کے حامل ہیں امتیاز رنگ و نسب یا عرب و عجم کے نہیں مگر اس قدر تعین کرتے ہیں کہ وہ نوجوانوں کی ایک جماعت صادق ہوگی۔ اقبال یہ بھی پیغام سنا چکے ہیں،

کہ افرنگ از جراحت ہائے پنہاں بسمل افتادہ است

پس وقت آگیا ہے کہ آپ لوگ اس کا اندازہ کریں کہ

عصا نہ ہو تو حکیمی ہے کار بے بنیاد

اور اقبال کے اس پیام کو سمجھیں۔

ضربتے باید کہ جاں خفتہ بر خیزد زخاک
نغمہ کیسے زخمہ از تارِ رباب آید بروں

اور میدان عمل میں گامزن ہو جائیں۔ اقبال کی پکار ہے کہ

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

تو کیا آپ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہیوں کی طرح انا ھٰھنا قاعدون کا نعرہ لگائیں گے، یا خودی وفقر معرفت وعشق رسول کے سرمایہ دار بن کر عمل جہاد کے میدان میں سرگرم کار رہوں گے، مجاہدانہ عزم پیدا کریں گے اور خطرات کو دعوت دیں گے تاکہ آپ ہی کے ہاتھوں سے یہ انقلاب روزگار پیدا ہو اور آپ ہی اس سعادت کبریٰ کے مستحق قرار پائیں۔

برادرانِ عزیز! میں نے بقدر بساط اقبال کا پیام آپ کو سنا دیا۔ اب عمل کرنا نہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔ یاد رکھئے زمانہ اس وقت کروٹیں بدل رہا ہے۔ انفرادی و جماعتی حیثیت سے بام عرش پر جانا یا اسفل فرش پر پڑے رہنا آپ ہی کے طبقہ کے اختیار میں ہے۔

خواہ آسمان وخواہ زمین شو تسخیری

اور اقبال کے اس شعر کو ہمیشہ یاد رکھئے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے۔

اقبالؔ کا ایک شعر

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

اقبالؔ نے اس ایک شعر میں کئی صدیوں کی تاریخ لکھ دی ہے۔ اور یہی اقبال کا کمال ہے کہ وہ نظم کے خوشنما اور دلفریب دھاگے میں تاریخ، فلسفہ، مابعد الطبیعات سب کو پرو دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ انداز بیان اتنا دلکش ہے کہ بقول جگن ناتھ آزاد پڑھنے والا اس میں ایسا مست ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات شعر کے اصل مفہوم کی جانب طبیعت کا رجحان ہی نہیں ہوتا ہے۔ مغرب بمعنی، فلسفۂ حیات، مغرب کے خلاف وہ زہر اگلتا رہا ہے مگر اس کی وہ کون سی برائیاں ہیں جس سے وہ بیزار ہو کر مغرب اور مغرب زدگی کی مذمت کرتے ہوئے پکارتا ہے:

در ہوا لیش گرمی اک آہِ بیتابانہ نیست
اندریں میخانہ را یک لغزشِ مستانہ نیست

اقبالؔ نے مندرجہ عنوان شعر میں سیاست مغرب کی مکمل تاریخ اور اس کے مکمل فلسفہ حیات کو ایک جامع انداز میں بیان کر دیا ہے جو ایک عجوبۂ روزگار فنکارانہ مہارت کا کرشمہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ اقبالؔ نے ''تدبر کی فسوں کاری'' سے کیا مطلب لیا ہے۔ وہ کیا ہے اور اس سے کیا مراد ہے۔ اسی طرح ''تمدن'' اور ''سرمایہ داری'' کے کیا معنی ہیں۔ وہ کون سا تمدن ہی جس کی بنا سرمایہ داری ہے۔

قبل اس کے کہ مزید تفصیل سے مطلب واضح کیا جائے، میں یہ کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں، تاکہ بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ سمجھ میں آسکے، کہ ''سرمایہ داری'' سے اقبالؔ نے اس شعر میں CAPITALISM (غیر اشتراکی نظامِ اقتصادیات) مراد نہیں لیا ہے بلکہ ان کا نشانہ MERCANTILISM ہے۔ MERCANTILISM کے بارے میں علی سردار جعفری کہتے ہیں کہ اس کا کوئی ترجمہ اردو میں موجود نہیں ہے، اور بات ٹھیک ہے، لیکن بابائے اردو مولانا عبدالحق نے اپنی مشہور و معروف انگریزی اردو ڈکشنری مین MERCANTILISM کے معنی یوں بیان کئے ہیں: تجارتی نظریۂ زر بنیا پن۔

اور بعض لوگوں نے اس کی یہ شرح کی ہے کہ ''ایسی تجارت جس میں دوسروں کے نقصان کو نظر انداز کر کے صرف اپنا نفع منظور ہو۔'' ہم اس کے لئے ''تجارتی نظریہ زر'' ہی استعمال کریں گے۔

تجارتی نظریہ زر کی تاریخ:

''تجارتی نظریہ زر'' صدیوں کے اقتصادی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ کئی تبدیلیوں سے گزرنے کے بعد آٹھویں صدی سے یورپ میں جاگیردارانہ نظام شروع ہوا اور اس نے ایک جدید تہذیب کی بنیاد رکھی۔ جاگیردارانہ سوسائٹی فوجی خدمت اور زمین کی کاشت کا مجموعہ تھی اور اسے انسان کو انسان کا دست نگر بنانے کے تعلق سے محفوظ رکھا گیا تھا۔ اس کے دو مدارج تھے، ایک امراء اور دوسرے عوام، جن میں آزاد اور غلام دو طرح کے کاشتکار تھے۔ غلام تو زمین کے ساتھ بک جاتے تھے اور مالکانِ آراضی اور امراء کی بیگار کرنے اور ان کی حفاظت کرنے پر مجبور تھے۔ آزاد بھی برائے نام آزاد تھے ان کو صرف اتنی آزادی تھی کہ وہ مکان بنا سکتے تھے اور زمین بیچ سکتے تھے ورنہ وہ بھی امراء کے بہت معنوں میں غلام تھے۔ دونوں پر مختلف قسم کے ایسے ٹیکس تھے جن کے بوجھ سے ان کی کمر ٹوٹ رہی تھی۔ جاگیردارانہ نظام کی غرض غلّے کی پیداوار تھی۔ محنت کش طبقہ زمیندار کے کھیتوں پر بیگار کرتا تھا اور خود اپنی زمین سے جو وہ پیدا کرتا تھا اس کا زیادہ حصہ زمیندار لے لیتا تھا۔ اور ایک دوسرا طبقہ بھی تھا جس کو زمیندار کی طرف سے زمین ملتی تھی اور وہ فوجی خدمت انجام دیتا تھا۔ جاگیردارانہ نظام کا ایک تیسرا طبقہ پادریوں کا بھی تھا جو ایک کلیسائی درجہ داری ترتیب کا نظام تھا۔ اس میں سب سے اونچا درجہ پاپائے مقدس کا تھا اور اس کے بعد باترتیب بشپ، پرے بٹرین، قسیس اور تیسرے درجہ کے پادری تھے۔ ان سب کے پاس علاقہ اوقاف کی شکل میں ہوتے تھے۔ جن پر وہ مالکانِ آراضی یا تعلقداران کی طرح قابض و متصرف رہ کر امیرانہ زندگی گزارتے تھے۔ عوام کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ان کے پاس نہ کھانے نہ پینے کا انتظام تھا۔ زمیندار نہایت بے رحمی سے کام لیتا تھا۔ ان کی عورتیں ننگے پیر برف پر چلتی تھیں۔ زمیندار بے دردی سے ان کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتا تھا۔ پادری صاحبان میں اسقف اعظم اونچے درجے کے امراء کے برابر ہوتا تھا۔ بطریق (BISHOP) اور راہبوں کی خانقاہ کے صدر نظام جاگیرداری سے وابستہ اسامیاں تھے اور ان کے کارپردازوں کی ایک فوج تھی۔

گاؤں کے اقتصادی نظام:

جاگیردارانہ سوسائٹی اصلاً دیسی تھی۔ گاؤں کے آدمی اپنی ضرورت کی بہت چیزیں پیدا کر لیتے تھے۔ جو نظام قائم تھا اس میں کسی توسیع کی گنجائش ہی نہ تھی۔ نہ تو دیہات کے لوگ کوئی ایسی چیز بناتے تھے جو باہر شہر میں جا کر بک سکے اور نہ تو ان میں اتنی سکت تھی کہ شہر سے کوئی چیز لا سکیں۔ اس لئے خرید و فروخت یا بازار کا کوئی نظم ہی نہ تھا۔ مقدمات و معاملات اور مذہبی رہنمائی کا کام اہلِ کلیسہ کے ذمہ تھا اور ہر گاؤں میں ان کا ایک گرجہ ہوتا تھا۔

لیکن یہ حالت تاریخی تقاضوں کے زیر اثر قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ وحشیوں کے حملوں نے لوگوں کو ایک جگہ سمٹ کر رہنے پر مجبور کیا جہاں قلعے، خندقیں اور پناہ گاہیں ہوں۔ پھر شہروں کے وجود اور ان کی اہمیت کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد صلیبی مجاہدین آئے۔ ان لوگوں نے غیر متمدن اور پسماندہ لوگوں کا مشرق کی اعلیٰ تہذیب سے رابطہ قائم کرایا، چنانچہ بازار بنے، میلے لگنے لگے اور تجارتی قافلے رواں دواں ہوئے جہاں روشن خیال جاگیردارانہ نظام کی فوجی طاقت سے یا خانقاہ کی پاکیزگی سے امن و امان کی ضمانت ہوتی تھی۔ اس طرح اب گاؤں اور شہروں میں رابطہ قائم ہوا اور تجارت نے دونوں کے ڈانڈے ملا دئے۔ تاجروں کو دو چیزوں کی ضرورت تھی (۱) امن و امان اور (۲) خرید و فروخت کے امکانات۔ دولت کمانے کے لئے امرا نے محفوظ جگہیں بنائیں اور راستوں کی حفاظت کا انتظام کیا۔ وہ دور دراز کا سفر کر کے جمع ہوتے تھے اور کاروبار کرتے تھے۔ یہیں سے تاجروں میں جو زیادہ تر شہروں میں رہتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کا جذبہ برابر ترقی کرتا گیا۔ اور اہلِ کلیسا کا اثر زائل ہوتا گیا جنہوں نے سود در سود جمع کر رکھا تھا اور جو پاکیزگی کی تعلیم دیتے تھے۔

انجمن تجار کا قیام:

رفتہ رفتہ تجار مجتمع ہوئے اور انہوں نے منظم ہو کر ''انجمن تجار'' کی بنیاد رکھی۔ اس انجمن کی حکمرانی ممبران کے ہاتھ میں تھی۔ انجمن کی ایک مجلس مشاورت ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ مشاورتی مجلس ریگولیشن اور آرڈیننس بھی بنانے لگی۔ ہجوم زر نے مزید زر کی تلاش کی حرص پیدا کی۔ پادری پیچھے رہ گیا، تجار آگے نکل گئے اور وہ ہر ممکن طریقہ اپنانے لگے جس سے ان کو زیادہ سے زیادہ منافع حاصل ہو سکے خواہ اس طریقہ کار سے دوسرے کے ساتھ کتنی بھی

زیادتی ہوتی ہو۔انجمن تجار ترقی کرتی گئی۔اس نے مہاجنی کے طریقے اپنائے، بینک قائم کئے، اپنے کو منظم کیا، اپنے لئے قواعد وضوابط بنائے، الغرض تجار ایک ٹھوس اور منظم سوسائٹی میں ڈھل گئے۔اور ایسے منظم کہ وہ حکومت کو بھی ڈرا سکتے تھے۔سولہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک دوسوسال جاگیردارانہ نظام کی شکست وریخت میں لگے ہیں اور اس طرح تجارتی نظریہ زر کا وجود ہوا اور اس نے جاگیردارانہ نظام کی جگہ لے لی۔یہ بات زیادہ سرمایہ اکٹھا ہو جانے شہروں اور دیہاتوں کے میل، بازاروں کی ترقی، مختلف ممالک کے تجار کے باہمی رقیبانہ مقابلوں سے پیدا ہوئی۔

سولہویں صدی میں یورپ نے ازمنۂ وسطیٰ کے زرعی نظام کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔وہ ''بنیاپن'' کے زمانے میں داخل ہو گیا تھا۔کوئی اقتصادی اصول نہ تھا بلکہ ایک تصور یا زندگی کا ایک فلسفہ تھا۔ان لوگون نے تجارت میں حکومت کی عدم مداخلت اور آزاد تجارت کی تبلیغ کرنا شروع کیا۔جیسا کہ آدم اسمتھ نے اپنی کتاب THE WEALTH OF NATION میں لکھا ہے ''انسان کی خود اپنے آپ سے محبت خدا کا عطیہ ہے''۔اس لئے اس نے قانون اخلاق کے ہر طریقہ کو جائز قرار دے دیا اور اس نے سوداگروں کو مدت دراز کے بنے ہوئے رسم ورواج اور انسانی ضروریات کو اپنے منافع کے لئے نظر انداز کرنے میں بے رحم اور بے درد بنا دیا اور زمانہ قدیم سے ظلم وستم کے جتنے طریقے رائج تھے سب کو انھوں نے اپنایا۔

کچھ اور منظم ہونے کے بعد ان لوگوں نے بیرون ملک کی تجارت کا خواب دیکھنا شروع کیا اور مطالبہ کرنے لگے کہ باہر سے درآمد روکی جائے اور اپنا مال باہر بھیجنے کی ہمت افزائی کی جائے۔بتدریج ان کے اندر یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ دنیا کی تجارت کی مقدار معین ہے اور ایک قوم کی دولت کا لازمی نتیجہ دوسری قوم کی عسرت ہے۔بین الاقوامی تجارت کے لئے یہ لوگ ہر جائز وناجائز طریقہ استعمال کرتے تھے، حتیٰ کہ جنگ کرنے سے بھی نہ ہچکچاتے تھے۔یہ لوگ اپنے لئے بلاشرکت غیرے مخصوص مراعات اور اجارہ داری حاصل کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔

تجارتی نظریۂ زر اور نو تجارتی نظام:

دوسرے ملکوں سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے ان کے لئے ضروری تھا کہ وہاں کی حکومت بھی اپنے ہاتھ میں ہوتا کہ ایک طرف امن وامان کی ضمانت رہے اور دوسری جانب لوٹ گھسوٹ میں کوئی مزاحم نہ ہو۔اسی ہوس نے شمشیر بکف تجارت

کا آغاز کیا اور اسی نے نو آبادیاتی نظام کو فروغ دیا۔ سولہویں صدی سے لے کر اٹھارہویں صدی تک مستقل تجارتی جنگیں تمام یوروپین طاقتوں میں ہوتی رہیں۔ انگریز سمندری کپتانوں نے جن سمندروں پر پرتگالی اور اسپینی اپنا حق جتاتے تھے ان سے ان کو صاف کر دیا۔ ۱۶۰۰ء میں ملکۂ ایلزبتھ نے ایسٹ انڈیا کو چارٹر دیا جس میں لکھا تھا کہ ''اپنی قوم کی عزت کے لئے اور اپنے ابناء ملک کی دولت کے لئے یہ چارٹر دیا جا رہا ہے۔'' کمپنی نے تجارت سے بہت روپیہ کمایا اور جس قدر روپیہ کمایا اس قدر اس کی حرص بڑھتی گئی اور کمپنی والے اس فکر میں لگے رہے کہ زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اس میں حکومت برطانیہ پوری طرح شریک اور مددگار تھی۔ رفتہ رفتہ سراج الدولہ کو جنگ پلاسی میں شکست دے کر طاقت کو اپنی جانب منتقل کر لیا۔ اسی وقت سے ہندوستان کو تاخت و تاراج کرنے اور لوٹ کھسوٹ مچانے کا وہ بازار گرم ہوا جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ جو ضلع پورے آباد تھے غیر آباد ہو گئے۔ انگریزوں کی ٹولی گاؤں میں جا کر وہاں کا تیار شدہ مال بہت سستے داموں میں خریدتی تھی اور اپنا مال منہ مانگے داموں پر بیچتی تھی۔ اس ٹولی میں گماشتے، پولیس والے اور مجسٹریٹ ہوتے تھے۔ اگر لوگ ذرا بھی چوں چرا کرتے تو بری طرح پٹائی ہوتی تھی۔ وہ گرفتار کر لئے جاتے تھے اور بند کر دئے جاتے تھے۔ مال زبردستی لے لیا جاتا تھا۔ انجام یہ تھا کہ جہاں کہیں انگریزوں کی ٹولی جاتی تھی، گاؤں کے گاؤں خالی ہو جاتے تھے۔ مرد، عورت، بچے سب اپنا مال و اسباب چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ دولت جمع کرنے میں کوئی اخلاقی اصول کمپنی کے ان لالچی افسروں کے راستہ میں رکاوٹ نہیں ڈالتا تھا۔ دولت کو آسانی سے اور بہت جلد حاصل کرنے کی توقع نے دوسرے انگریزوں کی حرص کو ابھارا، کلایو نے حرص و آزار کی صلائے عام دے دی۔ انگلستان کے وزرا اور اس کی پارلمینٹ کو بھی یہ چھوت کی بیماری لگی۔

امانت کا نظریہ :

اس ظلم و ستم کو اخلاقی بنیاد عطا کرنے کے لئے مغرب والوں نے یہ حربہ ایجاد کیا کہ ایشیا کے لوگ غیر مہذب، جاہل اور بدکار ہیں۔ اور یہ مہذب لوگ بڑے ہی سادہ دل، نیک اور بنی نوع انسان کے خیر خواہ ہیں۔ ان کو کوئی ذاتی حرص، ملک گیری یا نفع خوری کی نہیں ہے، بلکہ یہ صرف وحشیوں کو مہذب بنانے کے لئے اپنا وقت اور پیسہ برباد کر رہے ہیں۔ یہ ایک امانت ہے۔ جو ان کے سپرد ہے اور ان کا فرض ہے کہ اس امانت کا حق ادا کریں۔ امانت یا ٹرسٹ کی پالیسی کے اعلان اور پروپگنڈے سے برطانوی عوام جوش سے بھر گئے اور ضمیر کی آواز جو ابھر سکتی تھی وہ دب گئی۔ اس کام کے لئے ضروری تھا کہ ہندوستان

کے لوگوں کی بدترین تصویر کھینچی جائے اور اپنی بد اعمالیوں پر پردہ ڈالا جائے۔ چنانچہ ہندوستان کے لوگوں پر یہ الزام لگایا گیا کہ "یہ انسانوں کی ایک ایسی نسل کے لوگ ہیں جو افسوسناک حد تک کم ظرف اور کمینے ہیں اور ان کے اندر اخلاقی پابندیوں کا بہت ہی معمولی احساس ہے، حتیٰ کہ جس کو وہ حق سمجھتے ہیں اس کو نظر انداز کرتے ہیں..... اور اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے وہ عقیدت میں ڈوبے رہتے ہیں"۔ کارنواس نے کہا کہ "ہندوستان کا ہر اصلی باشندہ میں واقعی یقین کرتا ہوں کہ بدکردار ہے"۔ ڈھاکہ کے مسٹر پیٹرسن ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ "ان کے دماغ بالکل غیر تربیت یافتہ ہیں۔ اخلاق کے فرائض کیا ہیں اس کا انہیں کچھ خیال نہیں، ان کے اندر اس ذلیل عیاری کا بہت بڑا حصہ موجود ہے جو قلب کی سیہ کاری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ کاہل اور انتہائی عیاش۔ ان کے اندر مذہب کا کوئی احساس نہیں ہے صرف توہمات ہیں۔ مختصر یہ کہ ان کے اندر وحشیانہ زندگی کی تمام خرابیاں بلا اس کی کسی خوبی کے موجود ہیں"۔ بنگالیوں کے بارے میں گرانٹ کہتا ہے کہ "ان صفات سے جو سوسائٹی کی محافظت اور راحت کے لئے ضروری ہیں یہ لوگ استعجاب کی حد تک بے بہرہ ہیں..... سچائی، ایمانداری اور نیک نیتی سے حد درجہ یہ لوگ خالی ہیں"۔ یہ سب بکواس دو وجہوں سے تھی ایک تو اپنی حکومت قائم رکھنے اور اس کے بل پر ملک کی دولت لوٹنے کے لئے اور دوسرے ہندوستانیوں کو اونچی ملازمتوں سے محروم کرنے کے لئے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ انگریز نے جس امانت کا دعویٰ کیا تھا اس کا حق اس طرح ادا کیا کہ ہر شعبہ سے ہندوستانیوں کو حقیر قرار دے کر اور یہ کہہ کر الگ رکھا گیا کہ رفتہ رفتہ جیسے جیسے یہ دائرۂ تہذیب میں آتے جائیں گے ان کو حقوق ملتے جائیں گے۔ جہاں تک سلف گورنمنٹ یا نمائندہ حکومت کا سوال ہے یہ امانت قیامت تک قائم رہنے والی تھی۔ ۲۶/ مارچ ۱۸۹۲ء کو لارڈ کرزن نے دارالعلوم میں تقریر کرتے ہوئے کہا "یہ انگلستان کے لئے اچھا، ہندوستان کے لئے بہتر اور درجہ بدرجہ قائم ہونے والی تہذیب کے لئے بہترین ہوگا اگر اس کو صفائی سے شروع ہی میں ذہن نشین کر لیا جائے کہ ہمارا ذرہ بھر بھی ارادہ ہندوستان کے مقبوضات سے دستکش ہونے کا نہیں ہے اور یہ انتہا درجہ بعید از قیاس ہے کہ کبھی بھی ہماری آنے والی نسلوں میں سے کوئی بھی ایسا ارادہ کرے۔ ہندوستانیوں کو تہذیب سکھانے اور انسان بنانے کی امانت برطانیہ کے سپرد ہوئی تھی۔ اس کے بدلے میں ہندوستان کا فرض تھا کہ اپنی اخلاقی اور مادی تمام توانائیوں کو حکومت کے قدموں میں ڈال دے تاکہ شہنشاہیت کے اغراض پورے ہوں۔

اسی کے ساتھ کررزن نے یہ بھی دعوٰی کیا کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کے جاہل اور گونگے عوام کواوپر اٹھانے کا کام کررہی ہے۔"

اور یہ تہذیب کے علمبردار کون تھے؟ وہ ناکارے، عیاش طبع، رشوت خور، بداعمال لوگ جو انگلستان کی فاقہ مستی سے عاجز آکر ہندوستان بھاگتے تھے، کمپنی میں نوکری کرتے اور بہت جلد امیر الامراء بن کر چلے جاتے تھے۔ صرف اس جاگیر سے جو کلایو کے قبضہ میں تھی ان کو تیس ہزار ج پونڈ سالانہ کی گرانقدر رقم موصول ہوتی تھی۔ کلایو ۳۳ سال کی عمر میں انگلستان واپس گیا اور اپنے ساتھ ۴۰ ہزار پونڈ کی رقم اور اپنے عزیزوں کے لئے پچاس ہزار پونڈ لے گیا۔ کمپنی کے ادنیٰ سطح کے ملازمین بھی اپنے لئے خوب خوب دولت جمع کرتے تھے اور صرف یہ سوچتے تھے کہ تھوڑی مدت میں ایک کثیر دولت جمع کرنے کا ایک نادر موقع ملا ہے۔ اس پر ان کی ذرا بھی نظر نہ تھی کہ یہاں کے بسنے والوں پر کیا گزرتی ہے۔ کمپنی کے مالکان اور ذی اثر لوگوں نے کمپنی کو مجبور کیا کہ وہ ان کے نوجوان رشتے داروں اور دوستوں کو اپنی نفع بخش ملازمت میں جگہ دے۔ حریص انسانوں نے انگریزی پریس میں اشتہار دیا کہ اگر بنگال میں لکھنے پڑھنے کی کوئی جگہ دلا دی جائے تو وہ اس شخص کو جو جگہ دلائے گا ایک ہزار گنی معاوضے میں دے گا۔

تمدن کی بنا سرمایہ داری :

الغرض یہ تھا تمدن جس کی بنا "بنیاپن" MERCANTILISM تھی جس کا منشا یہ تھا کہ دوسرے ملکوں کو لوٹنے کے لئے اپنا مال منہ مانگے داموں پر بیچ سکیں اور ان کا مال سستے داموں میں خرید سکیں۔ اور وہاں کے لوگوں کو غلام بنا کر حکومت قائم کی جائے اور بزور شمشیر امن وامان قائم کردیا جائے تاکہ بلاخوف وخطر انسانیت پر ڈاکہ ڈالا جائے۔ اس کو جائز کرنے کے لئے امانت کا نقاب اوڑھ لیا گیا اور یہ کہا گیا کہ ہم تو صرف تہذیب سکھانے آئے ہیں، ہماری کوئی اور غرض نہیں ہے۔ اس امانت یا ٹرسٹ کے بارے میں بڑے بڑے لوگوں کے بیانات ہیں۔ اور اپنی برتری اور ہندوستان کی اخلاقی گراوٹ کے پرزور پروپگنڈے سے وہ احساس کمتری پیدا کرنے میں بھی کامیاب ہوئے۔ اس طرح مغرب کا پورا تمدن جو دو تین صدیوں تک جاری رہا اور جس کے طفیل میں برطانیہ کی مملکت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا۔ اسی سرمایہ داری یا بنیاپن کو اپنانے اور اسے اپنے تمدن کی بنا قرار دینے سے ہوا۔ وہ تاجر بن کر نکلتے تھے اور ملکوں پر دھیرے دھیرے قبضہ کرکے تجارت کو

ڈکیتی کا آلہ بنا کر لوٹتے تھے۔ اس میں مروت، عدل و انصاف، رحم و کرم، احساس درد انسانی، مجبور و غریب کی حمایت وغیرہ جیسے خصائص کا شائبہ نہ تھا۔

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات

اس تمدن کو فروغ حاصل ہوا اور اس نے عالم انسانیت کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ کمزوروں کو کچلا، غریبوں کو ستایا، مجبوروں پر ظلم کیا، ملک کا کل مال لوٹ لیا اور ایک عرصہ تک پورے ایشیا کو غلام بنائے رہا۔

تدبر کی فسوں کاری :

اسی امانت کے نعرے، ایسی تہذیب پھیلانے اور سکھانے کی ادعا اور اسی ادعا کے ماتحت اپنی حکومت کا غلبہ قائم کرنے اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کرنے کا نام ''تدبر کی فسوں کاری'' اقبال نے رکھا ہے۔

یہ افسوں تھا جو کارگر ہو گیا۔ اور گاندھی جی کے نمودار ہونے کے پہلے سب لوگ، خواہ وہ انڈین نیشنل کانگریس سے تعلق رکھتے ہوں یا اس کے اندر کسی انتہا پسند پارٹی سے منسلک ہوں، حکومتِ برطانیہ کی وفاداری کا دم بھرتے اور اس کا اعلان کرتے رہے۔ کیوں؟ وہی ''تدبر کی فسوں کاری'' کا سحر تھا جو چھایا ہوا تھا، سب لوگ ان کو معلم تہذیب تصور کرتے تھے۔

بالآخر یہ پرفریب نقاب الٹ گیا اور کھناؤنا چہرہ سامنے آ گیا اور شاعر مشرق نے اس وقت جب انگریز پہلی جنگ عظیم جیتا تھا، اعلان کیا :

ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک
نوجواں اقوامِ نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش

☆

صحت نامہ

نمبر شمار	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۱۸	۲	روز آنا	روزانہ
۲	۱۹	۱۱	دراسل	دراصل
۳	۲۰	۵	تشیعؑ	تسیعؑ
۴	۲۰	۲۵	غازی تو بنا	غازی بن تو گیا
۵	۲۱	۱۲	دراسل	دراصل
۶	۲۱	۱۲	یقولون مالا یعقلون	یقولون مالا یفعلون
۷	۲۱	۲۳	حب الوطنی تھا	حب الوطنی لکھا تھا
۸	۲۲	۲	نمایا	نمایاں
۹	۲۲	۲	سینر	سیر
۱۰	۲۲	۱۰	مناصب	مناسب
۱۱	۲۲	۱۹	فلسفی باسیاست	فلسفی را باسیاست
۱۲	۲۴	۲۱	اعتذاد	اعتذار
۱۳	۲۴	۲۱	اعتراز	اعتراض
۱۴	۲۵	۵۰	سماغ	دماغ
۱۵	۲۶	۱۱	باتل	باطل
۱۶	۲۶	۲۳	ناقہ آرد	ناقہ را آرد
۱۷	۲۷	۲۳	عمراء	امراء

نمبر شمار	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۸	۲۹	۲۱	بشکافیم	بشگافیم
۱۹	۳۰	۱۶	بددعا	بدعا
۲۰	۳۱	۴	غریب	عجیب
۲۱	۳۱	۱۳	تو	جو
۲۲	۳۱	۲۳	گیر	غیر
۲۳	۳۲	۱۰	یہ	پئہ
۲۴	۳۷	۱	نجات	تجارت
۲۵	۳۷	۲	متعال	مقال
۲۶	۳۷	۸	کا	کی
۲۷	۳۸	۲۳	اعماض	اغماص
۲۸	۳۸	۲۰	واضع	واضح
۲۹	۴۲	۲۳	جزام	جذام
۳۰	۴۴	۴	کاشغز	کاشغر
۳۱	۴۴	۵	تدبیر	تدبر
۳۲	۴۵	۱	وہ	ہو
۳۳	۴۸	۱۷	واضع	واضح
۳۴	۵۰	۶	مطمع	مطمح
۳۵	۵۱	۵	بور	بود
۳۶	۵۳	۴	تغاوت	خراد
۳۷	۵۳	۴	نہیں	صحیح

نمبر شمار	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۸	۵۵	۱۵	واضع	واضح
۳۹	۵۵	۲۲	معرف	معترف
۳۹	۶۵	۲۲	واضع	واضح
۴۰	۶۷	۲	مجھکو	مجھے
۴۱	۷۳	۴۱	بریل	جبریل
۴۲	۷۶	۵	اندنی	ادنیٰ
۴۳	۷۶	۱۰	تو	جو
۴۴	۷۸	۱۵	عارضی	عاصی
۴۵	۸۰	۱۸	لاتث ریب	لاتثریب
۴۶	۸۰	۲۱	شرع	شرح
۴۷	۸۰	۲۶	وخترو	وخترا او
۴۸	۸۱	۱۱	نیاب	نیابت
۴۹	۸۱	۲۶	شہب	اشہب
۵۰	۸۵	۴	رسول آئے	رسولؐ پر آئے
۵۱	۸۵	۱۳	مناصب	مناسب
۵۲	۸۶	۸	توضیع	توضیح
۵۳	۸۶	۱۲	تجز	بجز
۵۴	۸۶	۲۴	کی	کا
۵۵	۸۷	۹	ہیستنگز	ہیسٹنگز

نمبر شمار	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۶	۹۴	۲	ر	کر
۵۷	۱۰۲	۱۱	فکرم	فکردم
۵۸	۱۰۴	۱۳	بالسین	بالصین
۵۹	۱۰۵	۲۲	تہ تیخ	تہ تیغ
۶۰	۱۱۰	۵	محدود	لامحدود
۶۱	۱۱۳	۵	مطمع	مطمح
۶۲	۱۱۶	۷	یابندوی	یابندی
۶۳	۱۲۳	۱	لولیس اللہ ہوں	نولیس اللہ ہوں
۶۴	۱۲۳	۸	دوبیں	دوربیں
۶۵	۱۲۴	۱۲	کے نکلے	کے لئے نکلے
۶۶	۱۲۴	۱۲	ادرہ	درہ
۶۷	۱۲۷	۲۳	واقع	وارفع
۶۸	۱۲۷	۲۳	حسنہیے	حسنیٰ
۶۹	۱۳۶	۱۳	الفرادی	انفرادی
۷۰	۱۵۹	۵	اول شعور	اول در شعور
۷۱	۱۶۶	۸	ظمیر	ضمیر
۷۲	۱۷۰	۲	لور	طور
۷۳	۱۷۰	۳	مکر	مگر
۷۴	۱۷۱	۱۰	غامی	غلامی

قاضی محمد عدیل عباسی

پیدائش - ۱۳ر مارچ ۱۸۹۸

وفات - ۲۲ر مارچ ۱۹۸۰